ہندستانی قِصّوں سے ماخوذ

اُردو مثنویاں

گوپی چند نارنگ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ہندستانی قصّوں سے ماخوذ اردو مثنویاں

ہندستانی قصّوں سے ماخوذ

اردو مثنویاں

گوپی چند نارنگ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)
ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066

Hindustani Qisson se Makhooz Urdu Masnaviyan

by

Gopi Chand Narang

سنہ اشاعت : دسمبر 2001 شک 1923

دوسرا اڈیشن : 1100

قیمت : دوسو روپے

سلسلہ مطبوعات : 901

کمپوزنگ : محمد موسیٰ رضا

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

طابع : آر- ٹیک آفسیٹ پرنٹرس

شفیق گرامی قدر

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

کی خدمت میں

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ کار زیادہ سے زیادہ وسیع ہو، اور سارے ملک میں سمجھی، بولی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں جہاں تک ممکن ہوسکے پوری کی جائیں، اور نصابی و غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی اپنی اہمیت ہے۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے اور زبان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے اُسے سماجی علوم، سائنس اور ٹکنالوجی سے جوڑنا بھی ضروری ہے اور علوم انسانیہ سے بھی۔

اب تک قومی اردو کونسل نے مختلف علوم و فنون کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ ایک منصوبہ بند پروگرام کے تحت بنیادی درسی اور تحقیقی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی زیر نظر کتاب "ہندستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1959 میں اور پھر 1961 میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی اس کے اعلیٰ تحقیقی معیار اور سائنٹفک پیشکش کے پیشِ نظر گوپی چند نارنگ کی حیثیت بطور ایک محقق اور نقاد کے راسخ ہوگئی اور انھیں اس کتاب پر 1962 میں "غالب پرائز" عطا کیا گیا۔ مولانا امتیاز علی عرشی اور قاضی عبدالودود سے لے کر آل احمد سرور، سید احتشام حسین، مسعود حسن رضوی ادیب اور گیان چند جین تک سب نے اس کے اعلیٰ معیار و معلومات کی تعریف کی۔ اردو مثنویوں پر ایک

جامع تہذیبی و ادبی مطالعے کے طور پر ہنوز اس کتاب کی اہمیت برقرار ہے۔ ایک عرصے سے یہ کتاب دستیاب نہیں تھی، نیز اشاعت کے دوران مصنف نے اس میں تقریباً ڈیڑھ سو صفحوں کے استدراکات و حواشی کا جگہ جگہ اضافہ کیا تھا جو سب مختلف جگہوں پر تھے۔ ہماری گزارش پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نہ صرف پوری کتاب پر نظر ثانی کی ہے بلکہ استدراکات و حواشی کے اضافوں اور معلومات کو بھی متن کتاب میں ضم کردیا ہے۔ اس طرح گویا تمام و کمال یہ اس کتاب کی نئی شکل ہے، جس سے مطالعہ اور مراجعت میں آسانی ہوگی۔ امید ہے کہ قارئین اس اشاعت نو کا خیر مقدم کریں گے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
(ڈائریکٹر)

فہرس

باب سوم :

نیم تاریخی قصے 171

مخفّفات

اسٹوارٹ	*A Descriptive Catalogue of the Oriental Library of the Late Tippoo Sultan of Mysore* by Charles Stewart, Cambridge, 1809.
اشپرانگر	*A Catalogue of the Arabic, Persian and Hindustani Manuscripts of the Libraries of the King of Oudh,* Compiled by A. Sprenger, Calcutta, 1854.
برٹش	*Catalogue of the Hindi, Punjabi and Hindustani Manuscripts in the Library of the British Museum* by J. F. Blumhardt, London, 1899.
برٹش کتب	*Catalogue of Hindustani Printed Books in the Library of the British Museum* by J. F. Blumhardt, London, 1889.
برٹش ضمیمہ	*A Supplementary Catalogue of Hindustani Books in the Library of the British Museum* by J. F. Blumhardt, London, 1909.
ہندی، پنجابی، سندھی، پشتو، کتب برٹش	*Catalogues of the Hindi, Punjabi, Sindhi and Pushtu Printed Books in the Library of the British Museum* by J. F. Blumhardt, London, 1893.
ہندی	*A Supplementary Catalogue of Hindi Books in the Library of the British Museum* by J. F. Blumhardt, London, 1913.
ہندی ضمیمہ ۲	*A Second Supplementary Catalogue of Printed Books in Hindi, Nepali and Pahari in the Library of the British Museum,* compiled by L.D. Barnett, London, 1957.

ریو — *Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum* by Charles Rieu, London Vol. I, 1879, Vol. II, 1881, Vol. III, 1883, Vol. IV, 1895.

انڈیا — *Catalogue of the Hindustani Manuscripts in the Library of the India Office* by James Fuller Blumhardt, London, 1926.

انڈیا مطبوعات — *Catalogue of the Library of the India Office, Vol. II – Part II, Urdu Books,* by J. F. Blumhardt, London, 1900.

انڈیا ہندی — *Catalogue of the Library of the India Office, Vol. II – Part III, Hindi, Punjabi, Pushtu and Sindhi Books* by J. F. Blumhardt, London, 1902.

اتھے — *Catalogue of Persian Manuscripts in the Library of the India Office,* by Hermann Ethe, London Vol. I, 1903 Vol. II, 1937.

آربری — *Catalogue of the Library of the India Office, Vol II – Part VI, Persian Books* by A. J. Arberry, London, 1937.

باڈلین — *Catalogue of the Persian Manuscripts in the Bodleian Library, Part I, Part II,* by Hermann Ethe, Part III by A.F.L. Beeston, Oxford 1889, 1930 and 1954.

بوہار — *Catalogue Raisonne of the Buhar Library, Vol. I, Begun* by Maulavi Qasim Hasir Radavi, Revised and Completed by Khan Sahib Maulavi Abd-ul-Muqtadir, Imperial Library, Calcutta, 1921.

ایشیاٹک — Descriptive Catalogue of the Persian Manuscripts, Asiatic Society of Bengal, by *Wladimir Ivanow,* Calcutta, 1924.

کرزن — *Descriptive Catalogue of the Persian Manuscripts, Curzon Collection, Asiatic Society of Bengal* by Wladimir Ivanow, Calcutta, 1926.

بانکی پور — *Catalogue of the Arabic and Persian Manuscripts in the Oriental Public Library at Banki Pore, Vol. VIII* by Maulavi Abdul Muqtadir, Patna, 1925.

بمبئی — *A Descriptive Catalogue of the Arabic, Persian and Urdu Manuscripts in the Library of the University of Bombay* by Khan Bahadur Shaikh Abdul Kadir-e-Sarfaraz, Bombay, 1935.

لکھنؤ — *A Catalogue of the Oriental Manuscripts in the Library of the University of Lucknow* by Kali Prasad, Lucknow, 1951.

آصفیہ — فہرست کتب عربی، فارسی و اردو مخزونۂ کتب خانہ آصفیہ از سید تصدق حسین، حیدرآباد، جلد ۲، ۱۳۳۳ھ؛ جلد ۳، ۱۳۴۷ھ؛ جلد ۴، ۱۳۵۵ھ

الفہرست — الفہرست مرتبہ محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی، حیدرآباد ۱۹۲۳ء

نذیریہ مخطوطات — فہرست کتب قلمی، شعبۂ مخطوطات عربی فارسی اُردو، نذیریہ پبلک لائبریری، دہلی، مرتبہ محمد المہدی جعفری، ۱۳۶۰ھ دہلی

نذیریہ — فہرست کتب زبان اُردو، نذیریہ پبلک لائبریری دہلی، باہتمام سید محمد عبدالروف، دہلی

عثمانیہ — تفصیلی فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ، مرتبہ عبدالقادر سروری، حیدرآباد ۱۹۲۹ء

سبحان اللہ — فہرست نسخ قلمی (عربی فارسی و اُردو) سبحان اللہ اورینٹل لائبریری مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ مرتبہ سید کامل حسین علی گڑھ، ۱۹۳۰ء

سبحان اللہ مطبوعات	فہرست مطبوعات (عربی، فارسی و اردو) سبحان اللہ اورینٹل لائبریری علی گڑھ، مرتبہ محمد ابرار حسین فاروقی، علی گڑھ ۱۹۳۱ء
شیفتہ	فہرست کتب ذخیرۂ شیفتہ، مرتبہ ابو بکر محمد شیث، علی گڑھ ۱۹۳۲ء
صدیق	فہرست کتب صدیق بک ڈپو، مرتبہ شفیق شاہ پوری، لکھنؤ ۱۹۴۰ء
فہرست کتب خانہ	فہرست کتاب خانہ انجمن ترقی اُردو (ہند) حیدر آباد، مرتبہ سید علی شبّر حاتمی، حیدر آباد، ۱۹۴۳ء
سالار جنگ	کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اُردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست از نصیر الدین ہاشمی، حیدر آباد ۱۹۵۷ء
ادارۂ ادبیات	تذکرہ مخطوطات ادارۂ ادبیاتِ اُردو، ڈاکٹر سید محی الدین قادری، زور حیدر آباد، جلد اول ۱۹۴۳ء، جلد دوم ۱۹۵۱ء جلد سوم ۱۹۵۷ء، جلد چہارم ۱۹۵۸ء ، جلد پنجم ۱۹۵۹ء
ادارہ مطبوعات	فہرست مطبوعات، کتب خانہ ادارۂ ادبیات اُردو، جلد اول مرتبہ غلام رسول و محمد اکبر الدین صدیقی، حیدر آباد، ۱۹۵۶ء
ادارہ مطبوعات ۲	فہرست کتب خانہ ادارۂ ادبیات اُردو۔ مطبوعات اردو فارسی عربی، جلد دوم، مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی، حیدر آباد، ۱۹۵۹ء

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے لیے لفظ "اسلام" اور اسی طرح انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے لیے "برٹینیکا" انسائیکلوپیڈیا امریکانا کے لیے "امریکانا" اور چیمبرز انسائیکلوپیڈیا کے لیے "چیمبرز" استعمال کیا گیا ہے۔

مقدمہ

اردو میں تحقیق کی موجودہ رفتار کو دیکھتے ہوئے، یہ بات افسوس ناک ہے کہ اردو مثنوی پر ابھی تک کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ غزل کے بعد ہمارے شاعروں نے جس صنفِ سخن پر سب سے زیادہ طبع آزمائی کی، وہ مثنوی ہی ہے۔ غزل پر تو ان چند برسوں میں دفتر کے دفتر سیاہ کردیے گئے ہیں، لیکن مثنوی کا کوئی پرسان حال بھی نہیں۔ امیر احمد علوی نے ''مثنویات'' پر ایک مقالہ ۱۹۳۵ میں نگار کے لیے لکھا تھا۔ یہی بعد میں کتابی صورت میں شائع کردیا گیا۔ عبدالقادر سروری کی کتاب ''اردو مثنوی کا ارتقا'' بھی تقریباً بیس برس پہلے لکھی گئی تھی۔ جلال الدین جعفری کی کتاب ''تاریخ مثنویات اُردو'' کے نام سے دوبار شائع ہوچکی ہے۔ لیکن اس کی نوعیت تاریخی اور تحقیقی نہیں۔ اس میں زیادہ توجہ مشہور اردو مثنویوں کا انتخاب پیش کرنے پر صرف کی گئی ہے۔

اس دوران میں اردو تحقیق نے ترقی کی جو منزلیں طے کی ہیں، ان کے پیشِ نظر اردو مثنوی کے تاریخی ارتقا کا تحقیقی و ادبی جائزہ لینا نہایت ضروری ہوگیا ہے۔ مختلف یونیورسٹیوں میں اس سلسلے میں کام جاری ہے۔ بھوپال میں ڈاکٹر گیان چند جین ''شمالی ہندستان میں اردو مثنوی کا ارتقا'' پر تحقیق کررہے ہیں۔

اردو مثنویوں کی قدر و قیمت جاننے اور تاریخ ادب میں ان کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا جائزہ تاریخی و معاشرتی پس منظر کے ساتھ لیا جائے۔ اردو ادب نے فارسی سے بہت کچھ لیا۔ اس میں ایرانی اور اسلامی روایات کا رنگ بھی گہرا ہے، لیکن یہ ہندستان سے بیگانۂ محض نہیں ہے۔ اس نے یہاں کے ماحول، معاشرت اور تہذیب و تمدن کے اثرات بھی

قبول کیے ہیں۔ اردو کی دوسری اصنافِ سخن کی طرح ہماری مثنویاں بھی اُس اخذ و قبول، اختلاط اور اشتراک کا پتا دیتی ہیں، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ کے بعد یہاں تہذیبی اور معاشرتی سطح پر کارفرما رہا۔ قدیم مثنویوں میں عموماً قصّے کہانیاں بیان کی جاتی تھیں، جن کا گہرا تعلق قومی روایات، مذہب اور معاشرت سے ہوتا تھا۔ ہماری مثنویاں چونکہ مشترک تہذیب اور ملی جلی معاشرت کے زیرِاثر لکھی گئیں، اس لیے ان میں اسلامی قصّے کہانیوں کے علاوہ ہندستانی لوک کتھاؤں اور عوامی روایتوں سے متاثر ہونے کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ اسی رجحان کا معروضی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے جائزہ لینا زیرِ نظر کتاب کا موضوع ہے۔ اس موضوع سے متعلق بحث کی حدود متعین کرنے سے پہلے ہندستانی موضوعات پر مشتمل اردو مثنویوں کے عہد بہ عہد ارتقا پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ اُس زمانے میں جب اردو شاعری ابھی اپنے ارتقا کی منزلیں مذہب و تصوف کے سہارے طے کر رہی تھی، اردو کی اولین مثنوی میں ایک ہندستانی قصّے کو موضوع بنایا گیا۔ یہ مثنوی بہمنی دور کے ایک شاعر نظامی سے منسوب کی جاتی ہے اور اس میں کدم راؤ پدم راؤ کا مقامی قصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی غالباً احمد شاہ ثالث بہمنی (۸۶۷-۸۶۵ھ) کے زمانے میں لکھی گئی۔

اردو ادب کا باقاعدہ فروغ قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین کی سرپرستی میں دسویں صدی ہجری میں شروع ہوا۔ اسی زمانے میں ایک درباری شاعر وجہی نے سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۰۲۰-۹۸۸ھ) کی وارداتِ عشق کو مثنوی قطب مشتری میں شاعرانہ انداز سے پیش کیا۔ غواصی نے جہاں الف لیلہ کی کہانیوں پر مبنی ایک مثنوی سیف الملوک اور بدیع الجمال لکھی (۱۰۳۵ھ)، وہاں دو اور مثنویاں طوطی نامہ (۱۰۴۹ھ) اور مینا وستونتی (قبل ۱۰۵۰ھ) ہندستانی موضوعات پر بھی تصنیف کیں۔ نصرتی نے منوہر اور مدھومالتی کے مشہور قصّے کو نظم کا جامہ پہنایا (۱۰۶۸)۔ اس کی مثنوی "علی نامہ" ایک رزمیہ کارنامہ ہے،

جس میں علی عادل شاہ (۱۰۶۷ - ۱۰۸۳ھ) اور مغلوں اور شیواجی کی جنگوں کا احوال بیان کیا گیا ہے۔

اس دور میں ابنِ نشاطی نے اپنی مشہور مثنوی پھول بن لکھی (۱۰۶۶ھ) اس کا پہلا قصہ ختن کے سوداگرزادے کا، دوسرا جوگیوں سے عقیدت رکھنے والے ایک راجہ کا اور تیسرا مصر کے شہزادے کا ہے، جو ہندستان میں آکر اقامت گزیں ہوا۔

دکھنی ادبیات کے اس دور میں اسلامی قصّوں کے ساتھ ساتھ ہندستانی لوک کہانیاں بھی بہت مقبول رہیں۔ اگر ایک طرف امین، دولت اور طبعی نے بہرام گور کے فارسی قصّوں کو اردو میں منتقل کیا اور ملک خوشنود اور ہاشمی نے یوسف زلیخا اور احمد نے لیلیٰ و مجنوں سے متعلق مثنویاں لکھیں، تو دوسری طرف غلام علی (۱۰۹۱ھ) عشرتی (۱۱۰۷ھ) اور محمد فیاض ولی ویلوری (قبل ۱۱۳۷ھ) نے اپنی اپنی مثنویوں میں پدماوت کی داستانِ عشق کو بیان کیا۔ مقیمی نے چندربدن اور مہیار کے دکھنی قصّے کو نظم کرکے (قبل ۱۰۵۰ھ) آنے والے شاعروں کے لیے نئی راہ کھول دی۔ مقیمی کے بعد پانچ اور دکھنی شاعروں، محمد باقر آگاہ، واقف، بلبل، شاکر اور سیف اللہ نے بھی اس قصّے پر طبع آزمائی کی۔ اس سے ملتی جلتی سات اور مثنویاں بھی اسی دَور میں لکھی گئیں۔ ان کے نام ہیں : مثنوی مغل اور ناگرنی، مثنوی نازنین و پٹھان، مثنوی ہیرالال، مثنوی نھو بامنی، طالب و موہنی، شمعِ عشق اور بہلول صادق۔ ان مثنویوں میں ہیرو اور ہیروئن کا تعلق باہم مختلف مذاہب سے دکھایا گیا ہے۔ اسی طرح کی چار مثنویاں شمالی ہندستان میں بھی لکھی گئیں۔ میر کی مثنوی شعلۂ شوق میں عاشق اور معشوق کا تعلق باہم مختلف مذاہب سے نہیں، لیکن اس قصّے سے ملتی جلتی جو عوامی روایت بعد میں مشہور ہوئی اور جسے شوق نیموی نے مثنوی سوز و گداز میں نظم کیا، اس میں عاشق کا مذہب اس کے محبوب سے مختلف بتایا گیا ہے۔ میر کی مثنوی شعلۂ شوق سعادت یار خاں رنگین کی مثنوی دل پزیر، قاضی محمد صادق اختر کی ”سراپا سوز“

اور شوق نیموی کی مثنوی "سوز و گداز" کے قصوں میں ہیروئن کا مذہب، ہیرو کے مذہب سے مختلف بتایا گیا ہے۔

۱۰۹۷ھ میں مغلوں کے ہاتھوں بیجاپور کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کی شکست و ریخت کا ذکر ایک شاعر سید عالم بیجاپوری نے اپنی مثنوی "جامع المعجزات" میں بڑے درد و سوز سے کیا ہے۔

۱۰۹۸ھ میں اورنگ زیب عالمگیر نے قطب شاہی سلطنت کو بھی مغلیہ قلمرو میں شامل کر لیا اور ان دونوں سلطنتوں سے متعلق شعرا آرکاٹ، ویلور، سدھوٹ، کرنول، کڑپا وغیرہ مختلف ریاستوں میں منتشر ہو گئے۔ اس انتشار اور ابتری کے عالم میں جو مثنویاں لکھی گئیں، ان سے بھی دکھنی شاعروں کی ہندستانی موضوعات سے وابستگی کا ثبوت ملتا ہے۔ عارف الدین عاجز نے اندر سبھا کی طرز پر ایک مثنوی قصۂ لعل و گوہر لکھی (قبل ۱۱۲۹ھ) سید احمد ہنر نے ابنِ نشاطی کی "پھول بن" کے جواب میں "مثنوی نیہ درپن" پیش کی، جس میں راجا راج کنور اور رانی کام لتا کا قصہ بیان کیا گیا ہے (۱۱۴۴ھ)۔

ولی دکھنی جس کے دیوان کی شہرت سے شمالی ہندستان میں شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز ہوا، دو مثنویوں کا مصنف ہے۔ ان میں سے ایک صوفیانہ ہے اور دوسری شہر سورت کی تعریف و توصیف میں لکھی گئی ہے۔

مقامی موضوعات پر طبع آزمائی کا رجحان بارہویں صدی کے دکھنی شاعروں کے ہاں بھی ملتا ہے۔ اس زمانے میں طوطی نامہ سے ملتی جلتی تین اور مثنویاں گجرات میں لکھی گئیں۔ مثنوی سوداگر کی بیوی از سیّد عبداللہ (۱۱۶۴ھ)، طوطا اور مینا از روشن علی (۱۱۸۸ھ) اور مثنوی روشن سوداگر از جمال الدین۔ تحسین الدین کی مثنوی کام روپ اور کام کلا بھی دکھنی ہی میں ۱۱۷۰ھ میں لکھی گئی۔ یہ مثنوی یورپ میں بہت مقبول رہی ہے۔ دتاسی کا بیان ہے کہ اردو میں اس قصے کو چار اور شاعروں ضیغم، سراج، حسن اور آرزو نے بھی نظم کیا تھا۔

شمالی ہندستان میں باقاعدہ اردو مثنوی کا اولین نمونہ محمد افضل کی بکٹ

کہانی کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں بارہ ماسے کی طرز پر ایک فراق زدہ عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ میر جعفر زٹلی کے الحاقی کلام میں ایک مثنوی موسم سرما کی مذمت میں پائی جاتی ہے۔ شاہ حاتم نے مثنوی بہاریہ میں ہولی اور دیوالی کا سماں کمالِ خوبی سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے جعفر علی خاں زکی کی شروع کی ہوئی مثنوی ''داستان عشقِ حقہ'' کو بھی مکمل کیا اور اس زمانے کی حقہ نوشی کے لوازمات اور آداب کو بڑے پُرلطف پیرائے میں بیان کیا۔ سودا نے مثنوی طفل لکڑی باز لکھ کر ایک خاص طبقے کے اعمال و کردار کو بے نقاب کیا۔ لیکن متقدمین میں مثنوی کا اعلیٰ ترین نمونہ میر تقی میر نے پیش کیا۔ مثنوی دریائے عشق کا قصہ تخیلی ہے۔ لیکن شعلۂ شوق پرس رام کے عشق کی ایک ایسی لوک روایت پر مبنی ہے، جسے بعض حلقوں میں امرِ واقع کا رُتبہ دیا جاتا ہے۔ میر نے اپنی دو مثنویوں میں برسات کی شدّت اور سیلاب کی تباہ کاریوں کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ انھوں نے ایک مثنوی ''دربیانِ ہولی'' بھی لکھی۔ ہولی کا ذکر جشن کد خدائی سے متعلق دو اور مثنویوں میں بھی ملتا ہے۔ ہولی سے متعلق اس زمانے میں بعض اور شاعروں نے بھی مثنویاں لکھیں۔ ان میں سے فائز دہلوی، قائم چاندپوری اور راغب دہلوی کی مثنویاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

شیر علی افسوس نے بھی جشن ہولی سے متعلق ۲۲۸ اشعار کی ایک مثنوی لکھی تھی، جو ان کے قلمی دیوان 'کتب خانہ مشرقیہ، پٹنہ' میں موجود ہے۔ اسی کتب خانے میں محمد جعفر خاں راغب کے دیوان کے دو مخطوطے ہیں۔ شمار ۶۹ میں مثنوی ''بیان احوال بزم ہولی'' شامل ہے۔ یہ ۹۷ اشعار پر مشتمل ہے، جن میں سے ۴۳ اشعار قاضی عبدالودود صاحب نے رسالہ اشارہ (گیا) میں شائع کیے ہیں۔ قائم چاندپوری کی مثنوی ''در توصیف ہولی'' ان کے قلمی دیوان، اسٹیٹ لائبریری رامپور میں شامل ہے اور یہ کل ۴۴ اشعار کی ہے۔ حاتم کی مثنوی بہاریہ بھی غیر مطبوعہ ہے اور یہ مثنوی اسٹیٹ لائبریری رامپور کے نسخۂ دیوان زادہ میں موجود ہے۔

اسی زمانے میں میر اثر نے مثنوی خواب و خیال لکھی، جس میں سراپا نگاری کی ہندی روش کا تتبع کیا گیا ہے۔ بچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کی مثنوی تصویرِ جاناں کی روش بھی یہی ہے۔

میر حسن نے اپنی شہرۂ آفاق مثنوی ''سحر البیان'' (۱۱۹۹ھ میں) لکھنؤ میں مکمل کی۔ اس کا قصہ ایرانی طرز کا ہے، لیکن اس کے ذیلی واقعات راجا اندر کے قصوں اور سراندیپ سے متعلق لوک کہانیوں سے ملتے جلتے ہیں۔

مصحفی نے ہندستان کے ''موسم گرما'' اور ''افراطِ موسم سرما'' پر بڑی عمدہ مثنویاں لکھیں۔ ان سے پہلے قائم بھی برسات اور سرما سے متعلق دو بلند پایہ مثنویاں لکھ چکے تھے۔ غالباً ان کی دیکھا دیکھی جرأت نے بھی ہندستانی موسموں کے احوال پر قلم اٹھایا اور متعدد مثنویاں لکھیں، جو ان کے مجموعۂ مثنویات (قلمی) میں شامل ہیں۔ انشا نے رانی کیتکی اور کنور اودے بھان جیسی ایک کہانی ٹھیٹھ ہندستانی میں بھی نظم کرنا شروع کی تھی، مگر یہ مکمل نہ ہو سکی۔

محبت خاں محبت شاگرد جرأت نے سسّی پنوں کے مشہور قصے کو ۱۱۹۷ھ میں ''اسرارِ محبت'' کے نام سے اردو میں لکھا۔ اسی زمانے میں شکنتلا کے قصّے پر تین مثنویاں لکھی گئیں۔ پہلی سید محمد تقی کی رشکِ گلزار، دوسری غلام احمد کی فراموش یاد (قبل ۱۸۴۹ھ) اورتیسری عنایت سنگھ کی غازۂ تعشق (۱۸۸۴ھ)۔ لکھنوی رنگ کی مثنویوں کی نمایندگی کا شرف گلزارِ نسیم (۱۲۵۴ھ) کو حاصل ہے۔ اس میں مخلوط قسم کا قصہّ بیان کیا گیا ہے۔ شاعر نے ہندی اور ایرانی عناصر کی آمیزش سے نیا ہیولہ تیار کیا ہے۔ گل بکاؤلی کا قصہ نسیم سے پہلے بھی اردو میں موجود تھا۔ مثنوی ''تحفہ مجلسِ سلاطین'' (غالباً ۱۱۵۱ھ) اور مثنوی ''خیابانِ ریحان'' (۱۲۱۲ھ) دونوں مثنویاں گلزارِ نسیم سے پہلے کی تصنیف ہیں۔ گل بکاؤلی کا ایک اور منظوم ترجمہ محمد داؤد علی سے بھی منسوب کیا جاتا ہے، جو ۱۲۶۱ھ میں لکھا گیا۔

لگ بھگ اسی زمانے میں مرزا شوق لکھنوی نے اپنی زندہ جاوید مثنویوں: ''زہر عشق''، ''بہارِ عشق''، ''فریبِ عشق'' کے موضوعات لکھنؤ کے ماحول و معاشرت سے اخذ کیے اور انھیں کمال فن کاری سے شعر کے پیرائے میں بیان کیا۔

تیرہویں صدی ہجری میں بعض غیر لکھنوی شعرائے اردو نے بھی ہندستانی موضوعات پر مثنویاں لکھیں۔ ان میں سے نل دمن، پدماوت، سنگھاسن بتیسی اور ہیر رانجھا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مؤخرالذکر قصے کو مول چند منشی اور نجیب الدین نجیب نے اپنی اپنی مثنویوں میں لکھا۔ ضیاء الدین عبرت اور ان کے انتقال کے بعد غلام علی عشرت (۱۲۱۱ھ) نے پدماوت کو اردو نظم میں پیش کیا۔ محمد قاسم بریلوی کی ضخیم اردو پدماوت ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی۔ نل دمن کے قصے پر اس صدی کے دوران میں چھ مختلف شعرا نے طبع آزمائی کی۔ احمد سراوی (۱۲۴۰ھ)، نیاز علی نکہت (شاگرد شاہ نصیر) (قبل ۱۲۵۶ھ)، بھگونت رائے راحت کاکوروی (۱۲۴۴ھ)، میر علی بنگالی، احمد علی (قبل ۱۲۷۰ھ) اور کالی پرشاد نے ۱۲۸۶ھ میں نل دمن منظوم تصنیف کی۔ مثنوی سنگھاسن بتیسی کے دو اردو نسخے علی گڑھ میں ہیں۔ نسخہ ٔ لٹن کا مصنف خود کو خواجہ میر درد کا شاگرد بتاتا ہے۔ بشاش سے روایت ہے کہ منسا رام ناتواں اور رنگین لال رنگین نے بھی سنگھاسن بتیسی کے قصوں کو اردو میں منتقل کیا تھا۔ رنگ لال چمن کی مثنوی سنگھاسن بتیسی ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی۔ اسی دور میں روپ بسنت کے مقبول عام قصے کو سردھنا کے ہر چندرائے ہرچند نے اردو مثنوی میں بیان کیا (۱۸۵۴ء) قصہ ٔ راجا چترمکٹ اور رانی چندر کرن سے متعلق دو مثنویاں ملتی ہیں۔ ایک روشن علی کی اور دوسری سمن لعل راغب امروہوی کی جو ۱۸۴۷ء میں لکھی گئی۔ انبی پرشاد مدہوش نے قصہ گوپی چند بھرتری کو بطور مثنوی بیان کیا۔ یہ مثنوی دہلی سے ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی۔

اس دوران میں بعض اردو مثنویاں پنجاب میں لکھی گئیں۔ سسّی پنوں کے قصے سے متعلق کیسرا سنگھ، سالک اور لال سنگھ نے مثنویاں لکھیں۔ کرم الٰہی بھوپالی نے ۱۹۰۵ء میں ہیر رانجھا کو پھر سے نظم میں پیش کیا۔ اسی قصّے سے متعلق عبدالغفور قیس کی مثنوی ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کا نام "ارمغانِ گدا" ہے۔

سنہ اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامے کے بعد سے قدیم اردو شاعری کا رنگ تبدیل ہونے لگا، تو منظوم قصّے کہانیوں کا بھی پہلا سا ذوق و شوق باقی نہ رہا۔ رفتہ رفتہ ان کی جگہ ناول اور افسانے نے لے لی۔ پھر بھی موجودہ دَور میں جو اِنی گِنی مثنویاں لکھی گئیں، ان کا سلسلہ بھی مقامی موضوعات پر طبع آزمائی کرنے کی اُس قدیم روایت تک پہنچتا ہے، جس کا آغاز، وجہی، غواصی اور نصرتی کے زمانے میں ہوا تھا۔ ان میں بے نظیر شاہ وارثی کی مثنوی "الکلام" خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ ایک صوفیانہ مثنوی ہے، لیکن اس میں ہندستانی مظاہر فطرت کی ایسی عمدہ مرقع کشی کی گئی ہے کہ اردو میں اس کی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ مثنوی عالم خیال میں، شوق قدوائی نے ہندی بارہ ماسے کی طرز پر ایک فراق زدہ خاتون کے جذبات بیان کیے ہیں۔ اقبال ورما سحر ہتگامی نے مثنوی نیر نگِ سحر میں شکنتلا کا قصہ بیان کیا ہے، جو انھوں نے کالی داس سے لیا۔ (۱۹۱۰ء) جگر بریلوی کی مثنوی پیامِ ساوتری، اس دَور کی اور اپنے رنگ کی آخری مثنوی ہے، جس میں ستیہ وان ساوتری کا پورانک قصہ بیان کیا گیا ہے۔ (۱۹۳۰ء)

یہ ہے، ہندستانی زندگی سے ماخوذ اردو مثنویوں کے تاریخی ارتقا کا سرسری خاکہ! ان مثنویوں کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ اردو مثنوی کا دامن مقامی موضوعات سے کبھی خالی نہیں رہا۔ ان موضوعات سے ہمارے شاعروں کی وابستگی سطحی یا رسمی نہیں۔ ان میں سے بیشتر نے "دربیانِ سببِ تالیف کتاب" میں صراحت کر دی ہے کہ جس قصّے کو وہ مثنوی کے قالب میں پیش کررہے

ہیں، اس میں کیسی کیسی خوبیاں ہیں اور وہ اسے اتنا زیادہ پسند کیوں کرتے ہیں۔ محبت خاں محبت نے سسّی پنوں کے بارے میں لکھا ہے کہ اس قصّے کو سن کر سنگ دل سے سنگ دل انسان کا کلیجہ بھی پانی ہو جائے گا۔ ضیاء الدین عبرت نے جب پدماوت کا قصہ نظم کرنا شروع کیا تو بعض لوگوں نے ہندو راجا رانی کا قصہ لکھنے پر اعتراض کیا۔ جواب میں عبرت نے کہا کہ مجھے وطن سے زیادہ کوئی سرزمین عزیز نہیں۔ جو کچھ اپنے وطن میں ہے، دوسرے ملکوں میں کہاں، پھر کیوں ہندستان کے قصّے چھوڑ کر دوسروں کے قصّے دہراتا رہوں۔

تحقیق و تنقید کی سہولت کے لیے مقامی موضوعات پر مشتمل اردو مثنویوں کو مندرجہ ذیل چھے حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

(۱) مذہبی مثنویاں : مثلاً رامائن از جگن ناتھ خوشتر، رامائن از شنکر دیال فرحت، مہابھارت از طوطا رام شایاں، بھاگوت از خوشتر، بھگوت گیتا، گیتا مہاتم اور بشن لیلا از رام سہائے تمنا، اکادشی مہاتم از رام پرشاد، بلبھ چرتر از جواہر لال کرامت، برج چھب از بنواری لال شعلہ۔

(۲) تاریخی مثنویاں : مثلاً علی نامہ از نصرتی، میزبانی نامہ اور ظفرنامہ نظام شاہ از شوقی، اضراب سلطانی، فتح نامہ ٹیپو سلطان از حسین علی طرب دکھنی۔ تاریخ سلاطین بہمنیہ از سہیل، پھول نامہ از رائے برج نرائن ورما ناظم، تاریخ بدیع از امیر اللہ تسلیم لکھنوی وغیرہ۔

(۳) وہ مثنویاں جن میں ہندستان کے معاشرتی کوائف و آثار کی تفصیل ملتی ہے۔ مثلاً شاہ حاتم، میر، راغب دہلوی، فائز دہلوی، قائم چاند پوری اور شیر علی افسوس کی مثنویاں ہولی کی تعریف میں۔ حاتم کی مثنوی حقّے کے بیان میں، سودا کی مثنوی ہجو طفلِ لکڑی باز اور میر کی مثنوی مرغ بازاں میں بھی قدیم

معاشرت کے بعض پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب نے مولف کے نام اپنے خط میں مطلع کیا ہے کہ سیّد انشاء اللہ خاں انشا نے بھی "مرغ نامہ" لکھا تھا۔ ایک مثنوی مُرغ نامہ پیر محمد مراد آبادی جرأت کی تصنیف بھی بتائی گئی ہے۔ قدرت اللہ شوق کا بیان ہے: "پیر محمد مراد آبادی جرأت تخلص از یاران مراد علی حیرت ... اشعارش بسمع نرسیدہ مگر مثنوی مرغنامہ او کہ اختتام آں از حیرت است، مشہور و معروف است۔ (تذکرہ طبقات سخن، قلمی، ورق ۲۷۶ الف، آصفیہ)

میلہ بہتہ کے بیان میں فائز دہلوی کی مثنوی، چھڑیوں کے میلے کے بارے میں میر حسن کی "گلزارِ ارم" اور لکھنؤ کے میلے ٹھیلوں سے متعلق ہادی علی بے خود کی مثنوی "جلوۂ اختر" بھی اسی ذیل میں آتی ہیں۔ طبقۂ نسواں کے آداب و اطوار، لباس، پوشاک، رہن سہن اور شادی بیاہ کی رسوم کی تفصیل اردو کی مندرجہ ذیل مثنویوں میں ملتی ہے: نصرتی کی "گلشنِ عشق"، ابن نشاطی کی "پھول بن"، میر کی دربیان کدخدائی، بشن سنگھ پسر راجا ناگرمل (وبہ اختلافِ چند اشعار) دربیان کد خدائی آصف الدولہ، میر حسن کی سحرالبیان اور مثنویِ شادی، مرزا محسن علی ہندی شاگرد مصحفی کی مثنویِ ہندی، نواب بادشاہ محل کی مثنویِ عالم، حسین بخش واقف کی مثنوی بہارستان شادی، مرزا شوق لکھنوی کی زہر عشق، بہارِ عشق، فریب عشق، حاتم علی مہر کی شعاع مہر، منیر شکوہ آبادی کی حجاب زناں اور تسلیم سہسوانی کی مثنوی سعدین۔

(۴) وہ مثنویاں جو ہندستان کے **فطری مظاہر یا موسموں** کے بارے میں ہیں، مثلاً سودا کی مثنوی گرمی کے بیان میں، میر کی "درمذمتِ برشگال"۔ قائم کی مثنوی "در شدتِ سرما" اور "مثنوی دربیانِ شدتِ گل ولائے"۔ مصحفی کی "مثنوی گرما و آتش زدگی" اور "دربیانِ موسمِ سرما" اور جرأت کی مثنویاں دربارۂ

سرما، گرما اور برسات۔ مصحفی کی مثنوی اجوائن، غالب کی مثنوی انبہ اور عبدالباقی سہسوانی کی مثنوی انبہ نامہ بھی اسی ذیل میں شامل ہیں۔ ہندستانی موسموں کی دلفریبی اور دل کشی کا اظہار اردو کے قدیم بارہ ماسوں میں کیا گیا ہے۔ ان میں سے خاص خاص یہ ہیں : بکٹ کہانی، محمد افضل، بارہ ماسی عبدالولی عزلت، بکٹ کہانی الٰہی بخش کاندھلوی، بارہ ماسہ سندر کلی، بارہ ماسہ کاظم علی جواں، بارہ ماسہ وہاب، ڈوری لال، بہادر علی وحشت، لطف علی، رائے پرشاد شاد، عبداللہ انصاری، کنہیا لال طالب وغیرہ۔

(۵) وہ مثنویاں جن میں **حب الوطنی** کے جذبات پائے جاتے ہیں، مثلاً حضرت شاہ مراد کی مثنوی دربیانِ لاہور، سورت کی تعریف میں ولی کی مثنوی، ہدایت شاگرد درد اور سعادت یار خاں رنگین کی مثنویاں بنارس کے حسن و خوبی کے بیان میں، محمد بخش شہید، خواجہ بادشاہ خلف وزیر کی مثنویاں لکھنؤ کی تعریف و توصیف میں، چھنولال طرب کی مثنوی امین آباد کی تعریف میں، مومن کی مثنوی جہادیہ، واجد علی شاہ کی حزن اختر اور مولوی لیاقت علی کی وہ مثنوی جو غدر کے دنوں میں لکھنؤ میں بطور اشتہار شائع ہوئی تھی۔

(٦) ہندستانی قصّے کہانیوں سے ماخوذ مثنویاں : موضوع کی اہمیت اور وسعت کے پیشِ نظر زیرِ نظر کتاب میں صرف آخری قسم کی مثنویوں کو لیا گیا ہے۔ یعنی یہاں فقط ان مثنویوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے گا، جن کا تعلق پورانک قصوں سے ہے یا جو ہندستان کی قدیم روایتوں اور لوک کہانیوں سے ماخوذ ہیں۔ انھیں مزید چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں ابواب کی تقسیم اسی انداز پر عمل میں لائی گئی ہے۔

(الف) پورانک قصّے : ان قصّوں کا تعلق مہابھارت، رامائن اور ہندوؤں کے دوسرے پُورانوں سے ہے۔ ان میں سے اردو میں زیادہ تر نل

دمینتی، دُشینت اور شکنتلا اور ستیہ وان و ساوتری کے قصے لیے گئے ہیں۔ ساوتری کی کہانی سے متعلق ایک، شکنتلا پر چار اور نل دمینتی پر مبنی چھے مثنویاں اردو میں لکھی ہیں، جن کی تفصیل کتاب میں ملے گی۔

(ب) لوک کہانیاں: اس ذیل میں وہ قصے کہانیاں آتی ہیں، جو پنچ تنتر، شک سپ تتی، بیتال پچیسی، کتھا سرت ساگر یا جاتک کہانیوں یا ہندستان کے قدیم افسانوی ادب سے ماخوذ ہیں، یا جو عوامی روایتوں اور علاقائی زبانوں کے مقبولِ عام قصوں سے لی گئی ہیں۔ انھیں دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی شق میں دکھنی مثنویات مثلاً کدم راؤ پدم راؤ، طوطی نامہ، میناستونتی، منوہر اور مدھومالتی، عود و صندل، نیہ درپن اور کامروپ و کلا کام سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصّے میں شمالی ہندستان کی مثنویوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، جن میں سے زیادہ اہم مثنویاں یہ ہیں: سنگھاسن بتیسی، راجا بلوان مل وچتر سین، قصّہ کنور و چندر کرن، راجا چترمکٹ اور رانی چندر کرن، قصّہ راجا گوپی چند اور قصّہ راجا کنور سین ورانی چتر اولی۔

(ج) نیم تاریخی قصّے: ان کے تحت وہ قصّے لیے گئے ہیں، جنھیں عوامی روایتوں میں امرِ واقع سمجھا جاتا ہے یا جن کا تعلق کسی تاریخی واقعہ سے ہے۔ اردو میں ایسی چند مثنویاں یہ ہیں: ہیر رانجھا، سسی پنوں، پدماوت، سوہنی مہینوال، بدھو گل فروش، قطب مشتری، چندر بدن و مہیار، ندرتِ عشق، مغل اور ناگرنی، طالب و موہنی، بہلول صادق، شعلۂ شوق، سوز و گداز، مثنوی دل پذیر اور مثنوی سراپا سوز۔

(د) ہند ایرانی قصّے: مذکورہ بالا قصّوں کے علاوہ اردو مثنویوں کے کچھ قصّے ایسے بھی ہیں، جن میں دعویٰ تو یہ کیا گیا ہے کہ قصّہ ''چین و ماچین یا

خطاوختن" کا ہے، لیکن کرداروں کے معاشرتی آثار و کوائف، فطری مظاہر اور مثنوی کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ قصّے کی جائے وقوع ہندستان ہی ہے۔ یہ قصّے پلاٹ کے اعتبار سے مخلوط ہیں، نہ یہ خالص ہندستانی ہیں نہ ایرانی۔ کہنے کو یہ قصّے طبعزاد ہیں، لیکن دراصل ان میں ہندی اور ایرانی قصّے کہانیوں کی روایتیں کچھ اس انداز سے مل گئی ہیں کہ ایک نیا قصہ بن گیا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ایسے قصّوں میں ایرانی قصّے کی عظمت اور ہندی لوک کہانیوں کی پراسرار وسعت دونوں کا اثر نظر آئے گا۔ اس لحاظ سے انھیں "ہند ایرانی" کہا جاسکتا ہے۔ اردو میں اس قسم کی متعدد مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ ان سب کا ذکر چونکہ تکرار اور طوالت کا موجب ہوگا، اس لیے یہاں دکھنی، دہلوی اور لکھنوی مثنویوں میں سے ایک ایک کا انتخاب کر لیا گیا ہے۔ دکھنی مثنویوں میں سے پھول بن، دہلوی رنگ کی مثنویوں میں سے سحرالبیان اور لکھنوی مثنویوں میں سے گلزارِ نسیم کا تہذیبی مطالعہ پیش کرتے ہوئے، اس بات کا پورا خیال رکھا گیا ہے کہ قصّے کے مختلف اجزاء کی اصلیت پوری طرح روشنی میں آجائے۔

مندرجہ بالا مثنویوں کو ہر باب کے تحت قصّے کی قدامت اور تاریخی ترتیب کے اعتبار سے پیش کیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ مثنوی سے بحث کرتے ہوئے متعلقہ قصّے کی قدیم ترین روایت کو سامنے رکھا جائے اور اختلافات کی نشان دہی بھی کردی جائے۔ اردو کی بعض مثنویاں چونکہ فارسی سے ترجمہ ہیں، اس لیے فارسی نسخوں کے نام پیش کرنا بھی ضروری سمجھا گیا۔ ہر قصّے سے متعلق اردو کی نثری اور منظوم روایتوں کی بھی پوری تفصیل دے دی گئی ہے۔ اردو کی زیرِ تبصرہ مثنویوں میں سے چونکہ بیشتر قلمی ہیں اور ان کا تعارف پہلی مرتبہ کرایا جارہا ہے، اس لیے مآخذ بہ قیدِ سنہ و صفحہ درج کردیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف قدیم اور قلمی تذکروں کے علاوہ کتب خانہ شاہانِ اودھ، برٹش

میوزیم، انڈیا آفس، باڈلین، کیمبرج، ایشاٹک سوسائٹی بنگال، کرزن کلکشن، بانکی پور، کتب خانہ سالار جنگ، عثمانیہ اور آصفیہ (حیدر آباد) کی وضاحتی فہرستوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ تاکہ زیرِ تبصرہ مثنویوں کے مختلف نسخوں کے بارے میں تمام ضروری معلوماتِ فراہم کر دی جائیں۔ جہاں تک ممکن تھا، کوشش کی گئی ہے کہ موضوع زیرِ بحث کا کوئی حصہّ تشنہ نہ رہے اور اردو مثنویوں کا وہ پہلو جو ہنوز تاریکی میں تھا پوری طرح سامنے آجائے۔

مشکل شدہ است کارِ دل از عشق و خوش دلم
شاید رسد بخاطر مشکل پسندِ تو

دہلی یونیورسٹی
۲/ اگست ۱۹۵۹ء

گوپی چند نارنگ

باب اوّل

پُورانک قصّے

مثنویات نل دمن

ہندستان کا یہ ہردل عزیز قصہ ہندووں کی مشہور مذہبی کتاب "مہابھارت" سے لیا گیا ہے۔ یہ پانڈووں کو ان کی جلاوطنی کے زمانے میں تفریحاً سنایا گیا تھا۔ اس لحاظ سے نل دمن کی کہانی پُرانوں کے زمانے سے بھی قدیم ہے۔ سنسکرت میں اس قصّے کے متعدد نسخے ملتے ہیں، لیکن مستند متن مہابھارت ہی کا ہے۔ نل دمن ہندستان کے ان چند قصّوں میں سے ہے، جن کی شہرت و مقبولیت ہندستان سے باہر بھی ہے اور جن کا غیر ملکی زبانوں میں بار بار ترجمہ کیا گیا ہے۔

قصّہ

نل دمن کے اس مشہور قصّے کا خلاصہ یہ ہے:

نل وسطی ہندستان کی نشادھ ریاست کا راجا تھا۔ نہایت حسین، تنومند، ویدوں کا عالم، شجاعت اور مردانگی میں فرد اور اسپ شناسی میں یکتائے روزگار تھا۔ رتھ چلانے میں ہَوا سے بھی تیز، لیکن چوسر بازی اور جُوا کھیلنے کی لت تھی۔

دمینتی وِدربھ (بیدر) کے راجا بھیم کی اکلوتی بیٹی تھی، جس کے حسن و خوبی کا ایک عالم میں چرچا تھا۔ نل اور دمینتی دونوں ایک دوسرے کی تعریف و تحسین سُن کر نادیدہ عشق میں مبتلا ہوگئے۔ حُسنِ اتفاق سے نل کے ہاتھ ایک ایسا ہنس لگا، جس نے دمینتی سے جاکر نل کی شورشِ عشق کا ذکر کیا۔ دمینتی اس آگ میں پہلے ہی پھُنک رہی تھی۔ غرض نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہوا اور تمنّا کی بے تابی دونوں طرف رنگ لانے لگی۔

راجا بھیم نے فیصلہ کیا کہ دمینتی سوئمبر کے ذریعے اپنے شوہر کا انتخاب کرلے۔ سیکڑوں راجے مہاراجے اور کنور قسمت آزمائی کے لیے بیدر پہنچے۔ نل بھی ان میں سے ایک تھا۔ چار دیوتا — اگنی، اندر، وُرن اور یم بھی اس سوئمبر

میں شرکت کی غرض سے آئے۔ راستے میں نل سے اُن کی مٹھ بھیڑ ہوئی۔ انھوں نے نل کو حکم دیا کہ وہ دمینتی سے کہہ دے کہ دمینتی ان چاروں میں سے کسی ایک کو شوہر منتخب کرلے ورنہ خیر نہیں۔

بیدر پہنچ کر نل نے بادلِ ناخواستہ دیوتاؤں کے حکم کی تعمیل کی۔ مگر خود اس کی موجودگی میں دیوتاؤں کا چراغ کیا جلتا! دمینتی کو نل کی طرف ملتفت دیکھ کر دیوتاؤں نے نل کی شکل اختیار کرلی۔ دمینتی اپنے امیدواروں میں ایک کے بجائے پانچ نل دیکھ کر مخمصے میں پڑگئی۔ مگر دلِ مبتلا نے رہ نمائی کی اور دمینتی نے انتخاب کا سہرا حقیقی نل کے گلے میں ڈال دیا۔

کالی دیوتا سوئمبر میں دیر سے پہنچا۔ نل کی کامیابی پر وہ حسد کی آگ میں جلنے لگا اور اس نے بدلہ لینے کی ٹھانی۔

شادی کے بعد نل اور دمینتی نشادھ میں بڑی فراغت سے زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کے ایک لڑکا اندر سین اور ایک لڑکی اندرا پیدا ہوئی۔ چند برس بعد نل کی کسی خفیف بھول پر حاسد دیوتا کالی کو نل کے حواس پر قابو پانے کا موقع مل گیا اور اسے اپنے بھائی پشکر سے چوسر کھیلنے کی ترغیب ہوئی۔ نل بازی بدکر کھیلا۔ چوسر پر کالی کا اثر تھا۔ نل کو مات پر مات ہوئی، حتیٰ کہ وہ تخت و تاج اور مال و املاک ہر شے ہار گیا۔ راجا بننے کے بعد پشکر نے اعلان کیا کہ کوئی شخص نل کو پناہ نہ دے۔ نل کے لیے سوائے نشادھ چھوڑنے کے چارہ نہ تھا۔ دمینتی نے بھی اس کا ساتھ دیا اور دونوں نے جنگل کی راہ لی۔

دورانِ سفر میں بھوک نے زور کیا تو نل نے پرندے پکڑنے کے لیے ان پر اپنی چادر پھینکی، پرندے چادر سمیت اڑ گئے۔ اس غربت اور بے بسی کے عالم میں نل سے دمینتی کی پریشانی نہ دیکھی گئی۔ حاسد دیوتا کی وجہ سے نل پر جنون کا غلبہ تو تھا ہی، اس نے سوتے میں دمینتی کو اکیلا چھوڑ کر اپنی راہ لی۔ دمینتی مدتوں جنگلوں کی خاک چھانتی اور تنکے چنتی پھری۔ اتفاق سے اسے چھِدی کی شہزادی کے ہاں پناہ مل گئی، جہاں سے اس کے والدین اسے لے گئے۔

اُدھر نل خاک بسر، دربدر ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ جنگل میں اس نے ایک سانپ کی جان بچائی، اُسے جلتی آگ سے باہر نکالا۔ لیکن سانپ نے نل کو ڈس لیا، جس سے نل کی شکل ایک سیاہ بونے کی سی ہو گئی۔ نل کے سٹ پٹانے پر سانپ نے کہا کہ ''تمھارا بھلا اسی میں ہے۔ تمھاری قسمت کا ستارہ گردش میں ہے اور اسی شکل میں تم آنے والی صعوبتوں سے محفوظ رہ سکو گے۔ جب تمھارے دن پھریں گے تو زہر کا اثر خود بخود جاتا رہے گا''۔ چنانچہ نل اسی حالت میں اجودھیا کے راجا رتوپرن کے ہاں رتھ بان اور خانساماں کی حیثیت سے ملازم ہو گیا۔

دمینتی نے میکے پہنچ کر نل کی تلاش میں جگہ جگہ سُراغ رساں بھیجے مگر بے سُود۔ نل کی صورت بدل چکی تھی۔ آخر بعد مدت کے ایک دقیقہ رس برہمن سُراغ رساں کو راجا رِتوپَرن کے رتھ بان پر نل کا شبہہ ہوا۔ دمینتی نے اس کی تصدیق چاہی اور راجا رِتوپَرن کو اپنے سوئمبر کی جھوٹی خبر پر بلا بھیجا اور وقفہ اتنا تھوڑا دیا کہ دُنیا بھر میں سوائے نل کے اس قدر تیز رتھ چلانے والا کوئی نہ تھا جو راجا رِتوپَرن کو رات کی رات مقررہ وقت کے اندر ودربھ پہنچا دے۔

راجا رِتوپَرن ریاضی اور چوسر میں غیر معمولی دسترس رکھتا تھا۔ دورانِ سفر میں وہ نل کو ان علوم کے رموز و نکات سے آگاہ کرتا رہا اور نل نے اس احسان کے بدلے میں اپنی حیرت انگیز برق رفتار رتھ بانی کا کمال دکھایا اور صبح ہونے سے پہلے ہی رِتوپَرن کو ودربھ پہنچا دیا۔ یہ دیکھ کر دمینتی کا شبہہ گہرا ہو گیا۔ لیکن نل ابھی بونے کی شکل میں تھا۔ دمینتی نے اس کی اصلیت کا تیقن کرنے کے لیے چند اور آزمائشیں کیں اور بالآخر نل کا پکایا ہوا کھانا چکھنے سے اس کا گمان یقین میں بدل گیا۔ نل پہچانا گیا۔ مدّتوں کے بچھڑے آپس میں ملے۔ نل نے سانپ کی بتائی ہوئی ترکیب سے اپنی بد شکلی سے نجات پائی اور اپنی اصل حالت میں آگیا۔

دمینتی کے والد راجا بھیم نے نل کی جمعیت میں ایک بھاری لشکر روانہ کیا تاکہ وہ اپنے غاصب بھائی پشکر سے جنگ آزما ہو کر اپنی سلطنت حاصل

کر سکے۔ نشادھ پہنچ کر نل نے پشکر کو پھر چوسر کی دعوت دی اور اب کی بار سلطنت کے مقابلے پر نل نے دمینتی کو لگا دیا۔ نل پہلے ہی رِتوپَرن سے اس کھیل کے رموز و نکات سیکھ چکا تھا۔ چنانچہ کامیاب رہا۔ پشکر اپنے کیے پر پچھتایا اور معافی کا طالب ہوا۔ نل نہ صرف خلوص و محبت سے پیش آیا بلکہ انعام و اکرام سے نوازتے ہوئے اس نے پشکر کو گاؤں جانے کی اجازت بھی دی۔ اجڑا چمن شاداب ہوا، اور نل اور دمینتی پھر سے نشادھ پر حکمرانی کرنے لگے۔[۱]

نل دمن کے اس قصّے کو مشہور سنسکرت شاعر کالی داس نے بھی "نل اودے" کے نام سے نظم کیا ہے۔[۲] کالی داس کے بعد اس قصّے پر طبع آزمائی کرنے والوں میں شری ہرش قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے اس قصّے کو "نشادھ چرتر" کے نام سے لکھا۔[۳] نل دمن کے ہندی ترجموں میں سب سے مشہور اور اہم ترجمہ کوی سور داس کا ہے۔[۴]

نل دمن کا قصہ مہابھارت کے بعد ہندستانی قصّے کہانیوں کی مشہور کتاب کتھا سرت ساگر مؤلفہ سوم دیو میں بھی ملتا ہے۔ یہاں سے اسے Penzer نے بزبان انگریزی The Ocean of Story جلد ۴ میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب لندن سے ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔

نل دمن کا ترجمہ انگریزی، فرانسیسی، سویڈش، پولش، یونانی اور ہینگیرین وغیرہ زبانوں میں ہوچکا ہے۔ انگریزی میں[۵] Norman E. Penzer اور Sister Nevidata کے خلاصے، لاطینی میں Bopp Franz اور جرمن میں Ruckert کے ترجمے قابلِ ذکر ہیں۔[۶]

---

۱ مہابھارت، بھنڈارکر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پونا؛ ۱۹۴۲ء؛ دن پرو؛ نل اپاکھیان پرو

۲ جان برو، چیمبرز جلد ۹، ص ۶۵۳

۳ امریکانا، جلد ۱۹، ص ۶۸۵

۴ بمبئی نمبر ۱۳، ص ۲۷۸

۵ اورینٹل کالج میگزین ضمیمہ نومبر ۱۹۴۱ء، صفحہ ۲۰

۶ ایضاً، اگست ۱۹۴۲ء، صفحہ ۴

نل دمن کا متن Buhler نے ۱۸۷۷ء اور Kellner نے ۱۸۸۵ء میں شائع کیا۔ Monier Williams کا انگریزی ترجمہ آکسفورڈ سے ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا۔[۷]

فارسی میں اس قصے کو سب سے پہلے اکبر اعظم کی فرمایش پر فیضی نے ۱۰۰۳ھ میں لکھا۔[۸]

ابوالفیض فیضی (۹۵۴ھ ۔ ۱۰۰۴ھ) نے خمسہ یعنی نظامی کی پانچوں مثنویوں کا جواب لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کی تفصیل اس نے خود ایک خط میں لکھی ہے:

"اسامی کتب خمسہ این ست، اول مرکز ادوار کہ اکثرے در فتح پور گفتہ شدہ بود، دوم سلیمان و بلقیس کہ پیش ازیں ہفت سال در لاہور بنیاد کردہ بود، و چیزے چند ازاں گفتہ، سوم نل دمن کہ تمام شد، چہارم ہفت کشور، کہ در احوال ہفت اقلیم گفتہ خواہد شد، پنجم اکبر نامہ کہ آں ہم جستہ جستہ وقتے گفتہ بود"۔[۹]

ابوالفضل نے اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ یہ پانچوں مثنویاں انجام کو پہنچیں۔[۱۰] لیکن یہ صحیح نہیں۔ شبلی کا بیان ہے کہ "ان میں سے دو کتابیں یعنی نل دمن اور مرکز ادوار انجام کو پہنچیں۔ مرکز ادوار کی ترتیب ابوالفضل نے فیضی کے مرنے کے بعد کی۔ ۳۰ جلوس میں فیضی کو خمسہ کا خیال پیدا ہوا اور ساتھ ساتھ مثنویوں کی بنیاد ڈالی۔ لیکن چونکہ بہت مشغلے پیش آتے رہتے تھے، کوئی کتاب انجام کو نہ پہنچ سکی۔ ۳۹ جلوس میں اکبر نے اصرار کے ساتھ کہا کہ سب سے پہلے نل دمن انجام پائے"۔[۱۱] ابوالفضل نے لکھا ہے کہ "...... دریں سال

---

۷ ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر، اے، اے میکڈانلڈ، ص ۴۴۵

۸ ایشیاٹک، ۶۹۶ (این اے ۱۰۶) نیز کرزن، ۲۵۷ (III ۱۸) ریو: برٹش صفحہ ۶۷۱؛ اشپرانگر ص ۴۰۲، بمبئی: ص ۲۷۸

۹ شعر العجم جلد ۳، ص ۵۵

۱۰ اکبرنامہ جلد ۳، ص ۶۶۱

۱۱ شعر العجم جلد ۳، ص ۵۶

(۳۹ جلوس) اورنگ نشیں فرہنگ آرا آں دانائے رموزا نفسی و آفاقی را طلب داشتہ، اہتمام پایان بردن آں پنجنامہ فرمود۔ و اشارت ہمایوں براں رفت کہ نخست افسانۂ نل دمن بترازوے سخن سنجی برسختہ آید۔ در چہار ماہ چہار ہزار بیت بلغونۂ انجام پیراستہ او گشت"۔ (۱۲)

اکبر اس مثنوی سے بہت محظوظ ہوا۔ نقیب خاں کو حکم ہوا کہ وہ پڑھ کر سنایا کرے۔ پوری تفصیل بدایونی نے یوں لکھی ہے:

"دریں ایام (۱۰۰۳ھ) بملک الشعرا حکم تصنیف پنج گنج فرمودند تا در مدتِ پنج ماہ کم و بیش کتاب نل دمن را کہ عاشق و معشوق بودند و آں قصہ در اہل ہند مشہور است مشتمل بر چہار ہزار و دویست بیت و کسری مرتب ساختہ در نظر باچند اشرفی نذر گذرانید و بسیار مستحسن افتاد و حکم بکتابت و تصویر آں و خواندن در مثل بہ نقیب خاں فرمودند ...... الحق مثنوی ست کہ دریں سی صد سال مثل آں بعد از میر خسرو شاید در ہند کسے دیگر نگفتہ باشد"۔ (۱۳)

فیضی کی یہ شہرہ آفاق مثنوی پہلی بار کلکتے سے ۱۸۳۱ء میں شائع ہوئی۔ (۱۴) اس مثنوی کے کچھ حصوں کا ترجمہ Spiegel نے لپزگ سے ۱۸۴۶ء میں Chrestomathia Persica میں پیش کیا۔ (ص ۱۵۰۔۱۳۱) (۱۵)

اکبر کو یہ مثنوی اس قدر پسند تھی کہ خاص خوشنویسوں اور مصوّروں کو حکم دے کر مصوّر و مزیّن شاہی نسخہ تیار کرایا۔ فیضی کی یہ مثنوی اپنی فنی خوبیوں اور قصّے کی دلچسپی کی وجہ سے بہت مشہور ہوئی۔ اردو میں اس قصّے سے متعلق جتنے بھی نسخے ملتے ہیں، ان میں سے اکثر میں کہانی کی بنیاد فیضی ہی کے متن پر

---

۱۲ اکبرنامہ جلد سوم، ص ۶۶۲

۱۳ منتخب التواریخ جلد دوم، ص ۳۹۶۔ فیضی کے حالات وغیرہ کے لیے مزید ملاحظہ ہو، مآثرالامراء جلد ۲، ص ۵۸۲؛ بیل ص ۸۴

۱۴ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، جلد ۲، ص ۴۴

۱۵ بوہار، ص ۲۷۴

رکھی گئی ہے۔

اُردو نثری نسخے

(۱) اردو نثر میں اس قصّے کو سب سے پہلے الٰہی بخش شوق نے ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء میں لکھا۔ یہ نسخہ فیضی کی نل دمن سے ترجمہ ہے۔ شوق مرزا مظہر بخت خلف مرزا جواں بخت کے ملازم تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۴۱ھ میں ہوا۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔[۱۶]

(۲) گارساں دتاسی نے رگھوناتھ کے ایک مطبوعہ نسخے کا حوالہ دیا ہے۔[۱۷] لیکن نل دمن از رگھوناتھ تحقیق طلب ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ نسخہ نثر میں ہے یا نظم میں۔

اُردو منظوم نسخے

(۱) نل دمن (اُردو ڈراما) مصنفہ گوری شنکر صفحات ۳۶، کانپور ۱۸۸۸ء۔[۱۸]

(۲) نل دمیتی (اُردو ڈراما) از ونائیک پرشاد، کل صفحات ۷۱، لکھنؤ ۱۸۸۵ء۔[۱۹]

(۳) تماشائے نونہال چمن (اردو ڈراما) مشتمل برقصۂ نل دمن۔ مصنفہ مرزا نظیر بیگ اکبر آبادی۔ صفحات ۵۶، آگرہ ۱۸۹۳ء[۲۰]

(۴) نل دمن، میر نیاز علی دہلوی متخلص بہ نکہت (قلمی) اوراق ۱۱۵،

---

۱۶ بلوم ہارٹ؛ برٹش؛ ۹۷

۱۷ تاریخ ادبیات ہندی و ہندستانی؛ ج ۲، ص ۵۲۲۔ ۵۲۴، بحوالہ معاصر ۱۱

۱۸ انڈیا مطبوعات ص ۹۸

۱۹ ایضاً، ص ۹۸

۲۰ انڈیا مطبوعات ص ۱۰۰، نیز اردو ڈراما، عشرت رحمانی، ص ۲۲۳

مخطوطہ کتب خانۂ رضائیہ، رامپور۔ ناقص الآخر (قبل ۱۲۵۶ھ)[۲۱]

(۵) نل دمن، بھگونت رائے راحت کاکوروی (قلمی) سنہ تصنیف ۱۲۴۴ھ۔ مکتوبہ ۱۸۵۶ء اوراق ۶۶، مخطوطہ لٹن لائبریری علی گڑھ۔[۲۲]

(۶) بہارِ عشق، میر علی بنگالی (قبل ۱۸۵۴ء)[۲۳]

(۷) نل دمن، احمد سراوی (قلمی) پنجاب یونی ورسٹی لائبریری، لاہور، اوراق ۴۵، سنہ کتابت ۴۰ھ، غالباً ۱۲۴۰ھ۔[۲۴]

(۸) نل دمن؛ احمد علی؛ لکھنؤ (قبل ۱۸۵۴ء)[۲۵]

گارساں دتاسی نے غالباً احمد سراوی ہی کو احمد علی لکھا ہے۔ ہمارے نزدیک فقط احمد سراوی کی مثنوی کا وجود متحقق ہے۔

(۹) نل دمن، کالی پرشاد، صفحات ۳۶، مطبوعہ ۱۸۶۹ء، لکھنؤ[۲۶]

(۱۰) مکرم الدولہ سید علی اکبر خاں بہادر مستقیم جنگ، اکبر تخلص نے بھی ایک اُردو مثنوی "نل دمن" لکھی تھی۔ انھوں نے چالیس تذکروں سے مدد لے کر شعرائے ریختہ کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا اور ایک فارسی دیوان بھی یادگار چھوڑا تھا، مگر اب ان میں سے کوئی کتاب نہیں ملتی۔[۲۷]

اکبر، نواب تاج محل بیگم کے برادر حقیقی اور مرزا جواں بخت جہاندار شاہ ولی عہد کے ماموں تھے۔ تمام عمر عیش و عشرت سے بسر کی۔ علم موسیقی میں بھی

---

۲۱ کتب خانہ رضائیہ رامپور؛ نشان ۵۸۲

۲۲ لٹن لائبریری، علی گڑھ، نشان ۵۵

۲۳ "ہندستانی مصنفین اور ان کی تصانیف" مشمولہ خطبات گارساں دتاسی، ص ۱۵۵، خطبہ سوم میں دتاسی نے بہار عشق کو نور علی سے منسوب کیا ہے، ص ۲۳

۲۴ اورینٹل کالج میگزین، ضمیمہ نومبر ۱۹۴۱ء، صفحہ ۲۱

۲۵ "ہندستانی مصنفین اور ان کی تصانیف" مشمولہ خطبات گارساں دتاسی، ص ۱۵۵

۲۶ بلوم ہارٹ، کتب برٹش، ص ۱۵۳

۲۷ خمخانہ، اول، ص ۳۷۵

اچھا دخل تھا۔ عین عالم شباب میں ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں انتقال کیا۔[۲۸]

(۱۱) ڈاکٹر مختار الدین آرزو کا بیان ہے کہ بھولا ناتھ فراغ نے بھی ایک مثنوی نل دمن لکھی تھی۔[۲۹] اس کی تفصیل ہنوز تحقیق طلب ہے۔ بلوم ہارٹ نے بھولا ناتھ کا تخلص "فارغ" بتایا ہے اور ان کی ایک تصنیف "فسانۂ عجائب منظوم" جو رجب علی بیگ کے "فسانۂ عجائب" پر مبنی ہے، کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب لکھنؤ سے ۱۸۷۰ء اور کانپور سے ۱۸۷۷ء میں ۳۱ صفحوں پر شائع ہوئی تھی۔[۳۰]

(۱۲) راجا نل بزبان ہریانہ (گیتوں اور دوہوں میں) مصنفہ مٹھن لال چُنی لال۔ اسے اردو رسم الخط میں شمبھو دیال دیناناتھ نے دریبہ کلاں دہلی سے اواخر انیسویں صدی میں شائع کیا۔

(۱۳) راجا نل دمینتی بزبان ہریانہ (گیتوں اور بھجنوں میں) از پنڈت موجی رام شیوچند۔ یہ کتاب بھی اردو رسم الخط میں دریبہ کلاں دہلی سے اواخر انیسویں صدی میں شائع ہوئی۔

مثنوی نل دمن، احمد سراوی

اشپرانگر کا بیان ہے کہ غالباً یہ احمد سراوی وہی شخص ہے، جس نے "گل و صنوبر" اور دو ہندستانی نظمیں "مور پنکھی" اور "رشکِ پری" لکھی ہیں اور جن کا ذکر گارساں دتاسی نے کیا ہے۔[۳۱] موخر الذکر ۱۲۴۱ھ میں لکھی گئیں۔ مثنوی نل دمن میں سنہ کتابت بالتصریح درج نہیں کیا گیا۔ فقط ۴۰ھ لکھا ہے۔ اگر رشک پری اور مثنوی نل دمن کا مصنف ایک ہی احمد سراوی ہے تو رشک پری کے سنہ کتابت ۱۲۴۱ھ کے پیشِ نظر، یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ مثنوی نل

---

۲۸ ملاحظہ ہو؛ مجموعۂ نغز، ۱، ص ۶۷، طبقات شعرائے ہند: ۲۸۲ و قائع عالم شاہی ۱۹ اور ۲۰۰

۲۹ مکتوب بنام مولف

۳۰ انڈیا مطبوعات، ص ۱۵۴

۳۱ یادگارِ شعراء، ص ۲۰

دمن کے ترقیمے میں ۴۰ھ سے مراد ۱۲۴۰ھ ہے۔

مثنوی نل دمن از احمد سراوی میں سنہ کتابت فقط ۴۰ھ درج ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا قیاس ہے کہ یہ مثنوی ۱۱۴۰ھ میں لکھی گئی۔(۳۲) اشپرانگر نے جس احمد سراوی کا ذکر کیا ہے، وہ اس کی دو نظموں: مور پنکھی اور رشک پری کو ۱۲۴۱ھ کی تصنیف بتاتا ہے۔(۳۳) چنانچہ قطعی ثبوت کی غیر موجودگی میں ہم نے مثنوی نل دمن کو ۱۲۴۰ھ کی تصنیف قیاس کیا ہے۔

اس مثنوی کا مکمل متن ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے آج سے اٹھارہ برس پہلے، اورینٹل کالج میگزین میں بالا قساط شائع کیا تھا(۳۴) اور اس تصنیف کی لسانی خصوصیات سے بھی سیر حاصل بحث کی تھی۔(۳۵) گو اس مثنوی کا مصنف احمد سراوی، سراوا ضلع میرٹھ کا باشندہ ہے، لیکن مثنوی کی زبان میں ہریانی کا عنصر گہرا ہے۔ احمد سراوی نے قصہ نل دمن کو ہریانی میں نظم کرنے کی کوئی وجہ بیان نہیں کی۔ لیکن اغلب ہے کہ نل دمن فیضی کی مقبولیت اس کی محرک ثابت ہوئی ہو۔ احمد سراوی نے فیضی ہی کی مثنوی کو اپنے قصے کی بنیاد بنایا ہے۔ کہیں کہیں فیضی کے فارسی الفاظ ہو بہو لے لیے ہیں۔ لیکن یہ مثنوی فیضی کا پابند ترجمہ نہیں۔ احمد نے قصے کے معاملے میں فیضی کا تتبّع ضرور کیا ہے، لیکن فیضی کی طول نویسی سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے جذبات کے بیان اور مناظر کی تصویر کشی میں اضافے کیے ہیں، لیکن اصل قصّے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اپنے زمانے کے رواج کے مطابق احمد سراوی بھی کہانی کی ہر کڑی کے بعد بھاشا کے دُہرے درج کرتا ہے، جو خود اس کی تصنیف ہیں۔ اس سے قیاس ہوتا ہے

---

۳۲ اورینٹل کالج میگزین، ضمیمہ نومبر ۱۹۴۱ء

۳۳ یادگارِ شعراء، ص ۲۰

۳۴ ملاحظہ ہو اورینٹل کالج میگزین (ضمیمہ) نومبر ۱۹۴۱ء، ص ۲۰ تا ۳۶، فروری ۱۹۴۲ء، ص ۳۷ تا ۵۲، مئی ۱۹۴۲ء، ص ۵۳ تا ۶۸، اگست ۱۹۴۲ء، ص ۶۹ تا ۸۴۔ نومبر ۱۹۴۲ء، ص ۸۵ تا ۹۸

۳۵ ملاحظہ ہو اورینٹل کالج میگزین، شمارہ اگست ۱۹۴۲ء، ص ۳ تا ۴۳

کہ اس کے پیشِ نظر نل دمن کا کوئی بھاکا میں لکھا ہوا نسخہ رہا ہوگا۔ لیکن نفسِ قصہ پر غور کرنے سے یہ حقیقت کھلتی ہے کہ اصل سنسکرت روایت اور فیضی کے ہاں جو ہلکے سے اختلافات ہیں، وہ احمد سراوی کے ہاں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ واقعاتِ قصہ کے معاملے میں احمد سراوی سوائے فیضی کے کسی دوسری روایت سے متاثر نہیں ہوا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے صحیح لکھا ہے کہ "احمد سراوی نے اس نظم کو لکھتے ہوئے فیضی کی کتاب سے لفظاً و معناً بہت فائدہ اٹھایا ہے۔"[۳۶]

مثنوی کا آغاز حسبِ معمول حمد و نعت سے ہوتا ہے۔ اس ضمن میں یہ دوہا بند کے آخر میں آیا ہے:

ہوں نرگن، اوگن کہی تو جگ کا کرتار
ان نرگن کے کارنی، اوگن موری بسار

اس کے بعد کشور ہند کی یوں تعریف کی ہے:

ہے کشورِ ہند دل کشا تر — برو بحرش فرح فزا تر
اس خاک سے ہے خمیر میرا — خورشید ہے یاں ضمیر میرا
ہے ہند بہشت کی نشانی — ہر چشمہ آب زندگانی
ہر شہر و قریہ ہائے ایں بوم — فردوس ہے جابجائے مقسوم
خونیں نگہاں عشوہ پرداز — غنچہ دہناں شوخ طناز
سوداگرِ عاشقانِ بے دل — لیتے ہیں بہ نقد غمزہ صد دل
مشہور ہے ہند میں سراوا — رکھتا ہے بہشت ساتھ دعویٰ
ہر طفل بعلم عشق اوستاد — حق اس کو رکھے ہمیشہ آباد

نل کی شورشِ عشق کے بعد ایک ندیم اتفاقاً دمن کے حسن و جمال کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس موقعے پر احمد سراوی نے نل کا سراپا بڑی خوبی اور چابکدستی

۳۶ ایضاً، ص ۱۱

سے پیش کیا ہے۔ عریانی نام کو نہیں، لیکن سراپا نگاری کی قدیم روایت کو زفرق تابقدم پوری طرح نبھایا ہے۔ مثنوی کی زبان ابتدائی زمانے کی ہے اور مخلوط ہریانی کی وجہ سے ادق اور اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ اگر غور کیجیے تو اس بُتِ طناز کی تصویر کشی میں شاعر نے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ ہر نقش زندہ ہے اور ہر خط دل کش۔ تشبیہیں اور استعارے صاف، پرزور اور معنی خیز۔ گو شاعر کے سامنے فارسی مثنوی تھی، پھر بھی جمالیاتی احساس کی فضا میں ہندستانی رنگ صاف جھلکتا ہے:

کیا بال کہوں بھونگ[۳۷] کارے — چندن پی کریں کلول سارے
وہ مانگ سفید جگمگاوے — بگ پانٹ[۳۸] گھٹا منے آوے
کیا وصف کروں میں اس جبیں کا — ماتھا نہیں، چاند چودھویں کا
ابرو نہ، کہ تیغ مغربی ہیں — جنگی صف وے پلک سجے ہیں
دو نین گویا کھجن[۳۹] کے جوڑے — سرخ و سیہ و سفید ڈورے
....
ہے مانگ گویا کھڑگ[۴۰] کی دھارا — بل کھائے رہے دو ناگ اون سنگ
رخسارہ سفید، سرخ خوشرنگ — موتی سچے اون کے سنگ ساجیں
وہ کان میں بالیاں براجیں — دندان کی جوت سے نیارے
لب سرخ دہان تنگ پیارے — کہ باگ رکھے ہے جیسے اسوار
گردن نہ، کہوں ترنگ[۴۱] سجدار — خورشید دپے[۴۲] ہے جوں صبا میں
مہندی میں ہتھیلیاں رچائیں

---

۳۷ سانپ
۳۸ بگلوں کی قطار
۳۹ چھوٹی سی چڑیا جو جاڑوں میں دکھائی دیتی ہے
۴۰ تلوار
۴۱ گھوڑا
۴۲ روشن

ہے پیٹ کنول پتر ملایم　　پانوں سے ہے قوت اس کا دایم
دو جانگ[۴۳] ساق گویا کشیدہ شمشاد　　قد راست مثال سرد آزاد
کیا حسن کہ آگ کا بھبوکا　　لوٹا ہے قرار ہر کسو کا
سر کھول پری اگر اٹھاوے　　دن رات کو ایک ہی دکھاوے
مہندی سے نہیں قدم کو لالی　　آئے ہے خلق پہ پایمالی
بجلی کی جھلک ہے مسکرانا　　اندھیار میں پھلجھڑی دکھانا
لجونت سورج سے مکھ چھپاوے　　تاروں سے پری کو لاج آوے
مشہور بنام خود دمن ہے　　بے شبہ جمال کا چمن ہے

مرغ کے ذریعے پیغامِ یار پاکر، دمن، تصور جاناں لیے ہوئے یوں آہ و فغاں کرتی ہے:

اے طالعِ سخت تیں جلایا　　تو بھی مرے کام کچھ نہ آیا
اسطور سے نل سخن سناوے　　بیراگ کا راگ غم سے گاوے
دم دم میں دمن دمن پکارے　　پل یاد سجن کی نہ بسارے
اے شمع کہاں ہے تو کہاں ہے　　آتش زنِ خانماں کہاں ہے
بن دیکھیں ہی زخم تین لگایا　　بیداد! تجھی رحم نہ آیا

کاری لاگو گھاو، کت جاؤں کاسوں کہوں
تو سووے سکھ نیند ہوں تجھ بن دوکھ یہ سہوں

سوئمبر کا سماں دیکھیے۔ دور دور سے راجے مہاراجے اور کنور قسمت آزمائی کے لیے تشریف لائے ہیں:

سب راجا و راؤ آرزو میں　　مشغول دمن کی گفتگو میں
کیا جانئے درش کب دکھاوے　　اب کون پسند اوس کو آوے

---

۴۳ ساق

ہوں کس کے نصیب بیدار　　پاوے شفا ہم میں کون بیمار
کوئی حسب اور نسب جتاوے　　کوئی نشۂ مردمی دکھاوے
دیس اپنا کوئی زباں پہ آنے　　ایک اور خزانے کو بکھانے
کوئی کہے فوج مجھ ہے بھاری　　میں سب میں بڑا ہوں راجدھاری
سگھڑائی کوئی کرے نمودار　　کوئی کرے اپنا شوق اظہار

اولے[۴۴] سے نکلی دمن پری روپ جھلکار
مانو سگلی سبھا کوں گئی بیجلی مار

مسکان میں سب بہار لوٹی　　سورج کی کرن صبح میں پھوٹی
گھونگھٹ تو ادھک اٹھائے دیناں　　قتلِ عام سبھا کا مفت کیناں
پھولوں کا لیے وہ ہار در دست　　آوے گویا حور نازنیں مست
سندر کی میں چال کیا بتاؤں　　کیا ہنس و کبک کوں لجاؤں
ہر طرف نگاہ کو چلاوے　　تاروں میں گویا کہ چاند آوے

شادی کے بعد فیضی کے ہاں نل دمن کی شب زفاف کا طویل بیان ہے۔ احمد سراوی نے حدیثِ لب و رخسار کے اس پہلو کی طرف چشمِ سخن کا اشارہ ہی کافی سمجھا ہے اور اس کوچے میں زیادہ دیر ٹھہرنا گوارا نہیں کیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میر اثر اور میر حسن کے بعد یہ کافر روایت اردو شاعروں کے ایسی منھ لگی کہ بہت دنوں تک اس کا لپکا نہ گیا۔

احمد سراوی نے حسن و جمال کی وجدانی کیفیتیں بڑی کامیابی سے اُبھاری ہیں۔ درد و داغ و جستجو و آرزو کے بیان میں بھی جذبات کو پرزور اور موثر طریقے سے پیش کیا ہے۔ جلاوطنی کے مصائب، سفر کی صعوبتیں اور قسمت کی نیرنگیوں کے ذکر میں زبان کے لوچ اور آہنگ کا پورا خیال رکھا ہے۔ قصے میں مافوق الفطرت عناصر کی بھرمار ہے۔ ان میں سے فیضی نے چند واقعات حذف

---

۴۴ پری چہرہ دمن پردے سے باہر آئی گویا ساری محفل پر بجلی کوند گئی

کردیے تھے۔ احمد سراوی نے بھی بعض ذیلی حادثات چھوڑ دیے ہیں اور اپنی مثنوی میں صرف اُنھیں غیر عقلی واقعات کو لیا ہے، جو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً ان کے ہاں پوری مثنوی میں دمن کی اژدہے سے بات چیت اور حاسد دیوتاؤں کا نل کی شکل اختیار کرنا دو خیالی واقعات ہیں۔ احمد سراوی نے اختصار پر بالخصوص نظر رکھی ہے۔ یہ مثنوی کل ۹۰ صفحات میں بیان ہوئی ہے اور ہر صفحے میں ۱۸ سطریں ہیں۔ غیر ضروری واقعات سے بچنے اور طوالت سے دور رہنے کی بدولت قصّے کے تسلسل میں فرق نہیں آتا اور مثنوی میں جاذبیت قائم رہتی ہے۔ شاعر کہیں کہیں اوصافِ حمیدہ یا زندگی کے نشیب و فراز پر چبھتے ہوئے انداز میں اشارہ کر جاتا ہے۔ مثلاً نل جلاوطنی کے زمانے میں راجا رِتوپَرن کے ہاں ملازم ہے، تو وہ سراغ رساں برہمن سے باتیں کرتے ہوئے دوستی اور وفاشعاری کے بارے میں اپنے دل کا راز یوں دے جاتا ہے:

اوتم ہے عزیز ذات تیری	مصری کی ڈلی ہے بات تیری
جس یار میں کچھ وفا نہ ہووے	وہ پھول ہے پاس ناگ سووے
جو یار پہ گر پڑیں پہاڑاں	کب سوئیں اوداس یاریاراں
ہاں یار کو یار کا گلا کیا	الفت میں جدائی اور ملا کیا
جو یار کو ایک یار جانے	اپنے وہ پرائے کب بکھانے

نل دمن کی دوبارہ ملاقات اور سلطنتِ اجین حاصل کرنے کے بعد احمد سراوی بھی فیضی کی طرح نل کو جاہ و منصب سے بیزار ہوتے ہوئے دکھاتا ہے۔ اس کے بعد کے چند اوراق نسخے میں نہیں۔ موجودہ حالت میں مثنوی کا خاتمہ خزاں کے بیان پر ہوتا ہے۔ خزاں کی یہ کیفیت بہارِ زندگی کی بے ثباتی اور ناپائیداری کی علامت ہے:

اب بادِ خزاں چلی چھوں اُور	پت جھڑ کا بن میں پڑ گیا شور

سب باغ و چمن اجاڑ کیناں	بلبل کا مکاں کنوؤں کو دیناں
سبزہ کی شکل نظر نہ آوے	ہر باغ کو دیکھ کر ڈر آوے
نل ہو کے اوداس اپنے من میں	آ بیٹھا اوداس ہو چمن میں
را بیل نہ موتیا نہ لالا	سب .... باغ ڈالا (۴۵)

مثنوی نل دمن نکہت

میر نیاز علی نکہت کی مثنوی کا نسخۂ رامپور ناقص الآخر ہے۔ اس میں سالِ تصنیف کہیں درج نہیں۔ شروع میں چند اشعار نواب احمد علی خاں والیِ رامپور کی مدح میں ہیں۔ نواب موصوف کا سنہ وفات ۱۲۵۶ھ ہے۔ اور نکہت کاانتقال اس کے گیارہویں برس بعد ۱۲۶۷ھ میں ہوا۔ غرض یہ مثنوی ۱۲۵۶ھ سے پہلے لکھی گئی ہو گی۔ اس کی کوئی مطبوعہ روایت ہماری نظر سے نہیں گزری۔

نکہت، شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔

اس مثنوی کے پہلے ۱۱۴ اشعار حمد و نعت میں ہیں۔ اس کے بعد تعریفِ عشق ہے اور پھر قصہ یوں شروع ہوتا ہے:

تھا کشورِ ہند میں کوئی شاہ	مشہور تھا ماہی سے وہ تا ماہ
والی تھا وہاں کا وہ نکوبخت	تھا اوس کا اوجین پایۂ تخت
رستم سے دلیر فن المثل تھا	مشہور جہاں میں نام نل تھا

نکہت نے قصے کو پوری تفصیل سے نظم کیا ہے۔ زبان زیادہ صاف نہیں لیکن قصے کی دلچسپی میں مزاحم نہیں ہوتی۔ جنگل میں نل، دمینتی کو چھوڑتے ہوئے سوچتا ہے:

جب لالہ کنار اوس کو دیکھوں	کیونکر سرِ خار اوس کو دیکھوں
لیکن یہ صلاح ہے نہفتہ	جوں بخت اسے چھوڑ جاؤں خفتہ

۴۵ اورینٹل کالج میگزین، حوالہ ماسبق

پاوے گی نہ مجھ سے خستہ تن کو　　اپنی چلی جائے گی وطن کو

کی نل نے دو نیم اوس کی چادر　　لی آدھی اور آدھی چھوڑدی تن پر
اوس نیم سے کرکے پردۂ تن　　لی راہ فرار جنگل و بن

نکہت نے راحت کی طرح قصّے کو ابواب میں تقسیم نہیں کیا۔ تمام مطالب مربوط بیان کردیے ہیں۔ مثنوی میں تقریباً نصف قصّے کے بعد کے اوراق نہیں ہیں۔ جنگل میں سانپ کے کاٹنے سے نل کی شکل و صورت بونے کی سی ہو جاتی ہے اور وہ ملازمت کے لیے راجا رِتوپَرن کے پاس پہنچتا ہے۔ آخری شعر یہ ہے:

بس نل کو بھی لے گئے وہاں پر　　سلطاں کی تھی بارگاہ جہاں پر[۴۶]

مثنوی نل دمن راحت

بھگونت رائے راحت، کاکوری کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد منشی دین دیال رئیس شہر تھے۔ راحت کو آغا حسن امانت لکھنوی سے تلمذ تھا[۴۷] اور فن سخن میں اچھی مہارت حاصل کرلی تھی۔

دیبی پرشاد بشاش مؤلف تذکرہ آثار الشعرائے ہنود کا بیان ہے کہ بھگونت رائے راحت کاکوروی آغا حسن امانت لکھنوی کے شاگرد تھے۔[۴۸] لیکن قاضی عبدالودود صاحب اسے تسلیم نہیں کرتے۔ ان کی رائے میں: ”اس راحت کا شاگرد امانت ہونا خلاف قیاس ہے“۔[۴۹] حالانکہ دیوان امانت میں ایک غزل ایسی ملتی ہے جس میں امانت کے پچیس شاگردوں کے تخلص آگئے ہیں۔ ایک

۴۶　مثنوی نکہت قلمی، حوالہ ماسبق
۴۷　تذکرہ آثار الشعرائے ہنود، بشاش، ص ۶۳
۴۸　آثار الشعرائے ہنود، ص ۶۳
۴۹　مکتوب بنام مولف

شعر میں راحت کا تخلص بھی موجود ہے:

غم دوست ہے دل رنج سے راحت ہے جہاں میں
فرحت کا سر انجام ہے آزار امانت[50]

مثنوی نل دمن کے علاوہ راحت نے محمد اکرم غنیمت کنجاہی کی مثنوی کا ترجمہ "نگارستانِ راحت" کے نام سے کیا تھا (۱۸۹۹ء)[51] کنجاہی کی مثنوی کا نام "نیرنگِ عشق" ہے۔[52] مثنوی "زہرہ و بہرام" اور مثنوی "سوزِ عاشقانہ" بھی ان کی تصنیف ہیں۔ خمخانۂ جاوید سے روایت ہے کہ راحت، واجد علی شاہ کے زمانے تک حیات تھے۔ غدر کے بعد ان کا انتقال ہوا۔[53] سال وفات راحت بقول خواجہ عشرت لکھنوی ۱۸۸۴ء ہے۔[54] راحت نے مثنوی مدہ مالتی اور مثنوی بوستان راحت بھی لکھیں۔[55] مثنوی بوستان راحت ۱۸۸۰ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوئی تھی۔[56]

مثنوی نل دمن کا ذکر اشپرانگر نے فہرست کتب خانہ شاہانِ اودھ میں کیا ہے اور اس کا نام "داستانِ راحت افزا" بتایا ہے۔[57] حالانکہ لفظِ "داستان" نام کا حصہ نہیں۔ اشپرانگر نے سنہ تالیف ۱۲۲۹ھ لکھا ہے اور یہ بھی صحیح نہیں۔ مثنوی نل دمن کا سالِ تصنیف ۱۲۴۴ھ ہے جیسا کہ مثنوی میں مندرج تاریخ سے ثابت ہے:

---

۵۰ دیوان امانت، ص ۳۴

۵۱ بلوم ہارٹ، برٹش ضمیمہ: ص ۳۰۱

۵۲ اشپرانگر، ص ۴۱۰، نمبر ۲۳۱

۵۳ خمخانۂ جاوید، جلد ۳، ص ۳۱۰

۵۴ ہندو شعرا، ص ۶۱

۵۵ ایضاً

۵۶ مکتوب ڈاکٹر مختار الدین آرزو بنام راقم الحروف

۵۷ اشپرانگر، ص ۶۴۳

ہوئی جب مثنوی تیار یکسر　　بندھا تاریخ کا دل میں تصور
مرے ہیں ایک مشفق کالی پرشاد　　ہوئے اس مثنوی کو سن کے جو شاد
عنایت کر اسی دم غور فرما　　کہا "یہ داستاں ہے راحت افزا"

۱۲۴۴ھ

ان کی مثنوی نل دمن اپنے زمانے میں خاصی مقبول رہی ہے۔ مطبع نول کشور اور دوسرے مطابع سے اب تک اس کے بیسیوں ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ مؤلف "مثنویات" نے لکھا ہے کہ نل دمن مطبوعہ مطبع مجیدی اور فخر المطابع لکھنؤ کے نسخوں میں اسے تاج بہادر ساکن نوبستہ کی تصنیف بتایا گیا ہے[۵۸] لیکن یہ صحیح نہیں۔ اس سلسلے میں مولّف مثنویات سے تسامح ہوا ہے۔ مذکورہ بالا مطابع میں چھپی ہوئی نل دمن کا ترقیمہ یہ ہے: "قطعہ تاریخِ طبع نل دمن اردو تصنیف تاج بہادر متخلص بہ تاج ساکن محلّہ نوبستہ، شہر لکھنؤ":

طبع شد چوں ایں کتابِ دل پسند　　گشت ہر کس طالب وجویاے او
تاج تاریخش بجستہ گفت دل　　"ہست تحفہ نل دمن اردو بگو"

۱۲۴۳ھ

یہاں "تصنیف" نل دمن کے لیے نہیں بلکہ قطعہ تاریخ کے لیے آیا ہے۔ اس قطعہ سے اوپر مؤلف نے جو تاریخ نظم کی ہے، اس میں لفظ راحت موجود ہے، جس سے غلط فہمی کا امکان نہیں۔ عبدالغفور نساخ نے بھی تذکرۂ سخنِ شعرا میں تصریح کردی ہے کہ یہ مثنوی بھگونت رائے راحت کی نوشتہ ہے۔[۵۹]

راحت کی مثنوی کا قلمی نسخہ یا فتاح اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتا ہے۔ حمد کے بعد چند شعر "دربیان توصیف ممالکِ ہندستان و مدح راجہ نل اورنگ نشین ملک اوجین" میں ہیں، ملاحظہ ہوں:

۵۸　مثنویات، ص ۱۴۱
۵۹　سخن شعرا، ص ۱۷۵

عجب نزہت فزا ہندوستان ہے | کہ ہر شہر اوس کا رنگیں بوستان ہے
غضب ہیں بت وہاں کے شوخ بیباک | کہ ہیں زاہد کا دل لینے میں چالاک
دیا ہے حسن ایسا حق نے نمکیں | کف پا کو نہ پہنچے لعبتِ چیں
اگر اس جاگزر ہووے پری کا | کرے اقرار اپنی بے پری کا
عجب وہ ملک ہے روے زمیں پر | نہیں کوئی ولایت اس کے ہم سر
نمونہ ہے مگر خلدِ بریں کا | کہ ہے رتبہ بلند اس سرزمیں کا
زبس ہے حُسن میں وہ ملک نامی | بجا ہے گر کرے کنعاں غلامی

مثنوی ایک ہزار چھے سو پچھتر (۱۶۷۵) شعروں پر مشتمل ہے جو خاتمے کے اس شعر سے ظاہر ہے:

گنی میں نے جو بیتیں کہہ کے یکسر
ہوئیں گنتی میں سولہ سو پچھتر

راحت کی مثنوی نکہت کی مثنوی سے کہیں زیادہ مقبول ہوئی اور کئی بار مختلف مطابع سے شائع ہوئی۔ اس کے جتنے مطبوعہ نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں، سب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتے ہیں۔ راحت نے قصے کو ۳۴ ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر فصل کا عنوان فارسی میں قائم کیا ہے۔ سببِ تالیفِ کتاب کے ضمن میں راحت کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

جو دیکھا آج کل ہندی[۶۰] کا چرچا | ہوا دل ایک دن مشتاق اس کا
کہ عشقِ نل جو ہے عالم میں مشہور | کرے ہندی زباں میں اس کو مذکور
اگرچہ فارسی میں سب بیاں ہے | مگر طول اس کی ہر اک داستاں ہے
اشارہ دل سے یوں میں نے جو پایا | سخن کا جلد تر دریا بہایا

قصے کے لحاظ سے راحت اور نکہت کی مثنویاں ایک دوسرے سے بہت

۶۰ یہاں ''ہندی'' سے مراد اردو زبان ہے

مشابہ ہیں۔ دونوں نے سوائے ایک واقعے کے اصل قصے میں کوئی رنگ آمیزی نہیں کی۔ نل دمینتی کی رسم و راہ بڑھانے میں ہنس کا جو حصّہ ہے، اسے دونوں نے قائم رکھا ہے۔ اصل قصے میں ہنس اپنی جان بچانے کے لیے نل کو دمینتی کے حسن و جمال سے آگاہ کرتا ہے۔ یہی ہنس دمینتی کے پاس جا کر نل کے اوصاف بیان کرتا ہے۔ لیکن نکہت اور راحت کے ہاں نل کی ''شورشِ جنوں'' کا آغاز ایک خواب سے ہوتا ہے۔

نکہت:

لیکن مرے دل میں وہ ستم گر ۔۔۔ غمزہ کا گیا ہے مار خنجر
کاکل کے ہوں بستہ دام سے میں ۔۔۔ آگاہ نہیں ہوں نام سے میں
تھے جتنے کہ نل کے محرمِ راز ۔۔۔ سب کرنے لگے درِ سخن باز
اک ان میں سے ہم جلیس بولا ۔۔۔ اس طرح درِ سخن کو کھولا
ہے اک وہ پری دکن میں یعنی ۔۔۔ نازاں ہے بنا کے جس کو صانع
باریک کمر ہے نازک اندام ۔۔۔ اس رشکِ چمن کا ہے دمن نام
مائل نہ ہو سومنات پر وہ ۔۔۔ ٹھوکر بھی نہ مارے لات پر وہ
جُوڑا ہے پس گلوگرہ بند ۔۔۔ صندل میں ہے آبنوسی پیوند
غنچہ ہے ابھی گل جوانی ۔۔۔ پھولا نہیں باغ زندگانی
پاس آنے نہیں دیا حیا نے ۔۔۔ دامن کو نہیں چھوا صبا نے

راحت:

قضا نے آخرش ڈالا بلا میں ۔۔۔ پھنسایا یعنی اک زلفِ دوتا میں
کہ اک شب عیش میں لیٹا تھا ناگاہ ۔۔۔ ہوا پیدا اسے غم خواہ ناخواہ
جب آدھی رات کا پھر وقت آیا ۔۔۔ یکایک خواب نے آکر ستایا
عجب صورت کی اس دم نیند آئی ۔۔۔ کہ بیداری میں ہرگز کل نہ پائی

ملال ایسا ہوا خاطر میں پیدا | کہ اس دم سے ہوا الفت کا شیدا
نجانا کس پری کا ہے یہ افسوں | ہوئی جس سے مری حالت دگرگوں
نمک چھڑکا ہے کس نے زخمِ دل پر | جو بے تابی نے آجی میں کیا گھر
اٹھے جب گرم تر شعلے جگر سے | خیال آیا محبت کے اثر سے
کہا یہ سب حرارت عشق کی ہے | اسی نے بے قراری مجھ کو دی ہے
اسی نے دل کو سودائی بنایا | اسی نے شور خاطر میں اُٹھایا
ہوئی تھی بس کہ پیدا بے قراری | انھیں باتوں میں کاٹی رات ساری

ادھر دمینتی بھی خواب ہی میں فتنۂ عشق کا شکار ہوتی ہے اور اس کے بعد ''نامہ و پیام بدست مرغ'' کا آغاز ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نکہت اور راحت دونوں نل دمینتی کے اس روایتی قصّے سے متاثر تھے، جس میں ایرانی داستانوں کے انداز پر خواب کا افسانہ کر دیا گیا تھا۔ عشق کے آغاز کے بعد نل اور دمن میں جو خط و کتابت ہوتی ہے، راحت نے اس میں عشقیہ جذبات کی جی کھول کر داد دی ہے اور انھیں پورے شاعرانہ لوازمات سے ادا کیا ہے۔

شادی کے بعد دونوں ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔ لیکن آخر وہ دن بھی آ پہنچتا ہے جس کے لیے حاسدوں کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ اس مقام کے بعد جلاوطنی اور بے سر و سامانی کی کیفیت راحت نے بڑے دردناک اور پُرسوز پیرایے میں بیان کی ہے۔ زبان صاف، سادہ اور سلیس ہے اور درد و فراق کی کیفیت نے اس میں ہلکی سی تیزی پیدا کر دی ہے۔ ملاحظہ ہو، نل کے چھوڑ جانے پر دمینتی کی حالتِ زار:

نہ پایا یار کو جس وقت باہم | رہی آئینہ ساں حیرت میں ہمدم
کہا جی میں کہ یہ کیا ماجرا ہے | کہ اس گل کا نہیں بالکل پتا ہے
کہاں جاؤں کدھر ڈھونڈوں نشاں اب | خدا جانے گیا ہے وہ کہاں اب
پھری ہر چند صحرا میں بہت سا | نہ دیکھا اپنے مجنوں کو کسی جا

ہوئی جب ڈھونڈ کے حیراں نہایت　　لگی کرنے تصور میں شکایت
کہ کیا وحشت ترے دل میں سمائی　　جو کی اک بارگی مجھ سے جدائی
گیا جس دم نہ کیوں مجکو خبر کی　　فقط آرام پُر اپنے نظر کی
تجھے واجب نہ تھا جانا دغا سے　　خبر کرنا تھا کچھ راہِ وفا سے
کہاں کی دشمنی مجھ سے نکالی　　جو خاطر مہر سے بالکل اٹھا دی
گیا ہے تو صنم سے ہو کے آزاد　　کیا سب عشق کا ناموس برباد

مدتوں کے بعد ودربھ میں دونوں کا سامنا ہوتا ہے۔ اژدہے کے ڈسنے سے نل کی رنگت سیاہ پڑچکی ہے اور وہ پہچانا نہیں جاتا۔ دمن قرائن سے نل کو جان چکی ہے، لیکن پھر بھی تصدیق کے لیے اس سے سوال و جواب کرتی ہے۔ نظروں ہی نظروں میں دل کا راز کھل جاتا ہے اور برسوں کے بچھڑے ہوئے آپس میں ملتے ہیں:

دمن یک بارگی بو اس کی لے کر　　خوشی سے ہوگئی بس تازہ و تر
کہا کیوں تن پہ چھائی ہے سیاہی　　کہا یہ ہے تپِ غم کی گواہی
کہا ہے مثلِ غنچہ کس لیے تنگ　　کہا ہے دل کی حیرانی سے یہ رنگ
کہا کس کارواں کے ساتھ آیا　　کہا ریگِ رواں کے ساتھ آیا
کہا کچھ یاد ہے سودا کا دیواں　　کہا ہے بیت ابرو کا مجھے دھیاں
کہا ہمدم ترا کوئی کہیں ہے　　کہا اب غم سوا کوئی نہیں ہے
ہوئے جب خوب باتوں میں اشارے　　دلوں کے کھل گئے مضمون سارے
محبت میں ہوئے باطن میں یکساں　　نئے سر سے کیا پھر عہد و پیماں
خوشا وقتے و خرم روزگارے　　کہ یارے برخور دار ز وصل یارے[٦١]

راحت نے سارا قصہ چار جزو میں بیان کر دیا ہے۔ تعدادِ اشعار ۱۶۷۵ ہے۔ انھوں نے کہیں بھی پیچ دے کر کہانی کو بلا ضرورت پھیلانے کی کوشش

٦١　مثنوی نل دمینتی قلمی، حوالہ ماسبق

نہیں کی۔ الفاظ کا انتخاب مناسب ہے۔ مرقع نگاری صاف ہے اور جذبات کے بیان میں اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ دل کی کیفیتوں کو پر خلوص پیرایے میں سادگی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ راحت کے تخیل میں وہ زور اور زبان میں وہ قدرت نہیں کہ شعر سحر و اعجاز معلوم ہونے لگے۔ لیکن سادگی، صفائی اور حقیقت نگاری نے مثنوی میں اثر پیدا کر دیا ہے اور کہانی کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مثنوی اپنے زمانے میں خاصی پسند کی گئی اور بیسویں صدی کے اوائل تک بار بار چھاپی جاتی رہی۔

مثنوی نل دمن کالی پرشاد

ہمارا خیال ہے کہ مثنوی نل دمن از کالی پرشاد کوئی اصلیت نہیں رکھتی۔ بلوم ہارٹ سے تسامح ہوا ہے اور وہ بھگونت رائے، راحت کاکوروی ہی کی مثنوی کو غلطی سے کالی پرشاد سے منسوب کر گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نل دمن راحت بیسیوں بار مختلف مطابع سے شائع ہوئی اور اکثر نسخوں میں مصنف کے نام کی تصریح نہیں کی گئی۔ چنانچہ نل دمن مطبوعہ مطبع مجیدی اور فخر المطابع لکھنؤ کے نسخوں میں اسے تاج بہادر ساکن نوبستہ کی تصنیف بتایا گیا حالانکہ تاج بہادر نے فقط قطعۂ تاریخ کہا تھا۔ اسی طرح "کالی پرشاد" کا نام بھی خود مصنف کے قطعۂ تاریخ میں آیا ہے۔ کالی پرشاد مثنوی نل دمن کے مصنف راحت کاکوروی کے دوست تھے اور انھوں نے مثنوی کو سُن کر "یہ داستاں ہے راحت افزا" کے الفاظ سے اس کی تاریخ نکالی۔ بلوم ہارٹ اس قطعہ تاریخ کو پڑھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ کالی پرشاد ہی مثنوی نل دمن کے مصنف ہیں۔ یہ قطعۂ تاریخ یوں ہے:

ہوئی جب مثنوی تیار یکسر ۔ بندھا تاریخ کا دل میں تصور
مرے ہیں ایک مشفق کالی پرشاد ۔ ہوئے اس مثنوی کو سن کے جو شاد

عنایت کر اسی دم غور فرما کہا "یہ داستاں ہے راحت افزا"

۱۲۸۴ھ

بلوم ہارٹ نے فہرست کتب برٹش میوزیم میں اس مثنوی کی تین اشاعتوں کا ذکر کیا ہے۔[۶۲]

۱۔ لکھنؤ ۱۸۶۹ء صفحات ۳۶ ((۳) 14106 B.50)

۲۔ کانپور ۱۸۷۲ء صفحات ۳۶ ((۹) 14119 E.17)

۳۔ کانپور ۱۸۷۹ء صفحات ۳۶ ((۳) 14112 C.19)

ہمیں اس مثنوی کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ کتب خانہ انڈیا آفس، لندن میں اس مثنوی کے مندرجہ ذیل سات ایڈیشن محفوظ ہیں: دہلی ۱۸۴۵ء، لکھنؤ ۱۸۶۸ء، کانپور ۱۸۶۹ء، لکھنؤ ۱۸۶۹ء، کانپور ۱۸۷۱ء، میرٹھ ۱۸۷۵ء، لکھنؤ ۱۸۷۶ء۔[۶۳] یہاں بھی بلوم ہارٹ نے لکھنؤ ۱۸۶۸ء والے ایڈیشن کو کالی پرشاد سے منسوب کیا ہے، جو غلط ہے۔

دتاسی کا بیان ہے کہ نل دمن کے مشہور قصے کو احمد علی نے اور میر علی بنگالی نے بھی نظم کیا تھا۔[۶۴] لیکن ہم اس کی تصدیق نہیں کر سکے۔ ہندستان کے جن کتب خانوں سے ہم نے استفادہ کیا ہے، وہاں ان کا کوئی نسخہ نہیں۔ یورپی کتب خانوں کی فہرستوں میں بھی احمد علی اور میر علی بنگالی کی نل دمن کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

مثنویات شکنتلا

شکنتلا ہندستان کا لافانی قصّہ ہے۔ اس کی شہرت و مقبولیت میں کچھ حصّہ کالی داس کے سحر و اعجاز کا بھی ہے، جس نے اسے زماں و مکاں کی قیود سے

---

۶۲ بلوم ہارٹ، کتب برٹش، فولیو ۱۵۳

۶۳ انڈیا مطبوعات، ص ۱۵۹

۶۴ خطبات، ص ۲۳

ہمیشہ کے لیے بلند کردیا۔ اصل قصہ مہابھارت سے ماخوذ ہے اور اس میں ہندستان کے اولین راجا 'بھرت' کی پیدائش کی روایت بیان کی گئی ہے۔ اسی 'بھرت' ہی کی رعایت سے ہندستان کا نام "بھارت ورش" مشہور ہوا۔

قصہ

دُشینت، ایک راجا، ایک دن شکار کھیلتے کھیلتے جنگلوں میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ کنو رشی کی جھونپڑی کے قریب اس کی نگاہیں شکنتلا سے دو چار ہوئیں اور پہلی ہی نظر میں وہ عشق کا شکار ہوگیا۔

شکنتلا کنو رشی کی جھونپڑی میں رہتی تھی، لیکن وہ وشوامتر کی بیٹی تھی اور اندرلوک کی حسین ترین اپسرا مینکا کے بطن سے تھی۔ اس کی پیدائش کے بارے میں روایت ہے کہ ایک دفعہ رشی وشوامتر نے شدید ریاضت شروع کی، حتیٰ کہ راجا اندر کو اپنے سنگھاسن کے چھن جانے کا خطرہ لاحق ہوگیا۔ وشوامتر کے زہد و اتقا اور ریاضتِ و عبادت کو ناکام بنانے کے لیے اندرلوک کی حسین و جمیل حور منیکا کو متعین کیا گیا۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور وشوامتر اور منیکا کے وصال کا نتیجہ شکنتلا تھی، جسے پیدائش کے بعد منیکا نے جنگلوں میں چھوڑ دیا، یہاں پرندے اس کی پرورش کرتے رہے۔ حتیٰ کہ کنو رشی اسے اپنی جھونپڑی میں اٹھا لے گئے اور پال پوس کر بڑا کیا۔

شکنتلا کے آسمانی حسن کو دیکھ کر دُشینت کا صبر و قرار جاتا رہا۔ اس نے شکنتلا سے گندھرو بیاہ کی درخواست کی (جو طرفین کی رضامندی پر بغیر برہمنی رسومات اور لوازمات کے فوراً رچایا جاسکتا ہے) شکنتلا نے اس شرط پر یہ درخواست قبول کرلی کہ شکنتلا ہی کی اولاد تخت و تاج کی وارث ہوگی۔ راجا واپس جاتے ہوئے وعدہ کرگیا کہ وہ بہت جلد شکنتلا کو محلات میں عزت و احترام سے طلب کرے گا۔

شکنتلا راجا کی یاد میں دن رات کھوئی رہنے لگی۔ ایک دن

درواسا رشی کنو سے ملنے آئے، لیکن شکنتلا کو ان کی پزیرائی کا مطلق خیال نہ رہا۔ اس سوئے ادب پر درواسا نے بددعا دی کہ اے لڑکی! تیرا عاشق تجھے بھول جائے۔ بعد میں کہنے سننے پر انھوں نے یہ دلاسا دیا کہ دشینت انگوٹھی دکھانے پر شکنتلا کو پہچان لے گا۔

شکنتلا چونکہ ماں بننے والی تھی، مہینوں دشینت کی راہ دیکھنے کے بعد آخر وہ اس سے ملنے کے لیے خود ہی روانہ ہو گئی۔ راہ میں ایک مقدس جگہ اس نے غسل کیا۔ لیکن شومیِ قسمت سے انگوٹھی پانی میں گر کے کھو گئی۔ شکنتلا دربار میں حاضر ہوئی۔ دشینت پہچاننے کا بھی روادار نہ ہوا۔ یہاں سے اس کی ماں منیکا اسے اپنے آشرم جنگلوں میں لے گئی جہاں 'بھرت' پیدا ہوا۔

حسنِ اتفاق سے وہ انگوٹھی ایک ماہی گیر کو ایک مچھلی کے پیٹ سے ملی، وہ اسے راجا کے پاس لے گیا اور انگوٹھی دیکھتے ہی دشینت کو شکنتلا کی یاد آئی۔ غرض شکنتلا اور اس کا بیٹا بھرت محلات میں بلائے گئے۔ یہی بھرت، دشینت کے بعد اس کا جانشیں ہوا جس کی اولاد صدیوں تک ہندستان کی حکمراں رہی۔ مہابھارت میں حکمرانوں کی اسی نسل کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔[۶۵]

شکنتلا کے اس قصے کو کالی داس نے مہابھارت سے ماخوذ کر کے سنسکرت میں ڈرامے کے طور پر لکھا تھا۔ ہندستان اور یورپ میں اس کی بڑی شہرت ہوئی اور کالی داس کے متعدد ترجمے وغیرہ شائع ہوئے جو عام طور پر مل جاتے ہیں۔ ان میں سے گلکرائسٹ اور ولیم کے ترجمے بہت مقبول ہوئے۔

کالی داس کے شکنتلا ناٹک کا سب سے پہلا انگریزی ترجمہ ۱۷۸۹ء میں سر ولیم جونس نے کیا۔[۶۶] دو سال بعد ۱۷۹۱ء میں سے اسے پروفیسر جی فورسٹر نے جرمن زبان میں منتقل کیا۔[۶۷] A.L.Chezy کا فرانسیسی ترجمہ ۱۸۳۱ء میں

---

۶۵ مہابھارت، حوالہ ماسبق؛ ۱، ۱۷

۶۶ ہسٹری آف دی سنسکرت لٹریچر، اے اے میکڈانلڈ، ص ۳

۶۷ ایضاً ۳۱۷

شائع ہوا۔[٦٨] اس کا سنسکرت متن Ott Boehtlingk نے جرمنی میں مرتب کیا جو ۱۸۴۲ء میں منظر عام پر آیا۔[٦٩] شکنتلا کا صحیح ترین متن برلن یونیورسٹی کے پروفیسر Richard Pischel نے ہارورڈ اورینٹل سیریز کے لیے ۱۸۷۷ء میں مرتب کیا۔[٧٠] انیسویں صدی میں ولیم مونیر کا ترجمہ یورپ میں بہت مقبول ہوا اور اس کا چھٹا ایڈیشن ۱۸۹۰ء میں لندن سے شائع ہوا۔[٧١] Edgren کا انگریزی ترجمہ نیویارک سے ۱۸۹۴ء میں چھپا۔[٧٢] شکنتلا کا سب سے اچھا انگریزی ترجمہ مشہور امریکن نقاد ڈاکٹر رائڈر کا سمجھا جاتا ہے۔[٧٣] شکنتلا کے تراجم کے سلسلے میں Burkard[٧٤] اور Cappeller[٧٥]، Shenzler[٧٦] اور Wilson[٧٧] کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ناروے کے ایک ماہر ہندیات Dr. Sten Konow نے یورپی زبانوں میں شکنتلا کے تراجم کی تعداد گنوائی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ فقط جرمنی زبان میں شکنتلا کا تیس بار ترجمہ ہو چکا ہے۔ اسی طرح فرانسیسی، ڈچ، لاطینی، پولش، سوئیڈش، ہسپانوی اور ہنگرین اسکالروں نے بھی اپنی اپنی زبانوں کو شکنتلا کے تراجم سے مالا مال کیا ہے۔ روسی زبان میں اس کے چند حصوں کا ترجمہ مشہور تاریخ داں N. Karamzin نے ۱۷۹۲ء میں کیا تھا لیکن اس کا مکمل ترجمہ پروفیسر Alexei Putyata کا مرہونِ منت ہے، جو ۱۸۷۹ء میں ختم ہوا۔[٧٨]

---

٦٨ مقدمہ شکونتلا، فارسی، علی اصغر حکمت

٦٩ شکنتلا، برلن ۱۸۴۲ء

٧٠ شکنتلا، ہارورڈ اورینٹل سیریز نمبر ۱٦

٧١ انسائیکلوپیڈیا امریکانا

٧٢ ایضاً

٧٣ انڈین، پی۔ای۔این جنوری ۱۹٦۰ء، ص ۸

٧٤ ایضاً

٧٥ ایضاً

٧٦ مقدمہ شکونتلا، فارسی علی اصغر حکمت

٧٧ ایضاً

٧٨ انڈین پی۔ای۔این، جنوری ۱۹٦۰ء، ص ۹

مشہور جرمن شاعر گوئٹے، اس شاہکار کے عاشقوں میں سے تھا۔ اس نے پروفیسر فورسٹر کے جرمن ترجمے سے اس کا مطالعہ کیا ہے، جسے وہ اپنی ''زندگی کا عظیم ترین تجربہ'' کہا کرتا تھا۔ شکنتلا کی تعریف میں اس نے مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:

Would'st thou the young year's blossoms and
the fruits of its decline,
And all by which the soul is charmed,
enraptured, feasted fed,
Would'st thou the Earth and Heaven itself in
one sole name combine?
I name thee, O Shakuntla ! and all at
once said."(۷۹)

شکنتلا کے قصے کو نیپالی میں ہری ہر آچاریہ دکشت نے مہابھارت کے آدی پروسے ترجمہ کیا۔ یہ کتاب بمبئی سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔(۸۰)

برج بھاشا میں کالی داس کی شکنتلا کو سب سے پہلے نواج کبیشر نے ترجمہ کیا۔ اس کے سنہ تصنیف کے بارے میں اختلاف ہے۔ گریرسن ''ماڈرن ورنیکلر لٹریچر آف ہندستان'' میں لکھتا ہے کہ نواج دو آب کے علاقے کا برہمن تھا۔ اس نے ۱۶۵۰ء میں راجا چھتر سال بندیلے کے دربار میں اعظم شاہ کے کہنے پر شکنتلا کا ترجمہ کیا۔ اس کے برعکس کاظم علی جواں، شکنتلا ناٹک کے ہندستانی ترجمے (۱۸۰۱ء) کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ نواج کبیشر نے برج بھاشا میں شکنتلا کا ترجمہ فرخ سیر (۱۷۱۳-۱۹ء) کے عہد میں ایک امیر مولے خاں بن فدا خاں کی فرمائش پر کیا۔(۸۱)

---

۷۹ ڈاکٹر مہاجنی پیش لفظ (انگریزی) ''شکونتلا'' فارسی، علی اصغر حکمت

۸۰ ہندی، ص ۱۷۵

۸۱ بلوم ہارٹ، صفحہ ۵۳، نمبر ۹۱

فارسی نسخے

۱۔ شکونتلا یا خاتم مفقود (فارسی تمثیل) ڈاکٹر ہادی حسن، دہلی ۱۹۵۶ء تعداد صفحات ۴۴۔[۸۲]

۲۔ شکونتلا یا انگشتر گمشدہ۔ ترجمہ منثور و منظوم از علی اصغر حکمت، دہلی[۸۳]

اردو نثری نسخے

۱۔ شکنتلا از کاظم علی جواں اور للّو لال۔ سنہ تصنیف ۱۸۰۱ء سنہ اشاعت ۱۸۰۲ء (نثری ترجمہ از نواج) برائے فورٹ ولیم کالج کلکتہ۔ (بلوم ہارٹ، برٹش کتب، فولیو ۱۶۴ نیز ضمیمہ، فولیو ۲۰۶، قلمی نمبر ۹۱)

شکنتلا (اردو) از کاظم علی جواں۔ اسے J.B. Gilchrist نے رومن رسم الخط میں مع ذیلی حکایات کے شائع کیا۔ کلکتہ ۱۸۲۶ء کل صفحات ۱۶+ ۱۰۴[۸۴]
تیسرا ایڈیشن زیر اہتمام بہمن جی دوساجی، بمبئی ۱۸۴۸ء[۸۵]
چوتھا ایڈیشن لکھنؤ ۱۸۷۵ء کل صفحات ۳۱[۸۶]

۲۔ فراموش یاد از غلام احمد ابن غلام حیدر عزت (اشپرانگر ص ۵۹۸) فراموشِ یاد اُردو مثنوی ہے، جس میں راجا دشینت اور شکنتلا کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ اس کے ایک نسخے کا ذکر اشپرانگر نے کیا ہے، جو کلکتہ سے ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ تعداد صفحات: ۱۵۳، آغاز:

ہزاروں شکر ہے اس بے نشاں کا

---

۸۲ نیز ملاحظہ ہو "مجموعہ مقالات از ڈاکٹر ہادی حسن"، دہلی ۱۹۵۶ء، ص ۱ تا ۳۲

۸۳ یہ ترجمہ دہلی یونی ورسٹی سے ۱۹۵۷ میں شائع ہوا

۸۴ انڈیا مطبوعات، ص ۹۹

۸۵ اردو ڈراما، عشرت رحمانی، ص ۱۱۴

۸۶ انڈیا مطبوعات، ص ۹۹

اشپرانگر کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کٹیلاگ کی تالیف کے وقت یعنی ۱۸۵۳ء میں اس مثنوی کا مصنف غلام احمد، احمد کلکتہ میں بہ قیدِ حیات تھا۔[۸۷]

۳۔ شکنتلا از اختر حسین رائے پوری (از سنسکرت) ۱۹۴۳ء (بار دوم)

۴۔ شکنتلا از بیگم قدسیہ زیدی (ڈراما) ۱۹۵۷ء

۵۔ شکنتلا (اردو نثر) از جواہر لال آگرہ ۱۸۷۳ء کل صفحات ۳۰۰[۸۸]

۶۔ شکنتلا (اردو نثر) از حافظ محمد عبداللہ، آگرہ ۱۸۸۷ء صفحات ۸۸[۸۹]
ایڈیشن دیگر، آگرہ ۱۸۹۰ء[۹۰]

۷۔ شکنتلا (اردو ناول) مجہول المصنف، ابوالعلائی اسٹیم پریس، آگرہ، کل صفحات ۷۰

۸۔ شکنتلا (اردو ڈراما) از اکسیر سیالکوٹی، لاہور ۱۹۱۵ء[۹۱]

۹۔ شکنتلا ناٹک (اردو) نوشیرواں جی مہربان جی آرام[۹۲]

۱۰۔ شکنتلا ناٹک اردو، از پنڈت نرائن پرشاد بیتاب بنارسی[۹۳]

۱۱۔ شکنتلا (اردو ڈراما) از محمد ابراہیم محشر انبالوی[۹۴]

اردو منظوم نسخے

۱۔ مثنوی رشکِ گلزار از مولوی سید محمد تقی۔ یہ کتاب نول کشور پریس سے شائع ہوئی تھی۔ اب نایاب ہے۔

---

۸۷ اشپرانگر، ص ۵۹۸، نمبر ۵۸۵

۸۸ انڈیا مطبوعات، ص ۹۹

۸۹ ایضاً

۹۰ ادارہ مطبوعات، جلد ۱، ص ۱۴۵

۹۱ ایضاً، ص ۱۴۲

۹۲ اردو ڈراما، عشرت رحمانی، ص ۲۰۴

۹۳ ایضاً، ص ۲۳۹

۹۴ ایضاً، ص ۲۵۲

۲۔ مثنوی غازۂ تعشق از عنایت سنگھ (مملوکہ جناب مسعود حسن رضوی)

"مثنوی غازۂ تعشق" المعروف بہ شکنتلا، مصنفہ کنور عنایت سنگھ عنایت رئیس لکھنؤ تعلقدار بریلی، مطبع قیصری، بریلی، سال تصنیف ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۳ء)

ابتدائی اشعار:

باری کا ہے نام لب پہ ہر بار — جس سے یہ قلم ہوا گہر بار
ہے مالکِ ملک بود و نابود — ہے جملہ جہانیوں کا معبود
تقریر زباں نے اس سے پائی — تحریر قلم کے ہاتھ آئی
حصّے میں بتوں کے حُسن آیا — رنگیں طبعوں نے عشق پایا
دریا نے صدف، صدف نے گوہر — پائی گہر نے آب یکسر

....

ہے یہ گل تازۂ تعشق — نام اس کا ہے 'غازۂ تعشق'
تاریخ بھی نام سے ہے پیدا — سال اس میں ہے عیسوی ہویدا

....

بسوامتر ایک تھے جو درویش — مرتاض، خدا شناس، حق کیش
جنگل میں وہ گوشہ گیر رہتے — دائم تکلیف و رنج سہتے
سردی سے جب ان کو پالا پڑتا — سردابے میں ہوتے جلوہ افزا
لہر آجاتی مزاج میں جب — کرتے دریا میں طاعت رب
گرمی میں جلا کے آگ جاوید — بیٹھے رہتے تھے پیش خورشید
تھے پارۂ برف ان کو اخگر — جلتا اس غم سے تھا سمندر
کچھ فکر نہ تھی یہاں وہاں کی — چھوڑیں سب نعمتیں جہاں کی
جنگل میں جو برگ و بار پاتے — رزاق کا شکر کرکے کھاتے

آخری اشعار:

خالق! ملے جس طرح یہ مہجور — سب اپنی مراد سے ہوں مسرور
سب پائیں جہاں میں نعمتیں چار — مے، چنگ، شباب، وصل دلدار
فرقت کا نہ پائے کوئی آزار — چھوٹے نہ کبھی کسی کا دلدار
کر سب کی اسی طرح حمایت — دائم ہو بشاشت عنایت

تعداد صفحات = ۱ + ۹۳ + ۸ = ۱۰۲
تعداد اشعار تخمیناً = ۱۵۰۰[۹۵]

عنایت سنگھ کی مندرجہ بالا مثنوی ۱۸۸۴ء میں ۱۰۱ صفحات پر بریلی ہی سے شائع ہوئی۔[۹۶]

۵۔ شکنتلا منظوم از جگیشور ناتھ، بیتاب بریلوی۔ انھوں نے کالی داس سے براہ راست اردو نظم میں آزاد ترجمہ کیا ہے۔[۹۷]

۶۔ ساغر نظامی نے شکنتلا کے قصے کا مکمل ترجمہ ریڈیو ڈرامے کے طور پر آزاد نظم کیا ہے۔[۹۸]

۷۔ مثنوی نیرنگ سحر۔ اقبال ورما سحر ہتگامی (۱۶۔۱۹۱۰ء) زمانہ پریس، کانپور، صفحات ۸۴

۸۔ شکنتلا منظوم از محمد فاروق، وحشت بریلوی (۵۱۔۱۹۵۰ء) صفحات ۶۴۔

مثنوی نیرنگِ سحر

اقبال ورما سحر ہنگامی کی اس مثنوی کے پہلے دو باب ۱۹۱۱ء میں رسالہ ادیب، الہٰ آباد میں شائع ہوئے تھے۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۱۶ء میں یہ زمانہ پریس کانپور سے مکمل شائع ہوئی۔

---

۹۵ بشکریہ جناب مسعود حسن رضوی ادیب، لکھنؤ
۹۶ انڈیا مطبوعات، ص ۱۵۴
۹۷ قلمی نسخہ مملوکہ مصنف، بہاری پور، بریلی
۹۸ قلمی نسخہ مملوکہ مصنف، دہلی

سحر نے یہ قصہ کالی داس کی شکنتلا سے اخذ کیا ہے۔ یہ مثنوی وشوامتر کی ریاضت اور شکنتلا کی پیدائش کے بیان سے شروع ہوتی ہے۔ روایتی قصوں میں دُشینت اور شکنتلا کی پہلی ملاقات کا ذکر مختلف پیرایوں میں آیا ہے۔ اقبال ورما سحر نے بھی اس سلسلے میں رنگ آمیزی کی ہے۔ خود ان کا بیان ہے:

"یہ نظم قریب قریب بالکل میری طبع زاد ہے۔ اصلی ڈراما سنسکرت شکنتلا کالی داس کی تقلید صرف اس حد تک کی گئی ہے جہاں تک محض خاص واقعات سے تعلق ہے۔ نیز قصے کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے مجھے چند ابواب کا بطورِ خود اضافہ بھی کرنا پڑا ہے"۔

شکنتلا اپنی سہیلیوں سمیت باغ میں جلوہ گر ہے۔ ایک بھنورے کو شکنتلا کے چہرے پر کنول کا دھوکا ہوتا ہے:

اڑ کر ناگاہ ایک بھونرا چہرے پہ شکنتلا کے پہنچا
بھاگی وہ ادھر سے ہٹ گئی پھر جھجکی، ٹھٹکی سمٹ گئی پھر
ہاتھوں کو پٹک پٹک اُڑایا آنچل کو جھٹک جھٹک اُڑایا
آخر چلائی ڈر کے مجبور سکھیو دوڑو اسے کرو دُور
پھر ہائے وہ دیکھو آرہا ہے ناحق یہ مجھے ستا رہا ہے

سکھیاں مذاق میں کہتی ہیں کہ مظلوم کا فریاد رس تو راجہ دُشینت ہے وہی تری فریاد سن سکتا ہے۔ یہ سنتے ہی دشینت کو، جو قریب ہی سے یہ سب دیکھ رہا تھا، شکنتلا کے سامنے آنے کا بہانہ مل گیا:

پہنچا وہیں جو تھی جائے امید وارد ہوا سنبلہ میں خورشید
پوچھا "اے مہوشاں خوشرو! کیوں شور ہے، کون ہے جفا جو؟
"قاطع ہوا کون آشتی کا؟ دعویٰ ہوا کس کو سرکشی کا؟"

قصے کے انجام میں بھی بعد کو کئی رنگ آمیزیاں کی گئی ہیں۔ سحر کے

ہاں قصہ اصلی حالت میں نہیں ملتا۔ ان کی مثنوی گلزار نسیم کی بحر میں لکھی گئی ہے۔ زبان میں آورد کا رنگ نمایاں ہے۔ مطالب کہیں مبہم نہیں۔ لیکن اشعار میں شگفتگی اور جزالت کم ہے:

وہ محوِ نظارۂ پری رو	یعنی دُشینت شاہ خوش خو
دیکھی جو وہ شانِ حسنِ دل سوز	الفت ہوئی دل میں آتش افروز
مفتونِ شکنتلا ہوا وہ	دلدادۂ دلربا ہوا وہ
آنکھوں سے نظر نے دل اُڑایا	خوش چشم کے بر میں جا چھپا

سحر نے مثنوی کو نو ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ہر باب رباعی سے شروع ہوتا ہے۔ کہیں کہیں غزل بھی آگئی ہے۔ خاتمے کے اشعار یہ ہیں:

بارے جو ہوئی مراد حاصل	الماس رہا گہر سے واصل
کٹتے تھے ہنسی خوشی سے اوقات	دن عید تو شب برات تھی رات
سامانِ طرب جو تھے فراہم	سب رہنے لگے خوشی سے باہم
تھا شاہِ بھرت وہ طفلِ خوش کام	مشہور ہے جس کا آج تک نام[99]

محمد فاروق وحشت بریلوی نے مہابھارت کو اردو نظم میں لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ شکنتلا منظوم اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ ابتدا میں بجائے حمد کے "حضرت کرشن سے التجا" کے عنوان سے ایک نظم ملتی ہے۔ وحشت نے قصے کے واقعات انگریزی ترجموں سے لیے ہیں۔ مثنوی کی صنف سے ہٹ کر انھوں نے مسدس کا پیرایہ اختیار کیا جو کامیاب نظر نہیں آتا۔ ہندو مذہبی ناموں اور اصطلاحوں کو روا رکھا ہے اور کہیں غیر مقامی فضا پیدا نہیں ہونے دی۔ لیکن نظم ابتدائی کوشش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے اور شاعرانہ اعتبار سے پست ہے۔[100]

---

۹۹ مثنوی نیرنگ سحر، اقبال ورما سحر ہتگامی، کان پور، ۱۹۱۹ء

۱۰۰ شکنتلا منظوم، حوالہ ماسبق

مثنوی ستیہ وان ساوتری

ستیہ وان اور ساوتری کا قصہ بھی مہابھارت سے ماخوذ ہے۔ رشی مارکنڈے نے یہ قصہ راجا یدھشٹر کو خانہ دار عورت کی صفات کے بیان میں سنایا تھا۔[۱۰۱] قصے کا پلاٹ معمولی ہے۔ لیکن ساوتری کے کردار میں جو غیر معمولی ثابت قدمی، پامردی اور جرأت ہے اس کی بنا پر یہ بہت مقبول رہا ہے۔ ہندوؤں میں ہر سال "براماوس" کے تہوار پر عورتیں اس قصے کو سنتی سناتی ہیں۔ اس کا مقصد عورتوں کو پاک بازی اور وفاشعاری کے اوصاف سکھانا ہے۔

ستیہ وان ساوتری کا قصہ دیوی بھاگوت پران کے اسکندھ ۹ (۳۸-۲۶) میں بھی ملتا ہے۔ اس کا ہندی ترجمہ جوالا پرشاد مصرا نے بمبئی سے ۱۹۰۲ء میں "ساوتری اپاکھیان" کے نام سے شائع کیا۔[۱۰۲]

یورپ میں اصل قصے کو Kellner نے مع مقدمہ لپزگ سے ۱۸۸۸ء میں شائع کیا۔[۱۰۳] ستیہ وان ساوتری کے اسی قصے کو محمد عبدالعزیز فائق اور محمد ابراہیم محشر انبالوی نے اردو میں ڈرامے کے طور پر لکھا۔[۱۰۴]

جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے اردو میں اس قصے کو سوائے جگر بریلوی کے کسی اور نے نظم نہیں کیا۔ جگر بریلوی کی مثنوی کا نام "پیام ساوتری" ہے۔ (سالِ تصنیف ۱۹۳۰ء، سال طبع ۱۹۵۴ء) جگر نے اپنی مثنوی میں اصل قصے سے کوئی انحراف نہیں کیا۔

مثنوی کا موضوع عشق کی موت پر فتح ہے۔ ساوتری[۱۰۵] کا کردار

---

۱۰۱ مہابھارت، حوالہ ماسبق ۳، ۲۹۳

۱۰۲ ہندی، ص ۲۳۳

۱۰۳ ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر، اے۔اے۔ میکڈانلڈ، ص ۴۴۵

۱۰۴ اردو ڈراما، عشرت رحمانی، ص ۲۴۸ اور ۲۵۳

۱۰۵ ساوتری، وید کے مقدس گائتری اشلوک کو بھی کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات برہما کی بیٹی ست روپ کو بھی ساوتری کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ (ہندو میتھالوجی، جان ولکنز، لندن ۱۹۵۷ء، ص ۲۹۱)

مثنوی کی جان ہے۔ ساوتری مدر دیس کے راجا اشوپت کی اکلوتی بیٹی تھی۔ دولتِ حسن سے مالا مال اور اخلاق و اوصاف میں لاثانی تھی۔ جب جوان ہوئی تو حسنِ نظر سوز کا یہ عالم تھا:

طِفلی تھی شباب کے اثر میں ملتی تھی چاندنی سحر میں
چہرہ کہ کنول کھِلا ہوا تھا یا پھول کوئی گلاب کا تھا
بوٹا سا وہ قد بدن سنہرا کندن سا دمک رہا تھا چہرا
وہ آنکھ کا حسن روح پرور بھونرا سا کنول کی پنکھڑی پر
وہ بارِ حیا کہ جھک گئی آنکھ نرگس کی تھی نیم وا کلی آنکھ
تھے لعل لب اس طرح نمایاں گل نار کی جیسے سرخ کلیاں
تھا جانِ وفا حیا کا انداز تھا جسم لطیف صورتِ راز
جب غنچۂ لب کو کھولتی تھی ہر بات میں قند گھولتی تھی
رفتار نسیم کو بھی شرمائے اک موجِ شراب اٹھ کے رہ جائے

سن وسال کو دیکھ کر ماں باپ کو شادی کی فکر ہوئی۔ "بر" کی تلاش میں ہر سمت بھاٹ اور برہمن بھیجے گئے۔ ساوتری کے حسن و جمال کا چرچا عام تھا لیکن اس کے جلال و جمال کی تاب لانے کی مجال کسی کو نہ تھی۔ حکم ربیّ یہی تھا چنانچہ:

بڑھتا جو چلا سن جوانی غمگیں ہوئے راجا اور رانی
آخر بہ ہزار رنج و صد سوز بیٹی سے کہا پدر نے اک روز
بوڑھا ہوں، ضعیف ہو گیا ہوں مہمان میں صبح و شام کا ہوں
غم ہے ترے ہاتھ پیلے ہو جائیں پیری کی میری دعائیں پھل لائیں
کس طرح کہوں کہ تو سفر کر یہ بار اٹھائے اپنے سر پر
ممکن ہے کہ تیرتھوں میں جاکر پلٹے تو مری مُراد پاکر

باپ کے حکم کی تعمیل ناگزیر تھی۔ سہیلیوں کو ساتھ لیے رتھ میں سوار ساوتری سیر کے پردے میں شوہر کے انتخاب کے لیے گھر سے نکلی:

گزرے کچھ روز جب سفر میں ویرانوں میں کوہ و دشت و در میں
اک شام مبارک ایسی آئی پیغام خوشی کا ساتھ لائی

اور ساوتری کی نظر ستیہ وان پر پڑی:

بوٹوں میں وہ سرو قد کھڑا تھا پھولوں میں گلاب سا کھلا تھا
یوں جلوہ نما تھا رشک ناہید دامانِ شفق میں جیسے خورشید
پیکر میں شباب بس رہا تھا غنچہ کِھل کِھل کے ہنس رہا تھا

اور پھر:

حیرت سے نظر ادھر اٹھائی وہ شمعِ جمال کچھ لجائی
دو چار ہوئیں نگاہیں ان کی نہریں ملیں شہد و شیر کی سی
بچھڑی ہوئی روحیں تھیں مقابل ملتے ہی نگاہیں مل گئے دل

ستیہ وان شالوہ کے راجا دمت سین کا بیٹا تھا۔ آشوب چشم کی وجہ سے دمت سین کی سلطنت جاتی رہی تھی، اور اب وہ جنگل میں تپسیا میں مشغول تھا۔ ساوتری جب گھر لوٹی تو سب احوال ماں باپ سے کہا۔ اتفاقاً وہاں رشی نارد جی موجود تھے۔ انھوں نے ساوتری کے انتخاب پر افسوس کیا اور کہا:

اک سال کے بعد آج کے دن مر جائے گا ستیہ وان کم سن

مقدر کے سامنے کس کی چلی ہے۔ باپ نے ساوتری کو پھر سے انتخاب کرنے کو کہا۔ یہ آئینِ عشق سے فروتر تھا۔ ساوتری بول اُٹھی:

وہ زر ہو کہ قول ہو کہ دختر واپس لیتا ہے کوئی دے کر
دیکھا جب انھیں سمجھ کے شوہر رشتہ مرا ہوچکا مقرّر

رشتہ ہے یہ میری جان کے ساتھ میں بک چکی ستیہ وان کے ہاتھ
بیاہوں گی کسی کو تو اُنھیں کو عمر اُن کی زیادہ ہو کہ کم ہو

بالآخر شادی ہو گئی۔ جنگل میں ستیہ وان کے پاس آکر ساوتری نے شاہی لباس اتار پھینکا اور راج کماری یا دلہن کی کوئی شان باقی نہ رہنے دی۔ بظاہر وہ ہنستی بولتی، لیکن شوہر کی موت کی پیشین گوئی دل میں تیر کی طرح گڑی تھی۔ آخرکار وہ منحوس دن بھی آپہنچا جب ستیہ وان کے مقدر میں مرنا لکھا تھا۔ سوزِ عشق میں جل جل کر ساوتری کندن بن چکی تھی۔ ”تزکیۂ نفس کے لیے وہ کئی دن سے برت رکھ رہی تھی، چہرہ زرد تھا اور بدن نزار۔ ستیہ وان ایندھن لانے کے لیے گھر سے نکلتا ہے، ساوتری روک تو نہیں سکتی، خود بھی ساتھ چل پڑتی ہے۔ جھٹ پٹے کا سماں ہے اور بہار کے دن! دُور دُور تک شفق اپنا سونا لٹا رہی ہے۔ ستیہ وان محبت کے بول بولتا ہے۔ ساوتری کے دل میں غم اور لب پر تبسم ہے۔ اٹکھیل کرتے کرتے دونوں ایک مقام پر رک جاتے ہیں۔ ستیہ وان درخت پر چڑھ جاتا ہے اور لکڑیاں کاٹنے لگتا ہے۔ اچانک اسے شدید درد سر ہوتا ہے، لڑکھڑاتا ہے اور درخت سے نیچے آگرتا ہے۔ ساوتری کی آزمائش کا وقت ہے۔ وہ سنبھلتی ہے اور شوہر کے سر کو زانو پر رکھ کے دبانے لگتی ہے۔ رات کا اندھیرا بڑھتا ہے۔ ہولناک جنگل اور درندوں کی آوازیں دل دہلائے دیتی ہیں۔ لیکن ساوتری دل کو کڑا کیے، آنکھوں میں سوز یقین کی شمع جلائے، وہاں جمی ہوئی ہے۔ موت کا فرشتہ ستیہ وان کی روح قبض کرنے کے لیے آتا ہے، ستیہ وان کی روح قبض کرتا ہے اور چل دیتا ہے۔ ساوتری سایہ کی طرح اس کا تعاقب کرتی ہے۔ جم راج اس کو ٹوکتا ہے اور کہتا ہے۔ ”شوہر کے حقوق تم نے ادا کردیے، مٹی سے دل مت لگاؤ، واپس لوٹ جاؤ“۔ لیکن ساوتری جواب دیتی ہے:

زن پر جو حقوقِ شوہری ہیں وہ قیدِ زمانہ سے بری ہیں
جس عشق کے رنگ میں وفا ہے اس عشق کا مدعا خدا ہے

چمکاؤں گی میں مقدر اپنا پاؤں گی ضرور شوہر اپنا
بیوہ ہو کر نہ جاؤں گی میں دنیا کو نہ منھ دکھاؤں گی میں

اس تقاضے کو ٹالنے کے لیے جم راج ساوتری کو سوائے شوہر کی حیات کے کوئی سی مراد مانگنے کو کہتا ہے۔ ساوتری خسر کی آنکھیں مانگتی ہے۔ لیکن تعاقب سے پھر بھی باز نہیں آتی۔ اس پر یکے بعد دیگرے موت کا فرشتہ اس کی تین اور مرادیں پوری کرتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے: ساوتری سو بیٹوں کی ماں بنے گی۔ اس پر بھی ساوتری جم راج کا پیچھا کرنے سے باز نہیں آتی تو وہ جھلا اُٹھتا ہے۔ ساوتری عورت کی پاک بازی اور نیک شعاری کے اوصاف بیان کرتی ہے اور کہتی ہے کہ جب تک ستیہ وان زندہ نہیں ہوتا، میں سو بیٹوں کی ماں کیسے بن سکتی ہوں۔ موت کا فرشتہ قول ہار چکا ہے، بے بس ہے اور ستیہ وان کی روح کو واپس کرتا ہے۔ اس طرح ساوتری کے جذبۂ عشق نے موت پر فتح پائی اور حسنِ عمل سے اپنی، اپنے خاوند کی اور اپنے خسر کی تقدیروں کو بھی بدل دیا۔

پورا قصّہ جگر بریلوی نے نہایت ربط و تنظم، سلاست اور صفائی سے نظم کیا ہے۔ رواں دواں، شگفتہ اور صاف و سلیس شعروں پر کہیں کہیں سحر و اعجاز کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ ساوتری کا کردار قصّے کی جان ہے جس سے وفاشعاری اور پاک بازی کے اعلیٰ اوصاف کا پیام ملتا ہے۔

باب دوم

قدیم لوک کہانیاں

دکھنی مثنویاں

مثنوی کدم راؤ، پدم راؤ

اس مثنوی کا ایک ناقص مخطوطہ نصیرالدین ہاشمی نے لطیف الدین ادریسی کے پاس دیکھا تھا۔ انھوں نے اس کا تعارف سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۳۲ء کے مجلّہ 'معارف میں کرایا۔ مخطوطہ ناقص الآخر ہے اور موجودہ حالت میں اشعار کی تعداد ۸۲۵ پائی گئی۔ مصنف نے مثنوی کے نام کی صراحت نہیں کی، لیکن کہانی چونکہ کدم راؤ اور پدم راؤ سے متعلق ہے، اس لیے اسی نام سے منسوب کیا گیا۔

مثنوی کے آغاز میں ایک عنوان ہے: "سلطان علاء الدین بہمنی نوراللہ مرقدہٗ" اس میں منجملہ دوسرے اشعار کے دو شعر یوں ہیں:

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنور   پرتیال سینسار کرتار ادھار

دھنیں تاج کا کون راجا بہنگ   کنور شاہ کا شاہ احمد بھجنگ

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی علاء الدین کے انتقال کے بعد لکھی گئی۔ "شاہ احمد" جس کا نام ان اشعار میں آیا ہے۔ خاندان بہمنی کے گیارھویں حکمراں علاء الدین ہی کا جانشین تھا اور احمد شاہ ثالث بہمنی کے نام سے ۸۶۵ھ سے ۸۶۷ھ تک حکمراں رہا۔ یہ مثنوی غالباً اسی کے عہد میں تصنیف ہوئی۔

نظامی کے حالات کسی تذکرے اور تاریخ میں نہیں ملتے۔ چونکہ مثنوی نامکمل ہے، اس لیے سنہ تصنیف اور سنہ کتابت کا بھی پتہ نہیں چل سکا۔ ناقص ہونے کی وجہ سے قصّے کی تفصیل پیش کرنا بھی دشوار ہے۔

نصیرالدین ہاشمی کا بیان ہے کہ "مثنوی حمد و نعت سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد علاء الدین بہمنی کی مدح ہے۔ زبان قدیم ہے اور عربی و فارسی کی بجائے ہندی اور مقامی الفاظ کی بھرمار ہے، جس کی وجہ سے اس کا سمجھنا دقت

طلب ہے[1]۔ موصوف اسے اردو کی قدیم ترین مثنوی قرار دیتے ہیں[2] قصے کے مرکزی ناموں سے ظاہر ہے کہ نظامی نے اپنی اس مثنوی کی بنیاد کسی مقامی لوک روایت پر رکھی ہوگی۔ اس مثنوی کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو، پاکستان میں محفوظ ہے۔[3]

مثنویات طوطی نامہ

طوطی نامہ کا سلسلہ "شک سپ تتی" ایک سنسکرت کتاب تک پہنچتا ہے جس کے معنی ہیں توتے کی کہی ہوئی ستر (۷۰) کہانیاں۔ سنسکرت میں اس کے دو نسخے موجود ہیں۔ ایک مغلق اور دوسرا سادہ و سہل۔ پہلا چنتامنی بھٹ سے اور دوسرا سوتیا مبر جین سے منسوب ہے۔ قیاس ہے کہ ان دونوں نسخوں سے پہلے شک سپ تتی کا اصل نسخہ سنسکِرت نثر میں ہوگا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کا بیان ہے کہ شک سپ تتی کی ان ستر کہانیوں میں سے بیشتر ہندستان کے قصے کہانیوں کے قدیم ترین مجموعوں سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً چنتامنی بھٹ نے بعض کہانیاں پورن بھدر کے پنچ تنتر سے لی ہیں۔ طوطی نامہ کا بنیادی حصہ رادھا جاتک ۱۴۵ اور ۱۹۸ میں ملتا ہے۔ ان کے علاوہ شک سپ تتی کے کچھ حصے بیتال پچیسی اور ہتوا پدیش سے بھی ملتے جلتے ہیں۔[4]

شک سپ تتی کی یہ کہانیاں زیادہ تر عورتوں کی بدچلنی سے متعلق ہیں اور انسانی فطرت کی بعض بنیادی کمزوریوں کا پردہ فاش کرتی ہیں۔ سنسکرت کے علاوہ ہندی میں بھیروں پرشاد، گجراتی میں سامل بھٹ، مرہٹی میں کسی نامعلوم مصنف اور مشرقی راجستھانی میں دیودت کے قدیم تراجم محفوظ ہیں۔ توتے کی

---

۱ دکن میں اردو، ص ۴۰

۲ جدید تحقیق کے مطابق اردو کی ایک اور قدیم مثنوی اشرف کی "نوسرہار" ہے (سنہ تصنیف ۹۰۹ھ) مخطوطہ ادارۂ ادبیات، ج اول، نمبر اول

۳ دکن میں اردو، بار چہارم، ص ۳۴

۴ گیان چند جین، اردو کی نثری داستانیں، ص ۵۹، ۶۰

کہی ہوئی یہ ستر (۷۰) کہانیاں یورپ اور دوسرے ممالک میں بھی بہت مقبول رہی ہیں۔ چنانچہ ترکی، انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، یونانی اور جاوی میں ان کے متعدد تراجم یا خلاصے شائع ہوئے ہیں۔ فارسی اور اردو کے نسخوں کو ملا کر طوطی نامہ کے نسخوں کی کل تعداد ۲۸ تک پہنچتی ہے۔ جیسا کہ ملحقہ نقشے میں واضح کردیا گیا ہے۔ طوطی نامہ کے مختلف تراجم وغیرہ کا یہ نقشہ سب سے پہلے شمس اللہ قادری نے اردوے قدیم میں بطور ضمیمہ شائع کیا تھا۔[۵] انھوں نے کل ۱۳ نسخوں کے نام گنوائے تھے۔ ان کے بعد مرتب طوطی نامہ، (شائع کردہ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات، حیدر آباد) نے اپنے نقشے میں چار مزید نسخوں کی نشان دہی کی۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب کے ضمیمہ نمبر ۳ میں طوطی نامہ کے نسخوں کی تفصیل پیش کرتے ہوئے، بلوم ہارٹ اور ایتھے کی فہارس کی مدد سے نو مزید نسخوں کا اضافہ کیا۔[۶] ملحقہ نقشے میں ان سب نسخوں کے نام پیش کیے گئے ہیں۔ علاوہ بریں دو اور نسخوں کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک جاوی زبان کا ترجمہ ہے جسے ملکہ اچھی (سماترا) نے نورالدین الزیری سے کروایا تھا۔[۷] دوسرا اسید محمد قادری (فارسی) کا اردو ترجمہ ہے جسے جیون رام نارنولی نے ۱۸۷۳ء میں شائع کیا۔[۸] اس طرح طوطی نامہ کے خلاصوں اور تراجم کی کل تعداد ۲۸ تک پہنچ گئی ہے۔ ان کے علاوہ طوطی نامہ سے ملتے جلتے قصوں پر مبنی تین اور مثنویوں کا بھی پتا چلا ہے، جن کی تفصیل آگے پیش کی گئی ہے۔

قصّہ

اصل شک سپ تتی تک دسترس نہ ہونے کی صورت میں اس قصّے کی روایت ہندی شک بہتری سے پیش کی جاتی ہے، جو سنسکرت سے براہِ راست

۵ شمس اللہ قادری، اردوے قدیم ۱۲۴، ۱۲۵

۶ نثری داستانیں، ص ۵۶۵

۷ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، جلد ۳، ص ۲۰۰

۸ بلوم ہارٹ، برٹش ضمیمہ، ص ۳۳۰

ترجمہ ہے۔

قصّے کا ہیرو سیٹھ ہردت کا لڑکا مدن سین ہے۔ ہیروئن پربھاوتی ہے۔ مدن سین راجا کے لیے جواہر خریدنے جاتا ہے اور سات دن میں آنے کا وعدہ کرتا ہے۔ پربھاوتی کی وزیر زادے سے آنکھ لڑ جاتی ہے اور ایک کٹنی کی معرفت ملاقات طے ہو جاتی ہے۔ جانے سے پہلے پربھاوتی مینا سے اجازت چاہتی ہے۔ مینا ڈانٹتی ہے، جس کی وجہ سے پربھاوتی اسے مار ڈالتی ہے۔ پھر توتے سے پوچھتی ہے۔ وہ اس شرط پر ایک کہانی سناتا ہے کہ وہ آج نہ جائے۔ اس طرح وہ روزانہ اس حیلے سے پربھاوتی کو روکتا ہے۔ جب مدن سین واپس آتا ہے تو پربھاوتی خود بتاتی ہے کہ توتے نے اس کی عصمت بچائی۔ دونوں خوشی سے رہنے لگتے ہیں۔ توتا ایک پہاڑ پر جاکر اپنا قالب چھوڑ کر گندھرب ہو جاتا ہے۔ اس طرح مینا بھی گندھرب ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں اصل میں گندھرب ہی تھے جو ایک رشی کی بددعا سے حیوانی قالب میں گرفتار ہوگئے تھے۔ روایت یوں ہے کہ نارد رشی نے توتے کے روپ میں یہ کہانیاں اندر کے دربار میں سنائی تھیں اور کہا کہ جو بھی انھیں سُنے گا، اس کی مرادیں بر آئیں گی"۔[9]

فارسی نسخے

(ا) طوطی نامہ، ضیاء الدین نخشبی (۷۳۰ھ) انھوں نے ایک قدیم فارسی نسخے سے باون کہانیاں مغلق فارسی میں لکھیں۔ یہ نسخہ باڈلین لائبریری میں محفوظ ہے۔[10]

شیخ ضیاء الدین نخشبی (المتوفی ۷۵۱ھ[11]) نے اپنے فارسی طوطی نامہ کے

---

۹ نثری داستانیں، ص ۶۰، ۶۱

۱۰ باڈلین، ج ۳، صفحہ ۱۷، نمبر ۲۵۱۷، برائے نسخ دیگر، سبحان اللہ ص ۵۱، ایتھے ۷۴۳، بانکی پور، ۷۲۸، ریو ۷۵۳، نیز باڈلین ۴۴۴-۴۴۸

۱۱ ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو اخبار الاخیار، ص ۱۴۰، بیل ص ۲۰۳، نیز خلیق احمد نظامی کا مقالہ، رسالہ برہان نومبر ۱۹۵۱، ص ۲۸۸

دیباچے میں لکھا ہے کہ ایک صاحب ان کے پاس طوطی نامہ کا ایک قدیم فارسی نسخہ لائے اور فرمائش کی کہ وہ اسے پھر سے لکھیں۔ کیونکہ قدیم نسخے کی زبان ادبی اعتبار سے بے مزہ تھی۔ چنانچہ نخشبی نے ۵۲ کہانیوں کو ''پُر تکلف اور مقفیٰ فارسی میں لکھا۔ انھوں نے وہ کہانیاں جو ان کے نزدیک غیر دلچسپ تھیں، نکال دیں اور بعض دوسری کہانیوں کا اضافہ کیا''۔[۱۲]

نخشبی کے طوطی نامہ کا ایک ایڈیشن ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔[۱۳]

(۲) طوطی نامہ، شیخ ابوالفضل بن مبارک۔ انھوں نے شہنشاہ اکبر کی فرمائش پر نخشبی کے ادق اور مشکل طوطی نامے کا وسط دسویں صدی ہجری میں سلیس فارسی میں خلاصہ کیا۔[۱۴]

(۳) منتخب طوطی نامہ نظم از حمید لاہوری۔ سنہ تصنیف ۹۔۹۹۸ھ (۳۰ کہانیاں نخشبی سے اور دو گلستاں سے)[۱۵]

(۴) طوطی نامہ، سید محمد قادری۔ انھوں نے بھی نخشبی کی کتاب کا روزمرّہ فارسی میں خلاصہ کیا (۳۵ کہانیاں) ۱۰۹۳ھ[۱۶]

سید محمد قادری کے فارسی طوطی نامہ کا ایک مطبوعہ نسخہ ادارۂ ادبیات اُردو، حیدر آباد میں موجود ہے۔ کل صفحات ۸۳ اور سنہ طبع ۱۲۸۴ھ ہے۔ اس کے سر ورق پر مصنف کا نام یوں درج ہے: ''نثر من تالیف سید محمد خداوند قادری''۔[۱۷] باڈلین کے کٹیلاگ میں بھی نام ''محمد خداوند قادری'' بتایا گیا

---

۱۲ اسلام، جلد ۳، ص ۸۴۱

۱۳ مکتوب ڈاکٹر مختارالدین آرزو بنام راقم الحروف

۱۴ ایتھے، نمبر ۷۵۲، نیز ریو ۷۵۴

۱۵ مخزونہ کتب خانہ رضائیہ رام پور مکتوبہ ۱۰۸۲، نیز باڈلین نمبر ۳۹۰

۱۶ ایتھے نمبر ۷۵۲ نیز ریو ۷۵۴، باڈلین ۱۹۷۵ اور ۲۰۲۸

۱۷ مطبوعات ادارہ، ۲، ص ۲۱۲

ہے۔[۱۸] نیز انڈیا آفس فارسی مطبوعات میں بھی "محمد خداوند" درج ہے۔[۱۹]

(۵) طوطی نامہ، از عباداللہ، مطبوعہ ۱۲۸۲ھ (تقریباً ۵۲ کہانیاں)[۲۰]

(۶) ہیبت قلی خان حسرت تخلص شاگرد میر باقر حزیں اور مرزا مظہر جان جاناں دہلوی (وفات ۱۲۱۰ھ) نے بقول فیلن کے ایک قصہ طوطی نامہ لکھا تھا۔[۲۱]

(۷) "چہل طوطی" کے نام سے ایران میں چالیس افسانوں کا جو مجموعہ مشہور ہے، وہ طوطی نامہ ہی سے ماخوذ ہے۔[۲۲] ایسے ہی ایک مجموعے کو V. Zhu Kovski نے St. Petersburg سے ۱۹۰۱ء میں شائع کیا تھا۔[۲۳]

اردو نسخے

(۱) طوطی نامہ، غواصی، ۱۰۴۹ھ (ترجمہ از نخشبی، ۴۵ کہانیاں)[۲۴]

(۲) طوطی نامہ، ابن نشاطی۔ (ماخوذ از نخشبی) دتاسی نے اس کا سنہ تصنیف ۱۰۴۹ھ بیان کیا ہے۔ لیکن اسٹوارٹ کے بیان سے ۱۰۶۴ھ میں اس کا تصنیف ہونا ظاہر ہوتا ہے۔[۲۵] یہ نسخہ غیر محقق ہے۔ دتاسی اور اسٹوارٹ سے سہو ہوا ہے۔

---

۱۸ باڈلین نمبر ۱۹۷۵ اور ۲۰۲۸

۱۹ آر بری ۵۴۴، ۵۴۵

۲۰ گیان چند جین، نثری داستانیں، ص ۵۶۰

۲۱ قاضی عبدالودود، صدائے عام، عید نمبر ص ۱۹، بحوالہ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، ص ۲۷۹

۲۲ اسلام، جلد ۳، ص ۸۴۱

۲۳ ایضاً

۲۴ کتب خانہ سالار جنگ میں غواصی کی مثنوی طوطی نامہ کے دو قلمی نسخے ہیں۔ (ا) مکتوبہ ۱۱۲۴ھ (ب) مکتوبہ ۱۲۵۰ھ ص ۵۸۹۔ برٹش میوزیم کے دو نسخے ۱۱۷۰ھ اور ۱۱۷۲ھ کے لکھے ہوئے ہیں (بلوم ہارٹ نمبر ۵۴) (آصفیہ میں ایک نسخہ ۲۹۳۱۴) اشپرانگر، ص ۶۰۸

۲۵ شمس اللہ قادری، اردوئے قدیم، ص ۶۹

شک سپ تتی (سنسکرت)
طوطی نامہ (نسخہ گم شدہ)
ترجمہ ہندی
بھیروں پرشاد
۱۸۶۴ء
ترجمہ گجراتی (نظم)
سامل بھٹ
۱۷۶۴ء
ترجمہ فارسی نخشبی (نثر)
۷۳۰ھ
ترجمہ مرہٹی
(نامعلوم)
ترجمہ مشرقی راجستھانی
دیودت
خلاصے
ترجمے
حمید لاہوری (نظم)
۹۹۸ـ۹ھ
عباداللہ (نثر)
۱۲۸۲ھ
ابوالفضل (نثر)
دسویں صدی ھ
سید محمد قادری
۱۰۹۳ھ (نثر)
ترکی عبداللہ صاری
۹۴۶ـ۷۴ھ
انگریزی- جیرانس
۱۷۹۲ء
یونانی- گالانوس اور
تھائی پال ڈوس ۱۸۵۱ء
جرمنی- جارج راسین
۱۸۵۸ء
فرانسیسی- ملر
۱۹۳۴ء
دکھنی- غواصی
۱۰۴۹ھ
ابتدائی ۳۵ کہانیوں کا دکھنی ترجمہ
مخزونہ برٹش میوزیم
(بارہویں صدی ہجری)

نوٹ: اس نقشے میں ابنِ نشاطی سے منسوب دکھنی ترجمے کو شامل نہیں کیا گیا۔ استوارٹ اور دتاسی کی روایتوں کے باوجود اس کی اصلیت غیر محقق ہے۔ مختلف زبانوں میں ترجمے کی تعداد یوں ہے: فارسی ۵، اردو ۷، انگریزی ۴، جرمنی ۲، ہندی ۲، بنگالی ۱، گجراتی ۱، مرہٹی ۱، راجستھانی ۱، ترکی ۱، یونانی ۱، فرانسیسی ۱، جاوی ۱ = کل ۲۸

(۳) طوطی نامہ، دکھنی زبان میں، مصنف نامعلوم، ۱۱۴۲ھ (نثری ترجمہ) مخزونہ جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد اور برٹش میوزیم۔[۲۶]

(۴) طوطی نامہ، نسخہ ابوالفضل کی ابتدائی ۳۵ کہانیوں کا دکھنی ترجمہ مع فارسی متن، مصنف نامعلوم (بارہویں صدی ہجری)[۲۷]

(۵) طوطی نامہ، حیدر بخش حیدری، ۱۲۱۶ھ (نثری ترجمہ از سید محمد قادری) یہ ترجمہ جان گل کرائسٹ کی فرمایش پر فورٹ ولیم کالج کے لیے کیا گیا۔[۲۸]

کتب خانہ انڈیا آفس میں حیدر بخش حیدری کی طوطا کہانی کے ۱۸۰۴ء سے ۱۸۸۳ء تک کے سولہ مختلف ایڈیشن موجود ہیں۔[۲۹]

(۶) حکایاتِ سخن سنج، انبا پرشاد رسا ۱۸۴۵ء (نثری ترجمہ از حیدر بخش حیدری)[۳۰]

(۷) طوطا کہانی، مصنف نامعلوم (قادری سے ترجمہ دکھنی میں) اوراق ۷۸، قبل ۱۲۲۰ھ[۳۱]

(۸) توتا کہانی، جیون رام نارنولی۔ ۱۸۷۳ء (نثری ترجمہ از سید محمد قادری)[۳۲]

---

۲۶ اردوے قدیم، ص ۱۲۵، نیز بلوم ہارٹ نمبر ۸۵، عثمانیہ مخطوطات، نمبر ۵۹، ص ۱۸۱

۲۷ بلوم ہارٹ برٹش، نمبر ۸۵، ص ۴۹

۲۸ حیدر بخش حیدری کی طوطا کہانی کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۰۴ء میں شائع ہوا۔ دوسرا ۱۸۳۶ء میں اور تیسرا ۱۸۴۰ء میں نکلا۔ چوتھا ۱۸۵۲ میں بمقام لندن ڈی. فاربس کی نگرانی میں چھپا۔ برٹش میوزیم میں اس کتاب کے ۱۸۵۹ء (دہلی)، ۱۸۷۶ء (دہلی) اور ۱۸۶۴ء (کان پور) کے ایڈیشن بھی محفوظ ہیں۔ بلوم ہارٹ، برٹش کتب، صفحہ ۲۳۷ اور ۲۳۸، نیز ضمیمہ صفحہ ۳۳۰، قلمی نمبر ۹۳، صفحہ ۵۴۔ (کتب خانہ انڈیا آفس میں حیدر بخش حیدری کی طوطا کہانی کے ۱۸۰۴ سے ۱۸۸۳ تک کے سولہ مختلف ایڈیشن موجود ہیں)

۲۹ انڈیا مطبوعات، ص ۱۵۱ اور ۱۵۲

۳۰ یہ ۱۸۴۵ میں دہلی سے شائع ہوا۔ (صفحات ۱۳۲) بلوم ہارٹ، برٹش ضمیمہ، ص ۳۳۰

۳۱ مخزونہ ادارہ ادبیات اردو، فہرست جلد اوّل، ص ۳۳۳

۳۲ بلوم ہارٹ، برٹش کتب، ص ۲۳۷

اردو نسخوں کی اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ طوطی نامہ سے متعلق اردو میں فقط ایک مثنوی لکھی گئی ہے جو غواصی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔

مثنوی طوطی نامہ غواصی

غواصی کو سلطان عبداللہ قطب شاہ، (۸۳۔۱۰۳۵ھ) کے زمانے میں عروج حاصل ہوا۔ مثنوی طوطی نامہ اسی بادشاہ کے عہد میں ۱۰۴۹ھ میں لکھی گئی۔ غواصی کو شاہی دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا اور اسے ملک الشعراء کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ طوطی نامہ کے علاوہ اس کی ایک اور مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" بھی حیدر آباد سے شائع ہو چکی ہے۔

غواصی کی مثنوی طوطی نامہ کے قلمی نسخے یورپ اور ہندستان کے کتب خانوں میں عام طور پر مل جاتے ہیں، جن میں سے چند کی صراحت اوپر کردی گئی ہے۔ یہ مثنوی ۱۹۳۹ء میں مجلسِ اشاعت دکنی مخطوطات، حیدر آباد نے میر سعادت علی رضوی سے مرتب کروا کے شائع کردی ہے۔ (تعداد صفحات ۲۹۰)

غواصی نے طوطی نامہ کا بنیادی قصہ نخشبی سے لیا ہے۔ لیکن اس میں کہیں کہیں حسب ضرورت تصرفات بھی کردیے ہیں۔ خصوصاً مثنوی کا ابتدائی اور آخری حصہ غواصی کے زور تخیل کا پتا دیتا ہے۔ نخشبی نے سنسکرت کی ستر کہانیوں میں سے صرف ۵۲ کو فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ان باون میں شک سپ تتی کے علاوہ چند کہانیاں براہِ راست پنچ تنتر، ہتواپدیش، بیتال پچیسی اور جاتک سے بھی لے کر شامل کردی گئیں۔ ایک آدھ کہانی پر فارسی بختیار نامہ اور الف لیلیٰ کے قصوں کا بھی اثر ہے۔ غواصی نے نخشبی کی ان باون کہانیوں میں سے فقط ۴۵ کو اپنی مثنوی میں بیان کیا ہے۔

مثنوی کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد بادشاہِ وقت سلطان عبداللہ قطب شاہ کی مدح ہے۔ سبب تالیف بیان کرتے ہوئے غواصی کہتا ہے:

جو دل طوطی نامہ پو دوڑائیا — مناسب مری عقل کے آئیا
سواپ میں کیا مست بن مئی وہیں — ہوا بعد ازاں نظم کے پے وہیں
ہوئے کیوں نہ عالم میں مشہور یو — نہ کیوں جاوے ملکے ملک دور یو
کہ ہر بیت میں ہے سمایاں جُدا — ہر یک بات میانے ہے مایا جدا
نہیں داستاں ہے یو ہے بوستاں — عجب کیا جو خوش اس تے ہووے جہاں
کہ پانی میں اپنے کلیجے کوں کر — کیا اس نوے باغ شاہی کوں تر[۳۳]

غواصی نے قصّے کی تمہید یوں باندھی ہے: ہندستان کے ایک دولتمند اور متمول سوداگر کے ہاں بڑی منتوں، مرادوں سے لڑکا پیدا ہوا۔ جوان ہونے پر باپ نے اس کی شادی ایک نہایت حسین لڑکی سے کردی۔ سوداگر کا بیٹا ایک توتے اور مینا کو بہت عزیز رکھتا تھا، جو اسے عقل و دانش کے عجیب و غریب نکات سے آگاہ کرتے تھے۔ نوجوان کو تجارت کی ضرورتوں سے سفر درپیش آیا اور وہ دونوں پرندوں کو اپنی حسین بی بی کی نگہداشت میں چھوڑ کر روانہ ہوگیا۔ سوداگر کی واپسی میں دیر ہوئی۔ ادھر جوان بی بی کی کسی دوسرے سے آنکھ لڑ گئی۔ کٹنی کی معرفت ملاقات طے ہوئی۔ مینا نے سوداگر کی بی بی کو اس ارادے سے باز رکھنا چاہا تو ہلاک کردی گئی۔ اس کے بعد سوداگر کی بی بی نے توتے سے مشورہ کیا۔ وہ مینا کا حشر دیکھ چکا تھا، کہنے لگا، میں تمھیں منع نہیں کرتا لیکن اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا، ورنہ تمھارا بھی وہی حال ہوگا جو فلاں رانی کا ہوا تھا اور پھر وہ اس رانی کا قصہ سنانے لگا۔ اس میں صبح ہوگئی۔ اس طرح توتے نے ۴۵ کہانیاں سنائیں۔ ان میں عورتوں کی مکاری، فریب دہی اور بدچلنی کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ آخری رات سوداگر کا بیٹا واپس آگیا اور توتے نے اپنی آزادی کا وعدہ لے کر اُسے تمام حالات بتا دیے۔ نوجوان کو سخت رنج و افسوس ہوا۔ اس نے بی بی کو قتل کر ڈالا اور مال و دولت خیرات کرکے درویش بن گیا۔ سنسکرت

۳۳ طوطی نامہ، غواصی، مرتبہ میر سعادت علی رضوی، ۱۹۳۹، ص ۱۱

قصّے میں یوں نہیں ہے بلکہ خود بیوی نے اپنے شوہر کو آگاہ کیا کہ توتے کی دانش مندی کی بدولت اس کی عصمت بچ گئی۔ توتا رہا کردیا گیا اور میاں بیوی دونوں خوشی سے رہنے لگے۔

ترجمہ در ترجمہ میں اصل کتاب کا رنگ بہت بدل گیا ہے۔ کرداروں کے نام تبدیل کردیے گئے ہیں۔ بعض جگہ ایرانی معاشرت کی جھلک بھی ملتی ہے۔ توتا اسلامی مذہبیات سے واقفیت رکھتا ہے۔ مثنوی سے غواصی کے قادرالکلام شاعر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اندازِ بیاں سادہ اور تصنع سے پاک ہے۔ لیکن زبان قدیم ہے جس کی وجہ سے کہیں کہیں گنجلک ہوجاتی ہے۔ غواصی ذیلی قصوں کو زیادہ طول نہیں دیتا بلکہ مختصر طور پر انھیں مربوط شکل میں پیش کرتا ہے اور شاعرانہ لطافت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ مثال کے طور پر ستائیسویں (۲۷) کہانی سنیے:

آفتاب غروب ہوتے ہی سوداگر کی نوجوان بیوی فراق کی آگ میں جلنے لگی۔ توتے سے مخاطب ہوکر بولی کہ اگر میں عصمت کا خیال کرتی ہوں تو جینا عذاب معلوم ہوتا ہے اور اگر غیر مرد کے پاس جاتی ہوں تو عصمت پر داغ لگتا ہے۔ توتے نے جواب دیا کہ مکاری اور فریب دہی سے عصمت کے داغوں کو بھی چھپایا جاسکتا ہے۔ جیسے قدیم زمانے میں ایک سوداگر کی بیوی نے کیا تھا۔ وہ چندر مکھی کی طرح حسین تھی، اس کا شوہر بہت بڑا تاجر تھا اور گھر میں زر و جواہر اور مال و دولت کی کوئی کمی نہ تھی لیکن عورت بد چلن تھی اور غیر مردوں سے ناجائز تعلقات رکھتی تھی۔ ہوتے ہوتے تاجر کے کانوں میں اس کی بھنک پڑی اور اپنی بیوی کو آزمانا چاہا۔ بیوی سے بولا:

کہیا ایک دن یوں کہ اے گل عذار — نہ کریں سفر کئیں ہوئے برس چار
ہوس ہے جو میں آج جاؤں سفر — تماشا دیکھوں ہور پھروں بحر و بر

لیکن یہ ایک چال تھی، وہ رات کو بیوی کے پلنگ کے نیچے چھپ رہا۔ اس کی

بے خبر بیوی نے اپنے آشنا کو بلوایا اور اس سے راز و نیاز کی باتوں میں مشغول ہوا ہی چاہتی تھی کہ اس نے پلنگ کے نیچے اپنے شوہر کو چھپا دیکھ کر معاملہ بھانپ لیا اور فوراً نہایت مکاری سے اپنے آشنا سے کہنے لگی:

کہ اے باپ ہور اے مرے بھائی آج — میں یک کام تے یاں تجھے لیائی آج
بری آنک سوں منج کدھن توں نہ دیکھ — منجے یوں سمج لے جو بیٹی ہوں ایک
کہ میں مرد کی برہ لے ہو نڈھال — ستی تھی دو پھار آج انجھو ڈھال ڈھال
سو یک پیر مرد آکر سپنے منے — زبان کھول منج سوں لگیا بولنے
ترے مرد کی عمر تو سب سری — حیات آج کے دن تھی اوس کی بھری[۳۴]

مکار عورت، خواب میں پیر سے یہ سن کر کہ اس کے شوہر کے دن پورے ہوگئے، اس سے پوچھنے لگی، کیا اس کے زندہ رہنے کی کوئی تدبیر بھی ہے۔ پیر نے کہا:

اگر ایک پیر مرد سوں گھر منے — لیجا آپنے پاک بستر منے
دے حرمت دیانت سوں بسلائے گی — تو جیتا ترا مرد کوں پائے گی[۳۵]

غرض بد چلن بیوی نے اپنے شوہر کو اس طرح چکمہ دیا اور پلنگ کے نیچے چھپا ہوا شوہر بھی اس کی باتوں میں آگیا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اپنی بیوی کی پاکدامنی، عصمت پروری اور وفا شعاری کا قائل ہوگیا اور اس نے بیوی کے آشنا کو اپنا بھائی بنا کر آیندہ کے لیے گھر آنے جانے کی اجازت دے دی۔

استدراک: صفحہ ۸۱ پر درج نقشے میں طوطی نامہ کی ۲۸ روایتوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ دو مزید فارسی روایتوں کا ذکر اوپر کیا گیا۔ ذیل میں غیر ملکی زبانوں کے سات اور ترجموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس طرح طوطی نامہ کے تراجم

---

۳۴ طوطی نامہ، ص ۱۵۹

۳۵ ایضاً

وغیرہ کی کل تعداد ۷ تک پہنچ گئی ہے:

۱۔ قصہ طوطی نامہ بزبان از ملا گل احمد تراہی، تعداد صفحات ۲۰، مطبوعہ دہلی ۱۸۷۹ء[۳۶]

۲۔ جرمن زبان میں نخشبی کے طوطی نامہ کی آٹھویں شب کا قصہ مع فارسی متن H. Bockhaus نے لیزگ سے ۱۸۴۳ء میں شائع کیا۔[۳۷]

۳۔ جرمن زبان کا ایک اور ترجمہ H. Blatt کا مرہونِ منت ہے۔ انھوں نے قصہ سید محمد خداوند قادری کے "طوطی نامہ" سے لیا۔ یہ ترجمہ کوچین سے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔[۳۸]

۴۔ شک سپ تتی کا ایک انگریزی ترجمہ Kiel نے ۱۸۹۴ء میں کیا جو Stuttgart سے ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا۔[۳۹]

۵۔ طوطی نامہ بزبان چک، مطبوعہ پراگ

۶۔ طوطی نامہ نخشبی کا مکمل روسی ترجمہ E. Berthels نے کیا ہے لیکن یہ ابھی شائع نہیں ہوا۔[۴۰]

۷۔ میونک میں طوطی نامہ نخشبی کے ایک دو فرانسیسی ترجمے کا قلمی نسخہ موجود ہے، جو ابھی تک شائع نہیں ہوا۔[۴۱]

طوطی نامہ کے ترکی مترجم کا صحیح نام یوں ہے: صاری عبداللہ آفندی۔[۴۲]

---

۳۶ انڈیا، پشتو ص ۸

۳۷ E.Berthels اسلام جلد ۳، ص ۸۴۱

۳۸ آربری، ص ۵۴۵

۳۹ ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر اے۔اے۔ میکڈانلڈ، ص ۴۵۰

۴۰ اسلام، جلد ۳، ص ۸۴۱

۴۱ ایضاً، نیز خلیق احمد نظامی، رسالہ برہان نومبر ۱۹۵۱ء، ص ۲۸۸

۴۲ ایضاً

طوطی نامہ سے ملتی جُلتی دوسری مثنویاں

مثنوی سوداگر کی بی بی

طوطی نامہ کے طرز کی چند اور مثنویاں بھی اردو میں دستیاب ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام "سوداگر کی بی بی" ہے۔ اس کا مخطوطہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ سنہ تصنیف ۱۱۶۴ھ، مکتوبہ ۱۱۷۰ھ اور ۱۱۷۲ھ، اوراق ۱۹۶۔ اس میں بھی ایک سوداگر کی بی بی اور اس کے معاشقوں کی داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ مصنف کا نام سید عبداللہ ہے۔ متخلص بہ قیاسی۔ آغاز:

قصہ کتا ہوں عجب ہر سخن گوہر سار کا   کیسے کری ہے چھنداو دیکھو تماشا نار کا

مصنف نے کتاب کے آخر میں سنہ تصنیف، اپنا نام اور تخلص یوں ظاہر کیا ہے:

اتھاسن ایگیارا سو چوسٹ دے سال   بتاریخ ایگیارا او ماہِ شوال
سیدی عبداللہ نے یو قصہ بنا   کیا خوش سننہار کیتن سنا
سیدی عبداللہ کر کے میرا ہی ناوں   تخلص قیاسی لکرداں(؟) ناوں[۴۳]

مثنوی قصہّ طوطا و مینا

از روشن علی۔ اس کا مخطوطہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس میں بھی توتے اور مینا کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ آغاز:

بنام خداوند بخشندہا   شنو شرح ایں قصہّ بندہا

سنہ تصنیف ۱۱۸۸ھ[۴۴]

---

۴۳   بلوم ہارٹ، برٹش نمبر ۵۴، ص ۲۶
۴۴   بلوم ہارٹ، برٹش ص ۲۸

مثنوی قصہ طوطا مینا مشہور کتاب طوطی نامہ کا ترجمہ نہیں البتہ اس میں بھی پرندوں کی زبانی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ توتا عورتوں کی بدچلنی اور مینا مردوں کی بے وفائی کے واقعات سناتی ہے۔

مثنوی روشن میاں سوداگر اور شمسوددا

یہ مثنوی گجرات کے ایک شاعر جمال الدین کی تصنیف ہے۔ اس میں توتا کہانی سے ملتا جلتا ایک قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی نے اس مثنوی کے علاوہ جمال الدین کی تین اور مثنویوں — (۱) سکندر ذوالقرنین، (۲) قصہ شاہجہاں و روشن زحل اور (۳) قصہ عیسیٰ گوہروا چھو گلاب کا تفصیلی جائزہ بھی نوائے ادب بمبئی، جولائی ۱۹۵۴ء میں پیش کیا تھا۔ ہمارا ماخذ ڈاکٹر موصوف کا یہی مقالہ ہے۔

جمال الدین کا زمانہ بارہویں صدی کا نصف آخر بتایا گیا ہے۔ اس کی مذکورہ چاروں مثنویاں مطبع کریمی بمبئی سے ۱۳۱۳ھ میں شائع ہوچکی ہیں۔

مثنوی ''قصہ روشن میاں سوداگر اور شمسوددا'' آٹھ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں عورت کے تریاچرتر کو ظاہر کیا ہے۔ مثنوی سے سنہ تصنیف نہیں کھلتا۔ قصہ یہ ہے:

ایک سوداگر روشن میاں کو اس کی بدچلن بی بی نے تجارت کے بہانے سفر پر بھیج دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمائش کی کہ جب تک تریاچرتر نہ ملے، واپس نہ آنا۔ مدتوں کے بعد جب سوداگر گھر لوٹنے لگا تو اسے تریاچرتر کا خیال آیا۔ اس کی تلاش کے دوران میں سوداگر کا واسطہ ایک کٹنی شمسوددا سے پڑا، جو اسے زنانہ لباس پہنا کر بادشاہ کے ہاں یہ کہہ کر لے گئی کہ اس عورت، روشن کنور کا خاوند میرے پاس اسے نقد رقم کے عوض رہن رکھ گیا ہے، لہٰذا جب تک وہ نہ آئے، اسے محل میں رکھا جائے۔ بادشاہ نے اسے اپنے وزیر گل فیل شیر کی بیوی کے پاس بطور مصاحب کے رکھوا دیا۔ وزیر شاہی کام کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا،

پہلی ہی رات روشن میاں کا راز فاش ہو گیا۔ لیکن وزیر کی بیوی کے لچھن بھی خراب تھے۔ اس نے روشن میاں کی اصلیت کو چھپائے رکھا۔ جب وزیر آیا تو اس کی بیوی نے اسے قتل کر کے دفن کر دیا اور یہ ظاہر کیا کہ اس کا خاوند روشن کنور کے ساتھ فرار ہو گیا ہے۔ اب کٹنی شمسوددا روشن میاں کو ساتھ لیے بادشاہ کے سامنے فریادی ہوئی۔ آخر بادشاہ نے طے کیا کہ روشن میاں سے وزیر کی بیوی کا عقد کر دیا جائے۔ شمسوددا نے سوداگر روشن میاں کو تریاچرتر کا ایک اور تجربہ بھی کرایا اور اب کی بار بادشاہ کی بیٹی حبیبہ کے ساتھ اس کی شادی کروا دی۔ غرض ایک مدت کے بعد روشن میاں اپنی نئی بیگمات کو ساتھ لیے وطن واپس آیا۔ نئی بیگمات نے کہا کہ آؤ پہلے چل کر تمھاری پہلی بیوی کا حال دیکھ لیں۔ یہ رات کو چوری چھپے گھر پہنچے تو بیوی کو ایک حبشی کے ساتھ دادِ عیش دیتے ہوئے پایا۔ روشن میاں نے حبشی کا سر کاٹ لیا اور لوٹ آیا۔ صبح اپنی بیوی کو بلا بھیجا اور اس سے کہا کہ بیوی، تمھاری فرمائش پر میں ''تریاچرتر'' لایا ہوں۔ یہ صندوق کھول کر دیکھ لو۔ بیوی نے صندوق کھولا تو اپنے آشنا حبشی کا سر پایا۔ کچھ برسوں کے بعد روشن میاں وفات پا گیا اور اس کی بیگمات نے بھی اُس کی یاد میں گھل گھل کر جان دی۔

خاتمے کے اشعار یہ ہیں:

شعباں کی چاند رات کو قصہ کے تئیں پورا کیا
سنیو تمھیں اے دوستاں کریو مرے حق میں دُعا
آخوند جمال الدین تو قصہّ کے تئیں کردے ختم
احمد نبیؐ کے نام پر بھیجو دروداں اور سلام[45]

ایک مثنوی طوطی نامہ، جعفر علی حسرت سے بھی منسوب ہے۔ لیکن

۴۵ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، گجرات کی مثنویاں مشمولہ نوائے ادب جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۱۸ (یہ اشعار مثنوی کی بحر میں نہیں ہیں)

مشہور شک سپ تتی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کا ذکر شمالی ہندستان کی مثنویوں کے ذیل میں آگے کیا جائے گا۔

مثنوی چندا اور لورک (مینا ستونتی) غواصی

چندا اور لورک کے اس لوک قصے کو سب سے پہلے مُلا داؤد نے بعہد سلطان فیروز شاہ ۷۸۹ھ میں "چندائن" کے نام سے نظم کیا۔ اس کی زبان اودھی ہے۔ لیکن اسے فارسی رسم الخط میں لکھا گیا۔ مصنف نے یہ کتاب جوناشاہ وزیر اعظم فیروز شاہ کو پیش کی تھی۔

عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے اور اس کی حیرت انگیز مقبولیت کے بارے میں ایک روایت بھی نقل کی ہے:

"در ۷۷۲ھ خانجہاں وزیر وفات یافت و پسرش جوناشاہ نام بہماں خطاب مخاطب گشت و کتابِ چندائن را کہ مثنوی ست بزبان ہندوی در بیان عشق لورک و چندا نام عاشق و معشوق والحق خیلی حالت بخش است، مولانا داؤد بنام او نظم کردہ و از نہایت شہرت دریں دیار احتیاج تعریف ندارد و مخدوم شیخ تقی الدین واعظ ربانی در دہلی بعضی ابیات تقریبئے اورا بر منبر میخواند و مردم را از استماع آں حالت غریبہ روی میداد۔ چوں بعضے افاضل آں عہد شیخ را پرسیدند کہ سببِ اختیارِ این مثنویِ ہندوی چیست؟ جواب داد کہ تمام آں حقائق و معانی ذوقیست و موافق بوجدان اہل شوق و عشق و مطابق بہ تفسیر بعضی از آیات قرانی و خوش آوازانِ ہند۔ حالا ہم بسواد خوانیِ آں صید و لہامی نمایند"۔[۴۶]

ملا داؤد کی اس مثنوی کا ایک ناقص نسخہ خانقاہ منیر شریف (پٹنہ)، ایک کالا بھون بنارس اور ایک لاہور میں ہے۔ بمبئی میوزیم کا نسخہ نسبتاً زیادہ اوراق پر مشتمل ہے۔ ان سب کو کتابی صورت میں آگرہ ہندی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ شائع کر رہا ہے۔[۴۷]

---

۴۶ منتخب التواریخ جلد اوّل، ص ۲۵۰

۴۷ معاصر ۱۶، ص ۶۵

اس قصے سے متعلق بھاشا کی دوسری روایت سادھن نامی ایک شاعر کی ہے، جس نے اسے "میناست" کے نام سے قلمبند کیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ خانقاہ منیر شریف پٹنہ میں محفوظ ہے۔ حال ہی میں یہ قصہ کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔

فارسی کی اولین روایت "ملک الشعرا حمید" کی ہے، جس نے اسے جہانگیر کے عہد میں نظم کیا۔ اس فارسی مثنوی کا نام "مینا و لورک" ہے اور اس کا قلمی نسخہ علی گڑھ یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اغلب ہے کہ غواصی نے اپنی دکنی مثنوی کا قصہ اسی فارسی روایت سے لیا ہو۔

غواصی کے علاوہ دکنی اُردو میں اسے ایک اور شاعر مہدوی نے بھی بطور مثنوی نظم کیا ہے۔ اس کا نام بھی "مینا و لورک" ہے۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ بمبئی یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ کل اوراق ۲۳، آغاز:

سُنیا ہوں کہ یک شہر کا تاجدار
دھری مال ہور مملکت بے شمار [۴۸]

مثنوی لورک چندا غواصی خاصی مشہور رہی ہے۔ اس کے پانچ نسخے کتب خانہ سالار جنگ[۴۹] میں اور دو انڈیا آفس میں[۵۰] ایک کتب خانہ آصفیہ[۵۱] میں اور ایک نسخہ انجمن ترقی اردو ہند کے کُتب خانے میں موجود ہے۔[۵۲] انجمن کے فہرست نگار نے غلطی سے اسے کسی دکھنی شاعر علی وجودی کی تصنیف بتایا ہے۔ انجمن کے نسخے پر کہیں سالِ تصنیف یا سالِ کتابت درج نہیں۔ غالباً یہ ۱۶۴۰ء (۱۰۵۰ھ) سے پہلے لکھی جاچکی تھی۔

یہ مثنوی ہنوز زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ اس میں مینا نامی ایک

---

۴۸ بمبئی نمبر ۴۵، ص ۱۱۷

۴۹ سالار جنگ، صفحہ ۵۹۱

۵۰ بلوم ہارٹ، انڈیا نمبر ۷۷ اور ۷۸

۵۱ آصفیہ جلد ۴ نمبر ۳۴۴، مثنویات اردو

۵۲ کتب خانہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ، قلمی مثنویات ۲۷/۹۲

خاتون کے ستونت یعنی عصمت پرور رہنے کی داستان بیان کی گئی ہے۔ قصّے کا خلاصہ یہ ہے:

بادشاہ بالا کنور کی بیٹی چندا ایک گوالے لورک نامی پر عاشق ہو گئی اور اس کے ساتھ فرار ہونے کا ارادہ کیا۔ لورک نے اول تو انکار کیا۔ کیونکہ اس کی اپنی بیوی ستونت، سیرت و صورت کی خوبیوں سے متصف تھی، لیکن زر و جواہر کا لالچ بُرا ہوتا ہے۔ آخر ایک دن وہ چندا کے ساتھ بھاگ گیا۔ بالا کنور نے اس کا انتقام لورک کی بیوی مینا سے لینا چاہا اور بذریعہ کٹنی اس کے وصال کا طالب ہوا۔ مینا بڑی باعصمت تھی، راضی نہ ہوئی۔ آخر ہار کر بالا کنور نے لورک کو خط لکھا اور اسے بلا بھیجا۔ چندا کو اس کے جرم کی سزا دی اور مینا کی عزت افزائی کی۔ مینا اور کٹنی کی گفتگو میں کئی حکایتیں بھی آئی ہیں اور نصیحتیں بھی۔ مثلاً والدین کو چاہیے کہ بچوں کو نیک اور شریف عورت کا دودھ پلائیں، شریفوں کی صحبت میں رکھیں، اچھی تعلیم دیں، اچھے شخص سے شادی کریں وغیرہ۔

مثنوی میں اول حمد و نعت ہے۔ پھر خلفائے راشدین اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ کی مدح ہے۔ مصنف نے صراحت کی ہے کہ قصّہ فارسی سے لیا گیا ہے۔ قصّے کی فضا سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی میں اس قصّے کی بنیاد کسی ہندستانی لوک قصّے پر رکھی گئی ہوگی۔ آغاز:

کروں حمد میں پاک رحمان کا   کہ او حمد ہے زیور ایمان کا
جمیع حمد اس کو سزاوار ہے   کہ جس جگ کوں پیدا کرن ہار ہے

خاتمہ:

ستر عیب اس کوں یو پوشت میں   کتیں عیب اس میں دیکھیں تمن
مرتب کیا یاں سے قصہ تمام   جو بولو نبی پر درود و سلام[۵۳]

---

۵۳   سالار جنگ، صفحہ ۵۹۱

کنور منوہر اور مدھومالت

اردو میں جو ہندستانی لوک کہانیاں مثنوی کے پیرائے میں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے ایک کنور منوہر اور مدھومالت کے عشق کا یہ قصہ بھی ہے۔ اس کی اصل کسی سنسکرت کتاب تک نہیں پہنچتی۔ خیال ہے کہ یہ قصہؔ ان لوک کہانیوں پر مبنی ہوگا، جنھیں قدیم زمانے میں کتھک سنایا کرتے تھے۔ اولاً کسی شخص شیخ منجھن نے اسے ہندی میں لکھا تھا۔ یہ کتاب اب تک دستیاب نہیں ہوئی۔ ”وارڈ نے لکھا ہے کہ ایک کتاب مدھومالتی جے پوری بولی میں ہے۔“[۵۴] غالباً وہ یہی ہے۔ بعد کے ایک فارسی نسخے میں جو ۱۰۵۹ھ میں لکھا گیا ہے، مصنف نے وضاحت کی ہے کہ اس نے یہ قصہؔ شیخ منجھن کی ہندی کتاب سے ترجمہ کیا۔ (ملاحظہ ہو، روایتِ اول، فارسی اور اردو نسخے)

منجھن کی ”مدھومالتی“ کا چونکہ ابھی تک کوئی مکمل نسخہ دستیاب نہیں ہوا، اس لیے اس کا سنہ تصنیف معلوم نہیں۔ رام چندر شکل کی رائے ہے کہ یہ سمت ۱۵۵۰ اور ۱۵۹۵ کے درمیانی زمانے میں لکھی گئی ہوگی۔

”مدھومالتی“ کا ذکر جائسی نے ”پدماوت“ اور عثمان نے ”چتراولی“ میں کیا ہے۔[۵۵]

قصہ

راجا بکرم کو دنیا کے تمام عیش و آرام میسر تھے۔ لیکن اس کی رانی بانجھ تھی۔ ایک دن ایک فقیر نے اس بنا پر خیرات لینے سے انکا کردیا کہ راجا لاولد ہے۔ راجے کے دل پر چوٹ لگی اور وہ راج پاٹ رانی کو دے کر جنگلوں میں چلا گیا۔ راہ میں ایک باغ نظر آیا، جس میں ایک حوض تھا۔ یہاں پریاں

---

۵۴ تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی از دتاسی، اشاعت اول، صفحہ ۳۹۹، تلخیص و تبصرہ از قاضی عبدالودود، معاصر ۱۱، صفحہ ۱۱۹

۵۵ ہندی ساہتیہ کا اتہاس، ص ۹۱

نہانے کے لیے آئیں۔ راجا نے ان کا لباس چھپا دیا اور اسے واپس کرنے سے پہلے پریوں سے مدد کا وعدہ لے لیا۔ پریوں نے اسے اپنے بال دیے، جنھیں جلانے پر وہ حاضر ہو جائیں گی۔ اسی جنگل میں راجا کو ایک سادھو ملا جس نے مراد پانے کے لیے بکرم کو ایک پھل دیا۔ بکرم نے گھر آکر وہ پھل رانی کو کھلایا۔ راجا کی امید بر آئی اور کنور منوہر پیدا ہوا۔ پنڈتوں نے بتایا کہ چودہ برس کی عمر میں اس پر بھاری بپتا پڑے گی۔ قسمت کا لکھا ہو کر رہا۔ پریاں سوتے میں کنور کو اٹھا لے گئیں اور کماری مدھومالتی کے پہلو میں لٹا دیا۔ نظریں چار ہوتے ہی دونوں تیر عشق سے گھائل ہوئے لیکن آنکھ لگتے ہی پریوں نے انھیں پھر جدا کردیا۔ اب ہجر و فراق اور رنج و غم کا سلسلہ شروع ہوا۔ کنور منوہر، کماری مدھومالتی کی تلاش میں وطن سے نکلا۔ مدتوں دشت و بیاباں کے تنکے چننے، جھکڑوں اور طوفانوں کا مقابلہ کرنے، پریوں اور جنوں سے واسطہ پڑنے، پرندوں سے مدد لینے، ہزاروں میلوں کی مسافت طے کرنے اور قدم قدم پر ہمّت و شجاعت سے کام لینے کے بعد کنور منوہر نے گوہر مقصود کو پالیا۔ شادی کے بعد مراجعت ہوئی۔ کنور منوہر راجا بنا اور دونوں ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

ایتھے نے نمبر ۸۰۳ پر "قصہ مدھومالت" کے جس نسخے کا تعارف کرایا ہے، وہ اس روایت سے مختلف ہے، جس کا ذکر ریو نے نمبر ۷۰۰ اور ۸۰۳ کے تحت کیا ہے۔ انڈیا آفس کے نسخے کا سنہ تصنیف یا سال کتابت معلوم نہیں۔ یہ فارسی نثر میں ہے اور اسی قصّے پر مبنی کسی فارسی مثنوی سے ماخوذ ہے۔ بقول ایتھے اس کے مآخذ میں وہ مثنوی بھی ہو سکتی ہے، جس کا تعارف برٹش میوزیم کی فہرست میں ریو نے نمبر ۷۰۰ اور ۸۰۳ پر کرایا ہے اور جو سنہ ۱۰۵۹ میں لکھی گئی۔

فارسی اور اردو نسخے

فارسی:

۱۔ مثنوی "قصہ مدھمالت" سنہ تصنیف ۱۰۵۹ھ۔ یہ مثنوی برٹش میوزیم میں منشی علی رضا کی بعض دوسری تصانیف کے مجموعے میں شامل ہے۔ مصنف نے صراحت کردی ہے کہ اس نے قصہ شیخ منجھن کی ایک ہندی کتاب سے لیا۔(۵۶)

۲۔ "مثنوی مہر وماہ" از عاقل خاں رازی عالمگیری۔ سنہ تصنیف ۱۰۶۵ھ۔ اس میں بھی قصہ منوہر و مدھومالت بیان کیا گیا ہے۔ رازی نے منوہر کو مختصر کرکے مہر کردیا ہے۔ اس مثنوی کے قلمی نسخے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں ہیں۔(۵۷)

۳۔ مثنوی کنور منوہر و مدھومالت (فارسی) برٹش میوزیم میں اس مثنوی کا صرف پہلا حصہ ناصر علی کے مجموعۂ مثنویات کے حاشیے پر درج ہے۔(۵۸) اس کا مکمل قلمی نسخہ بوہار لائبریری کلکتہ میں محفوظ ہے۔ ترقیمے میں اسے شیخ نور محمد کی تصنیف بتایا گیا ہے۔ سال اختتام ۱۰۵۹ھ اور اشعار کی تعداد تخمیناً ایک ہزار ہے۔ کل اوراق ۳۶(۵۹)

---

۵۶ ریو، ص ۸۰۳، برائے نسخ دیگر ایتھے، ص ۸۰۳ اور باڈلین، ص ۱۳۱۸
ایتھے نے نمبر ۸۰۳ پر "قصہ مدھومالت" کے جس نسخے کا تعارف کرایا ہے وہ اس روایت سے مختلف ہے جس کا ذکر ریو نے نمبر ۷۰۰ اور ۸۰۳ کے تحت کیا ہے۔ انڈیا آفس کے نسخے کا سنہ تصنیف یا سال کتابت معلوم نہیں۔ یہ فارسی نثر میں ہے اور اسی قصے پر مبنی کسی فارسی مثنوی سے ماخوذ ہے۔ بقول ایتھے اس کے ماخذ میں وہ مثنوی بھی ہوسکتی ہے، جس کا تعارف برٹش میوزیم کی فہرست میں ریو نے نمبر ۷۰۰ اور ۸۰۳ پر کرایا ہے اور جو سنہ ۱۰۵۹ھ میں تصنیف ہوئی۔

۵۷ ریو، ص ۶۹۹، ایتھے، ص ۱۴۳۴، ص ۱۶۳۶ اور ص ۱۶۳۷، اشپرانگر ص ۵۴۴

۵۸ ریو، ص ۷۰۰ الف

۵۹ بوہار، ص ۲۸۸، نمبر ۳۹۵

۴۔ ''مثنوی حسن و عشق'' از حسام الدین حصاری۔ سنہ تصنیف ۱۰۷۱ھ(۶۰)

۵۔ میکا و منوہر از مادھو داس گجراتی سنہ تصنیف ۱۰۹۸ھ، مخطوطہ انڈیا آفس۔(۶۱)

۶۔ قصہ مدھمالت، مصنف نامعلوم۔ نثری مخطوطہ انڈیا آفس۔(۶۲)

۷۔ پدماوتی و منوہر W. Pertsch کا برلن کیٹالاگ (ص ۹۲۹)(۶۳)

۸۔ منوہر و مدمالا 'قلمی' (مثنوی فارسی) از اصغری(۶۴)

۹۔ مثنوی منوہر و مدھمالت، قلمی (مجہول المصنف) مکتوبہ ۱۲۱۸ھ(۶۵)

اردو:

اردو میں اس قصے کو نصرتی نے ''گلشن عشق'' کے نام سے ۱۰۶۸ھ میں نظم کیا ہے۔ اس کے مخطوطات برٹش میوزیم(۶۶) باڈلین لائبریری(۶۷) اور انڈیا آفس(۶۸) میں محفوظ ہیں۔

مثنوی گلشن عشق کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ ٹیپو سلطان میں بھی تھا۔ اس میں مصنف کی تصویر بھی شامل تھی، جس میں وہ بقول اسٹوارٹ ''معمر معلوم ہوتا ہے اور اسے دراز ریش دکھایا گیا ہے''۔ مثنوی گلشن عشق کے ساتھ

---

۶۰ بحوالہ عبدالحق، مقدمہ مثنوی گلشن عشق، ص ۱۱

۶۱ ایتھے ۸۲۴، نیز باڈلین ۴۷۸

۶۲ ایتھے ۱۴۲۱

۶۳ بحوالہ باڈلین، ص ۱۳۱۹

۶۴ اسٹوارٹ، فارسی منظومات، ص ۷۳

۶۵ آصفیہ، جلد ۲، ص ۱۴۹۰

۶۶ بلوم ہارٹ، برٹش نمبر ۴۵، ص ۲۱

۶۷ باڈلین، ص ۱۲۹۱، نمبر ۲۳۲۰

۶۸ انڈیا نمبر ۲۴۸۶، ۲۶۲۱، ۱۴۳۴۔ نیز اشپرانگر ۶۳۰

اسی مخطوطے میں "گلدستہ عشق" کے نام سے مصنف کے قصائد اور غزلوں کا ایک مجموعہ بھی شامل تھا۔(۶۹)

مثنوی گلشن عشق کے آٹھ قلمی نسخے کتب خانہ سالار جنگ میں اور پانچ ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدر آباد میں محفوظ ہیں۔(۷۰) حال ہی میں (۱۹۵۲ء) یہ مثنوی بہ تصحیح و حواشی مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو، کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ موصوف نے اسے ایک قدیم نسخہ مکتوبہ ۱۰۹۳ھ کی بنا پر مرتب کی ہے۔

دتاسی نے لکھا ہے کہ میکنزی کے پاس بھی قصہ مدمالتی کا ایک نسخہ فارسی مع بندہائے ہندستانی تھا۔(۷۱)

خواجہ عشرت لکھنوی کا بیان ہے کہ بھگونت رائے راحت کاکوروی مصنف مثنوی نل دمن اردو نے "مثنوی مدہ مالتی" اردو میں بھی لکھی تھی۔(۷۲)

مثنوی گلشنِ عشق

کنور منوہر اور مدھومالتی کے قصے پر مبنی نصرتی کی یہ مثنوی اس کے ادبی کارناموں میں اونچا مقام رکھتی ہے۔ نصرتی کا پورا نام محمد نصرت تھا۔ اس نے تین عادل شاہی بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا اور بڑی عمر پائی۔ گلشنِ عشق کے علاوہ دو اور مثنویاں — علی نامہ اور تاریخ اسکندری اور غزلیات، قصائد وغیرہ کا ایک مجموعہ بھی اس کی تصانیف میں سے ہے۔ وفات ۱۰۹۵ھ۔(۷۳)

نصرتی نے قصہ کہاں سے لیا۔ اس سلسلے میں اس نے کوئی صراحت نہیں کی۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ یہ قصہ اس نے اپنے ایک دوست مسمّیٰ بنی ابن

---

۶۹ اسٹوارٹ، ص ۱۷۹، نمبر ۳، ۴

۷۰ ادارہ ادبیات جلد ۵، ص ۴۱

۷۱ تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی اشاعت اول (تلخیص از قاضی عبدالودود) معاصر ۱۱، ص ۱۱۹

۷۲ ہندو شعراء، ص ۶۱

۷۳ عبدالجبار ملکاپوری، تذکرہ شعرائے دکن، ص ۱۰۹۰

عبدالصمد کی ترغیب سے لکھا ہے۔ مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ اگرچہ سب کتابوں میں قصہّ ایک ہے، لیکن ہر مصنف نے کسی قدر ردوبدل یا اختصار سے بیان کیا ہے۔ ان سب میں گلشنِ عشق بہت جامع اور ضخیم ہے۔ نصرتی نے اصل قصے میں چنپاوتی اور چندر سین کی داستان ضمنی طور پر بڑی خوبی سے ملائی ہے۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ کس نے کس سے اس قصےّ کو لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں یہ قصہّ بہت مقبول اور مشہور تھا اور ہر مصنف نے اسے اس طرح بیان کردیا جیسا کہ مقامی طور پر مشہور چلا آرہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ عاقل خاں کو بھی قصہّ دکن ہی میں ملا ہے۔ جب عالمگیر برہان پور میں تھا تو وہ بھی وہیں تھا اور غالباً وہیں اس نے اپنی مثنوی لکھی۔ یہ ممکن ہے کہ نصرتی کی نظر سے عاقل خاں کی ''مثنوی مہر و ماہ'' گزری ہو۔ اور اس نے تصرف کر کے زیادہ پُر لطف بنا دیا ہو۔ یا جس طرح اس نے اپنے وطن میں یہ داستان سُنی ہو، اسی کو کسی قدر درست کر کے نظم کردیا ہو۔(۷۴)

عام لوک قصوں کی طرح اس قصےّ میں بھی فوقِ فطرت اور طلسمی باتیں پائی جاتی ہیں۔ قصہّ خالص ہندستانی ہے اور مصنف نے اپنے ذاتی اعتقادات کی بنا پر اس میں کوئی رنگ آمیزی نہیں کی۔ اس مثنوی کی تہذیبی اہمیت تو ہے ہی، بعض خصوصیتوں کی بنا پر یہ مثنوی دکن کی بہترین ادبی مثنویوں میں بھی شمار کی جاسکتی ہے۔ مثنوی کی ابتدا حسبِ معمول حمد و نعت و مناجات سے ہوئی ہے۔ کچھ اشعار حضرت بندہ نواز کی تعریف میں ہیں۔ علی عادل شاہ کی طویل مدح ہے۔ چند شعر اپنے حسبِ حال ہیں۔ پھر عقل کی تعریف کی ہے اور قصہّ شروع ہو جاتا ہے۔ عنوانات بھی شعروں میں قائم کیے ہیں۔ ہر شعر میں پورے باب کا خلاصہ آجاتا ہے۔ ان سارے شعروں کو اگر ملا دیا جائے تو ایک قصیدہ بن جاتا ہے۔ بعد کے شاعروں نے اس روش کی پیروی کی ہے۔ نصرتی کو قدرتی نظاروں کے بیان میں خاص قدرت حاصل ہے۔ ہندستانی قصہ پھر ہندستان ہی کے نظارے، عجب

---

۷۴ نصرتی، صفحہ ۱۸، ۱۹

لطف پیدا ہوگیا ہے۔ سردی گرمی کی کیفیت، باغوں، پھولوں اور پرندوں چرندوں کا حال، کشتی کی روانی، کھانوں، ترکاریوں، پکوانوں اور پھلوں کی تفصیل اور چاندنی کا سماں جگہ جگہ خوب بیان کیا ہے۔ مثنوی کے ہر باب کا خاتمہ اخلاقی اشعار پر ہوتا ہے۔ نصرتی کو انسانی جذبات کی کیفیت دکھانے میں بھی کمال حاصل ہے۔ بہ قول مولوی عبدالحق: ''کلام میں طول ضرور ہے لیکن وہ ایک اُبلتا ہوا چشمہ ہے، جس کا روکنا مشکل ہے''۔ اس مثنوی میں ضمنی طور پر ہندستانیوں کے آداب و اطوار، طعام، لباس اور شادی بیاہ کی رسموں کا جو ذکر آگیا ہے، بہت اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں اپنے وطن اور اس کے تہذیبی اداروں سے کتنی گہری دلچسپی اور محبت ہے۔ ایک جگہ شادی کی مجلس میں راگ رنگ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مقام سے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:(۷۵)

طرب بخش مطرب بیٹھے تان اُچائیں سو گیانی بجا گیان سُور گن سے گائیں	سرور بخش مطربوں نے میٹھی تانیں لینی شروع کیں اور گیانی لوگوں نے گیان اور گن سے گانا بجانا شروع کیا۔
چتر نازنین پاتراں چھندباز جو تھیاں لاکھ خوبی سوں عاشق نواز	ہنرور جادو کار نازنین ناچنے والیاں، ہزار ہا خوبیوں سے عاشق کا دل چھیننے والیاں تھیں۔
لٹکتیاں چلیں چھب کی جب چاؤ سوں خمیں قد جو بن بار کے تاؤ سوں	جب وہ ناز و ادا سے مٹکتی چلتی تھیں تو جوبن کے بار سے ان کے قد خم ہو جاتے تھے۔
کیا یوں میٹھا راگ رنگ رس بھرا	جب میٹھا رسیلا راگ گایا تو سبک سیر

۷۵ مثنوی گلشن عشق، حوالہ ماسبق

بسر سُد سبک سیر چندر ہریا	چاند کی بھی عقل گم ہو گئی۔

مالتی کا سراپا ملاحظہ ہو

سہیں نرم کیس اس کے مفتول سیام سٹنہار زلفاں سوں بادل پہ دام	اس کی زلفیں نرم اور سیاہ ہیں اور وہ ان لمبی زلفوں سے بادل پر دام پھینکتی ہے۔
سرنگ مانگ یوں تِس میں دیوے شہود اچایا ہے جوں صبحِ صادق نمود	بالوں میں سیدھی مانگ یوں معلوم ہوتی ہے جیسے صبح کے وقت پو پھٹ رہی ہو۔
سدنگ دھار کھنڈے کی ناسک نول چنبے کی کلی زرد رُو جس اگل	نازک ناک سیدھی تلوار کی طرح ہے، جس کے آگے چمپے کی کلی کا حسن بھی ماند ہے
کلائی دیکھت نرم تس ہات کیچ کنول ڈال ڈوبے جھلوں جل کے بیچ	نرم نرم کلائی پہ انگلیاں یوں معلوم ہوتی ہیں جیسے پانی میں ڈوبی ہوئی ڈال پر کنول کا پھول۔
دیسے گنگ کا پیٹ پُر پیٹ ڈھال بہتا نیر سوتس میں چوٹی کے بال	اس کی پیٹھ گنگا کے پیٹ کی مثل ہے (جب پانی کم رہ جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ پیٹ تک ہے) مطلب یہ کہ اس کی زلف کے بال جو پیٹھ پر بکھرے ہوئے ہیں، مثلِ آب جاری ہیں۔

مثنوی ظفر نامہ عشق (قلمی) از سید مظفر تخلص بہ مظفر[۷۶]

شاعر کے حالات معلوم نہیں ہوسکے۔ البتہ مثنوی سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف اورنگ زیب کے زمانے میں موجود تھا اور اس کے والد کا نام سید ایوب شاہ تھا۔

شاعر نے صراحت کردی ہے کہ وہ فارسی قصہ "مہر و ماہ" دکھنی میں ترجمہ کرنا چاہتا تھا تاکہ ایک ایسی یادگار قائم ہوسکے، جسے پڑھ کر عاشق بے قرار ہوجائیں۔ لیکن فارسی قصہ غلط لکھا ہوا تھا۔ اس لیے شاعر نے اسے اپنے ذوق کے مطابق صحیح طور پر نظم کیا۔ مثنوی کے متعلقہ شعر یہ ہیں:

منگیا کرنے دکھنی سوں میں ترجمہ　　دِسیا قصہ فارسی مہر و ماہ
نہ کر ترجمہ فارسی کا ظفر　　سودِسے میں دل مجھ دیا یوں خبر
تو پڑھ دیکھ دل ہے ترا آرسی　　لکھا ہے غلط قصہ فارسی
ہے معنی بلیغ و عبارت فصیح　　لکھا ہوں غلط قصہ سراپا صحیح
مطالعہ کریں تا گدا ہور شاہ　　لکھا ہوں میں یہ قصہ مہر و ماہ
تجے عشق یاں عقل کائیں ہے کام　　رکھیا تو ظفر نامہ عشق نام

ان اشعار میں جس فارسی قصے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ غالباً عاقل خاں رازی کی فارسی مثنوی مہر و ماہ (۱۰۶۵ھ) ہے۔ اس مثنوی میں کنور منوہر اور مدھومالتی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہی کہانی تقریباً اسی طرح، جیسے اسے رازی نے نظم کیا ہے، چھے فارسی مصنفین اور ایک اُردو شاعر (نصرتی) نے بھی بیان کی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی اسے غلط نہیں بتایا۔ خیال ہے کہ سید مظفر کو قصہ کنور منوہر اور مدھومالتی کا ہندی رنگ پسند نہیں تھا اور وہ اُسے اسلامی داستان کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ مگر ایسا کرنے کے لیے قصے میں بنیادی تبدیلیاں کرنا ضروری تھا، جن کے نتیجے کے طور پر سید مظفر کا قصہ کنور منوہر کی

۷۶　سالار جنگ، ص ۶۱۶

اصل کہانی سے مختلف ہوگیا۔ چنانچہ اسے مستند اور معتبر تسلیم کرانے کے لیے اُس نے عاقل خاں رازی کی روایت کو غلط قرار دیا۔ حالانکہ اِس قصّے کی صحیح روایت وہی ہے جو رازی کے ہاں یا معمولی اختلاف سے نصرتی کے ہاں ملتی ہے۔ سید مظفر نے قصّے کے مقامی رنگ کو تبدیل کر دیا ہے۔ راجا کے بجائے بادشاہ، سادھو کے بجائے زاہد اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ راجا کی ابتدائی مشکلیں پریوں کی مدد سے نہیں، بلکہ غیب کی آواز کے ذریعے آسان ہوتی ہیں۔ سترہ برس کی عمر میں شاہزادہ دریا کے سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ اسی سفر کے دوران میں وہ عشق میں مبتلا ہوتا ہے اور کامیابی کی منزل تک پہنچتا ہے۔

اس مثنوی کے دو ناقص نسخے کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہیں۔[۷۷] ان میں سے ایک نسخہ ۱۲۲۰ھ میں لکھا گیا۔ اسی مثنوی کا ایک مکمل خطی نسخہ ۱۳۱۳ھ کا لکھا ہوا ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔[۷۸]

انھیں سید مظفر نے قصہ آفتاب بھی لکھنا شروع کیا تھا، لیکن مکمل نہ کر سکے۔[۷۹]

مثنوی سندر سنگار

از شاہ علی گجراتی، مکتوبہ ۱۷۱۹ء، کتب خانہ مانچسٹر، ہندستانی مخطوطات[۸۰]

مثنوی عود صندل

اس مثنوی کا مخطوطہ انجمن ترقی اردو کے کتب خانے کی ملکیت ہے۔[۸۱] دکھنی اردو میں یہ خالص ہندستانی قصہ ہے۔ مثنوی آخر سے ناقص ہے اور قصہ

۷۷ ایضاً

۷۸ ادارہ ادبیات جلد ۵، ص ۴۹

۷۹ ادارہ ادبیات جلد ۵، ص ۲۰۲

۸۰ بحوالہ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، معاصر نمبر ۱۰، ص ۷۲

۸۱ مثنوی عود صندل (قلمی) کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، نشان ۸۵ / ۶۴

ناتمام ہے (اوراق ۸) مصنف نے بعض جگہ اپنا تخلص امیری استعمال کیا ہے۔ مصنف کے بارے میں کوئی تفصیل حاصل نہیں ہو سکی۔ مثنوی سے سال تصنیف بھی نہیں کھلتا۔ زبان قدیم ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مثنوی شروع سترھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی ہوگی۔ سبب نظم کتاب:

گھِسوں صندل جو جگ ٹھنڈیک پاوے　　جلاؤں عود تیں اب باس آوے
مکدر ہے کلی جوں گل ہنسے نا　　جلے نہ عود اگر صندل گھسے نا

ہندستان میں ایک برہمن بادشاہ تھا اس کی بیوی نہایت حسین و جمیل تھی اور اس رعایت سے وہ صندل کہلاتی تھی۔ یہ برہمن زادی ایک نوجوان "عود" پر عاشق ہوگئی۔ چنانچہ:

نظر صندل کی جب ہوئی دیک پر عود　　لگی جلنے اگر مانند ہوئی دُود

اس کے بعد کے اوراق نہیں ہیں۔ آخری مصرع یہ ہے:

عجب بھانتوں جلے مل صندل و عود

مثنوی لعل و گوہر

قصہ لعل و گوہر کو حسین علی باشندہ سرنگاپٹنم نے فارسی میں نظم کیا تھا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ ٹیپو سلطان میں تھا۔ اسٹوارٹ کا بیان ہے کہ یہ ۱۷۷۸ء میں ٹیپو سلطان کو پیش کرنے کے لیے لکھا گیا۔(۸۲) اس مثنوی کا ایک مخطوطہ انڈیا آفس لندن میں بھی محفوظ ہے۔ سنہ تصنیف ۱۱۹۲ھ ہے۔ ایتھے نے مصنف کا نام "حسن علی عزت" لکھا ہے۔(۸۳)

اردو میں یہ مثنوی ۱۱۲۹ھ سے قبل ایک دکنی شاعر عارف الدین خاں

۸۲　اسٹوارٹ، فارسی منظومات، ص ۴۷

۸۳　ایتھے نمبر ۱۷۱۷، ص ۹۳۱

عاجز[۸۴] نے لکھی۔ اس کا قصہ اندر سبھا کی طرز کا ہے۔ شہزادہ لعل بنگال کے بادشاہ زمردرو کا بیٹا تھا۔ ایک رات جب وہ سو رہا تھا تو اوپر سے پریوں کا تخت گزرا۔ پریوں کے بادشاہ کی لڑکی گوہر شہزادے کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گئی۔ پلنگ اٹھوا منگوایا۔ مدتوں پریشان رہنے اور مشکلیں سہنے کے بعد آخر دونوں کی شادی ہوئی اور لعل، گوہر کو لے کر وطن واپس آیا۔

اس مثنوی کے مخطوطے یورپ اور ہندستان کے کتب خانوں میں عام ملتے ہیں۔[۸۵] یہ مثنوی مدراس سے ۱۸۷۳ء اور بمبئی سے ۱۸۷۷ء میں شائع ہو چکی ہے۔[۸۶]

عارف الدین خاں عاجز کی مثنوی کا ایک قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، مکتوبہ ۱۲۳۱ھ، اوراق ۱۶[۸۷]

نیز ملاحظہ ہو، اشپرانگر ص ۵۹۹۔ آغاز:

الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی[۸۸]

اس مثنوی کا ایک ایڈیشن مصطفائی پریس، مظفر نگر سے بھی شائع ہوا تھا۔ یہ ہماری نظر سے گزرا ہے۔ اس پر سال طباعت کہیں درج نہیں۔ مثنوی کا

---

۸۴ عارف الدین خاں عاجز، اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ آصفی عہد میں فوج میں ملازم تھے۔ مثنوی لعل و گوہر کے علاوہ ایک دیوان بھی یادگار ہے۔ ۱۷۶۴ء (۱۱۷۸ھ) میں انتقال کیا۔ (چمنستان شعرا اور گل عجائب) دیوان کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ (فہرست مخطوطات اردو سالار جنگ۔ صفحہ ۶۳۶) نسخہ دیگر ادارہ ادبیات اردو، مخطوطہ نمبر ۱۲۸ ب

۸۵ بلوم ہارٹ انڈیا نمبر ۱۱۰، مکتوبہ ۱۱۲۹ھ اوراق ۳۰ نیز ادارہ ادبیات نمبر ۵۸۳، آصفیہ میں تین اور سالار جنگ میں آٹھ مخطوطات محفوظ ہیں۔ سالار جنگ ص ۶۳۶

۸۶ یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۵۲۵، ۵۲۹ نیز سالار جنگ، ص ۶۳۶

۸۷ نمبر ۵۸۱/۲۶

۸۸ اشپرانگر نمبر ۵۹۰ نیز گارساں دتاسی، تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی جلد اول، ص ۱۶۹ اور ۶۱۹ بحوالہ بلوم ہارٹ انڈیا نمبر ۱۱۰، اسٹوارٹ، ہندی اور دکھنی مخطوطات، ص ۱۸۰، نمبر ۱۲

نام بھی لعل و گوہر کے بجائے لال و گوہر لکھا ہوا ہے۔[۸۹] شاعر کا نام سرورق یا خاتمے پر کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ البتہ بعض اشعار میں عارف الدین خاں عاجز نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے:

ارے عاجز یہاں تو لال کو چھوڑ   سخن کے سنگ سے ہیرے کا سر پھوڑ

....

ارے عاجز یہ کیا ہے گا بکھیڑا   کہ تو ہیرا کا پھر افسانہ چھیڑا

یہ مثنوی ۳۲ صفحوں پر شائع ہوئی ہے اور ہر صفحے میں ۱۷ اشعار ہیں۔ اس مثنوی کے جتنے قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں ان میں خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے:

الٰہی عاشقوں کی آبرو رکھ   انوں کوں دوجہاں میں سرخرو رکھ[۹۰]

لیکن زیر نظر مطبوعہ نسخے میں اس شعر کے بعد "معرفت" کے عنوان سے کسی دوسرے شاعر کے ۳۲ شعر ازائد ملتے ہیں۔ اس شاعر کا تخلص امین تھا جو یوں استعمال ہوا ہے:

اٹھا اب تو اپنا قلم اے امیں   دعا اپنے خالق سے بس ہے یہی (کذا)

عاجز نے مثنوی کا خاتمہ عاشق و معشوق کی کامیابی اور کامرانی پر کیا ہے۔ امین خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ دونوں میں ایک بار پھر جدائی ہو جائے۔ ہجر و فراق کے ایسے ایسے صدمے اٹھانے پڑیں کہ روح جسم سے الگ ہو جائے۔ قبر و حشر کے مراحل کامیابی سے طے ہوں اور اس کے بعد "قاضی حاجات رب العلا" عاشق سے اس کا معشوق ملا دے اور دونوں کو جنّت نصیب ہو۔ اس حالت میں مثنوی کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے:

میں چاہوں ہوں جو درسے تیرے ملے   مرا بھی کہیں غنچۂ دل کھلے

---

۸۹   چمنستان شعرا: "لعل و گوہر" ص ۴۶۶؛ قلمی نسخہ ادارہ ادبیات "لال و گوہر" جلد سوم ص ۱۷۶

۹۰   ملاحظہ ہو ادارہ ادبیات ۳ ص ۱۷۷، یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۵۲۸، سالار جنگ ۶۳۶

ہوئی مثنوی اب(یہ) بالکل تمام ترا شکر پیمبر کو تیرے سلام (کذا)

عارف الدین خاں عاجز کا نمونہ کلام یہ ہے:

گئی جب رات گھٹ گھٹ کر عدم سے کھلا غنچہ نسیم صبحدم سے
جگی گوہر نہ دیکھا یار مونس اور آنکھوں کو جو کھولے مثل نرگس
حکایت رات کی کر یاد روئی کہے میں نیند پاکر لال کھوئی

اس مثنوی کے قصے کو نوشیرواں جی مہربان جی آرام نے اُردو میں منظوم ڈراما کے طور پر لکھا ہے، جو بمبئی سے شائع ہوا۔ اس سے پہلے ڈھاکہ میں یہ کسی دوسرے ڈراما نگار کے نام سے اسٹیج کیا جاچکا ہے۔ بعد ازاں آرام نے اس کو اپنے نام سے تمثیل کیا اور طبع کرایا۔[۹۱] اسی قصے کو بنیاد بنا کر محمد مراد علی مراد لکھنوی شاگرد حسینی میاں ظریف نے بھی ایک اُردو ڈراما لکھا۔[۹۲]

مثنوی نیہ درپن

یہ قصہ سید احمد ہنر نے ۱۷۳۱ء (۱۱۴۴ھ) میں لکھا۔ ہنر سید محمد عشرتی کے فرزند اور سرکار آصفیہ کے منصب داروں میں شامل تھے۔ اس مثنوی کا قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ ہنر نے اسے ابن نشاطی کی پھول بن کے جواب میں لکھا تھا:

مجھے ابن نشاطی کا سخن خوب لگیا دل میں بہت محبوب و مرغوب
کتاب اس کی جو ہے نام اس کا پھلبن نزاکت کی ہے وہ گلبن کا گلشن
مجھے جو دھانوں اس کا خوب آیا قلم کوں بھی اسی گت پر نچایا
وہ گلشن کا رکھیا جو نانوں پھلبن رکھیا میں ناؤں اس کا نیہ درپن

---

۹۱ اُردو ڈراما، عشرت رحمانی، ص ۲۰۱ اور ۲۰۴

۹۲ ایضاً ص ۲۴۱

بقول شمس اللہ قادری اس مثنوی میں راجہ راج کنور اور رانی کملتا دیوی (کام لتا دیوی) کا فسانہ مذکور ہے۔ ہنر نے صراحت کردی ہے کہ یہ قصہ اس نے کسی فارسی داستان سے لیا۔ لیکن اس کے ہندستانی الاصل ہونے میں شک نہیں۔ ملاحظہ ہو:

"ایک بادشاہ تھا جس کے پاس زرو جواہر، خزائن اور افواج سبھی کچھ تھا، مگر اولاد نہ تھی۔ ایک فقیر سے وہ دعاؤں کا طالب ہوا۔ دن رات اسی فکر میں بسر ہوتے۔ آخر فقیر کی دُعا قبول ہوئی اور اس کے لڑکا پیدا ہوا۔ لڑکا بڑا ہوکر سیر و شکار میں مصروف رہنے لگا۔ بالآخر خواب میں ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر وہ اس پر عاشق ہوگیا۔ عشق سے اس کی حالت دگرگوں ہونے لگی۔ علاج معالجہ کیا، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آخر ایک برہمن آیا۔ اس نے شہزادے کے دل کا بھید معلوم کرنے کی کوشش کی اور شہزادے کے عشق سے واقف ہوگیا۔ شہزادہ لڑکی کی تلاش میں روانہ ہوا۔ اس کے بعد صدہا مصائب اور طلسم کشائی وغیرہ کے بعد مقصد حاصل ہوا اور شہزادہ خواب کی معشوقہ کے وصل سے شاد کام ہوکر وطن واپس آیا"۔

آغاز:

الٰہی، یا الٰہی، یا الٰہی ۔۔۔ تجے ساجے جگت کی بادشاہی
تکبر ہور منم ہے تج سزاوار ۔۔۔ کہ نہیں کوئی دوسرا تج سا کرتار

اختتام:

خداوند! طفیل اپنے نبیؐ کے ۔۔۔ نبیؐ کے ہور شہ مرداں علیؓ کے
مرا کر خاتمہ بالخیر یارب ۔۔۔ دُنیا اور دین کے کاماں بنے سب[۹۳]

۹۳ اردوے قدیم صفحہ ۱۰۰ اور فہرست سالار جنگ صفحہ ۶۲۹

مثنویات کامروپ اور کلاکام

یہ ہندستان کا نہایت قدیم اور ہر دلعزیز قصہ ہے۔ گارساں دتاسی اس کے بارے میں کہتا ہے: "یہ عجیب قصہ ہے اور ہندستانی نظم و نثر میں بہت سے مصنفوں نے اسے لکھا ہے۔ ... کہتے ہیں کہ سندباد کا قصہ جو الف لیلہ میں ہے اور سن بران دین کا قصہ جو میری دی فرانس کی تالیف ہے، ان کی اصل یہی ہے"۔[۹۴] دتاسی اس قصے کے عاشقوں میں سے تھا۔ اس نے اپنے خطبات میں اس کی بار بار تعریف کی ہے اور وہ اسے Ulysses سے تشبیہہ دیتا ہے۔[۹۵] اس کی نظر سے اس قصے کے فارسی اور اردو کے کئی نسخے گزرے تھے۔ لیکن وہ ان سب میں سے تحسین الدین کی مثنوی کو بہترین قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس نے اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں Les Adventures de Kamrup کے نام سے کیا جو پیرس سے ۱۸۳۴ء میں شائع ہوا۔[۹۶] اس کے ساتھ ساتھ ۱۸۳۵ء میں دتاسی نے تحسین الدین کی مثنوی کا دکھنی متن بھی شائع کیا۔[۹۷] یہ نسخہ ای برٹرنڈ کی فرہنگ کے ساتھ ۱۸۵۹ء میں پھر شائع ہوا۔[۹۸] کامروپ کے فرانسیسی ترجمے سے تقریباً چالیس برس پہلے ڈبلیو فرینکلن اس قصے کو انگریزی میں ترجمہ کرکے ۱۷۹۳ء میں لندن سے شائع کرچکا تھا۔[۹۹] ڈبلیو فرینکلن کا انگریزی ترجمہ بہ تصحیح و تحشیہ مہابھارت دت، بردوان سے دوبارہ ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا۔[۱۰۰] انگریزی کا

---

۹۴ دتاسی، خطبات، ص ۱۵۵

۹۵ ایضاً، ص ۲۹۱

۹۶ بلوم ہارٹ، برٹش کتب، ص ۸۸

۹۷ ایضاً، ص ۳۳۰، قصہ کام روپ کے ایک نادر نسخے کی نقل موسیو ٹرویر سکریٹری ہندو کالج کلکتہ نے دتاسی کو بھجوائی تھی (زور، گارساں دتاسی، ص ۴۷)

۹۸ بلوم ہارٹ برٹش، ص ۳۳۱

۹۹ بحوالہ بانکی پور VIII، ص ۱۸۳

۱۰۰ آربری، ص ۴۱۷

ایک مختصر ایڈیشن ۱۸۸۹ء میں کلکتے سے شائع ہوا۔[۱۰۱] جرمنی زبان میں قصہ کامروپ کی تمہید کا ترجمہ پروفیسر Rose Garten نے کیا تھا جسے نامور گوئٹے نے دیکھا اور بے انتہا لطف اٹھایا۔ گوئٹے نے اس نظم کی تعریف میں لفظ — Unchatzbare استعمال کیا ہے۔[۱۰۲]

کامروپ کے قصّے کو پنجابی زبان میں احمد یار نے نظم کیا۔ یہ قصہ ۱۸۷۵ء میں امرتسر میں اشاعت پزیر ہوا۔[۱۰۳] ہندی میں اسے "کہانی کلاکام کی" کے نام سے شیام لال چکرورتی نے نظم کیا۔ یہ کتاب اعظم گڑھ سے ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی۔[۱۰۴] یہی قصہ ہندی نثر میں فیروز آباد کے کشیتر پال شرما نے بھی لکھا جو کلکتہ سے ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا۔[۱۰۵]

کامروپ کے فارسی اور اُردو نسخوں کی تفصیل یہ ہے:

فارسی نسخے

۱۔ قصہ کامروپ (نثر) از میر محمد کاظم حسینی، متخلص بہ کریم۔ یہ عبداللہ قطب شاہ (۷۲۔۱۶۲۶ء) کا ملازم تھا۔ ریو کا بیان ہے کہ کریم نے قصہ سنسکرت سے لیا۔[۱۰۶] میر محمد کاظم حسینی کی فارسی مثنوی قصہ کامروپ، دہلی سے ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ مطبوعہ نسخہ انڈیا آفس لندن میں موجود ہے۔[۱۰۷]

۲۔ قصہ کامروپ (نثر) از ہمّت خاں میراں بن اسلام خاں

---

۱۰۱ بلوم ہارٹ، برٹش ضمیمہ، ص ۴۴۶

۱۰۲ تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی (دتاسی) تلخیص و تبصرہ از قاضی عبدالودود، معاصر شمارہ ۱۱، ص ۱۲۲

۱۰۳ انڈیا پنجابی، ص ۲۱

۱۰۴ انڈیا ہندی، ص ۶۸

۱۰۵ ایضاً، ص ۱۶۲

۱۰۶ ریو، ص ۷۶۳، برائے نسخ دیگر، ایتھے ۸۲۱، ۸۲۲۔۲۸۵۵۔۵۷

۱۰۷ آربری، ص ۴۱۷

ہمّت خاں کا پورا نام یوں ہے :

"میر عیسٰی بن اسلام خاں مشہدی المخاطب بہ ہمت خاں"(۱۰۸)

ہمت خاں میراں کے قصہء کامروپ و کام لتا (فارسی نثر) کا ایک قلمی نسخہ ادارۂ "ادبیات اردو" حیدر آباد کے کتب خانے میں بھی ہے۔ سنہ کتابت ۱۲۶۱ھ بمقام حیدر آباد، اوراق ۱۳۵ (۱۰۹)

ہمت خاں عہد عالمگیری کے ایک میر منشی تھے (وفات ۱۰۹۲ھ) نسخۂ بانکی پور مکتوبہ ۱۱۵۹ء(۱۱۰) میر عیسٰی، میرن تخلص کرتے تھے۔

۳۔ مثنوی دستور ہمت از مراد۔ تذکرہ شمع انجمن میں میر محمد مراد کا تخلص لائق بتایا گیا ہے۔(۱۱۱) مثنوی دستور ہمت کے ایک شعر میں بھی یہ تخلص موجود ہے :

بیا لائق سخن را مختصر کن
زِدل اندیشۂ دیگر بدر کن(۱۱۲)

مثنوی دستورِ ہمت کا ایک قلمی نسخہ ادارۂ ادبیات اُردو، حیدر آباد کے کتب خانے میں بھی محفوظ ہے۔ یہ مخطوطہ ناقص الطرفین ہے اور موجودہ حالت میں ۱۱۴ اوراق پر مشتمل ہے۔(۱۱۳)

مراد ہمت خاں کا ملازم تھا۔ اپنی مثنوی میں اس نے وضاحت کردی ہے کہ میرے مربی ہمت خاں نے قصہّ کامروپ کو فارسی نثر میں لکھا۔ چونکہ یہ قصہّ اسے بہت پسند تھا، اس لیے اس نے مراد سے اس کے نظم کرنے کی فرمائش

---

۱۰۸ مآثر الامراء، جلد ۳، ص ۹۴۶

۱۰۹ ادارہ ادبیات جلد ۵، ص ۴۶

۱۱۰ بانکی پور VIII نمبر ۷۴۳، ص ۱۸۲، باڈلین: ۱۳۲۷، اشپرانگر ۴۵۶

۱۱۱ شمع انجمن، ص ۴۱۱

۱۱۲ پنجابی قصے فارسی زبان میں، ص ۱۰۰

۱۱۳ ادارہ ادبیات پنجم، ص ۴۷

کی۔ مگر افسوس کہ مثنوی کی تکمیل سے پہلے ہمت خاں کا انتقال ہو گیا۔ اشپرانگر اسے ہمت خاں، لائق بن اسلام خاں کی مثنوی قرار دیتا ہے[۱۱۴] جو غلط ہے۔ سنہ تصنیف ۱۰۹۶ھ[۱۱۵]

دتاسی نے بھی مثنوی دستورِ ہمت کو غلطی سے ہمت خاں سے منسوب کیا ہے۔[۱۱۶]

۴۔ مثنوی فلک اعظم، از انجب، بدیع العصر، حاجی ربیع، سنہ تصنیف ۱۱۵۷ھ۔ مکتوبہ ۱۱۷۳ھ[۱۱۷]

۵۔ مثنوی کامروپ از منشی علی رضا، مکتوبہ ۱۱۹۲ھ[۱۱۸] کیپٹن — John Ritchie کی فرمایش پر "ہندوی" سے ترجمہ کیا گیا۔

۶۔ قصہ کامروپ از کوڑامل (المتوفی ۱۸۴۸ء) یہ کتاب مصنف کے فرزند کالی رائے ڈپٹی کلکٹر نے دہلی سے ۱۲۶۵ھ میں شائع کی۔ صفحات ۱۳۶[۱۱۹]

قصہ کامروپ فارسی کے دو نثری نسخے دتاسی کے پاس تھے۔ اس کا بیان ہے کہ اس قصے کا ایک مصور نسخہ موسیو Jomard نے شاہی کتب خانہ پیرس میں جمع کرایا تھا۔[۱۲۰] مثنوی کامروپ فارسی کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ، حیدر آباد میں بھی محفوظ ہے۔[۱۲۱]

۷۔ بندرابن داس خوشگو سے روایت ہے کہ قصہ کام روپ و کام لتا

---

۱۱۴ اشپرانگر، ص ۵۷۴

۱۱۵ ریو، ص ۶۹۷

۱۱۶ دتاسی، خطبات، ص ۱۵۵

۱۱۷ ریو، ص ۷۱۱

۱۱۸ ریو، ص ۸۰۳

۱۱۹ اشپرانگر، ص ۶۰۴

۱۲۰ تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی (دتاسی) بحوالہ معاصر شمارہ ۱۱، ص ۱۳۲

۱۲۱ کتب خانہ سالار جنگ، فن نظم فارسی، نمبر ۶۹۵

کوگر بخش حضوری شاگرد بیدل نے مثنوی شیریں خسرو کے انداز پر لکھا تھا۔[122] اس تذکرے کی تصنیف کے وقت یہ مثنوی مکمل نہیں تھی۔ یہ تذکرہ ۱۱۳۷ھ سے ۱۱۴۷ھ تک زیرِ تصنیف رہا ہے۔

تذکرہ گل رعنا (قلمی، مکتوبہ ۱۱۸۶ھ) میں بھی اس مثنوی سے متعلق یہ عبارت ملتی ہے: "گر بخش حضوری ...... تربیت یافتہ مرزا بیدل ...... قصہ ہندی تعشق کامروپ و کام لتا در زمین شیریں خسرو گفتہ ...... ہنوز ناتمام است"۔[123]

۸۔ قصہ کامروپ وکام لتا کو شیخ حسام الدین حسامی (پدر سراج الدین آرزو) نے بھی نظم کیا تھا۔ شفیق اورنگ آبادی نے ان کے ترجمے میں لکھا ہے۔ "قصہ کام روپ و کام لتا، از افسانہاے مشہور ہنداست، منظوم ساخت"۔[124]

۹۔ قصہ کامروپ و لتا رام (فارسی نثر) مجہول المصنف۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں تھا۔[125]

۱۰۔ مثنوی کامروپ و کام لتا (فارسی) از علی شیر قانع ٹھٹھوی (پیدایش ۱۱۴۰ھ) انھوں نے اپنی فارسی تاریخ تحفۃ الکرام کے دیباچے میں اپنی منظوم اور نثری تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے یہ مثنوی جو تقریباً ۳۰۰۰ ابیات پر مشتمل ہے، ۱۱۶۹ھ میں لکھی۔[126]

۱۱۔ مثنوی کنور کام وکلا کام (قلمی) از پریا داس۔ یہ فارسی مثنوی بمقام الہٰ آباد تصنیف ہوئی اور ۷/ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ کو الہٰ آباد کے انگریز ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں پیش کی گئی۔ کل صفحات ۱۰۱ ہیں اور ہر صفحے میں تقریباً ۱۳ شعر ہیں۔ ترقیمہ: "نسخہ قصہ کنور کام و کلا کام من تصنیف بابو پریا داس از دستخط خام

---

۱۲۲ تذکرۂ سفینۂ خوشگو (۳) ورق ۲۱۳ الف، بحوالہ بانکی پور ج ۸، ص ۱۱۴

۱۲۳ گل رعنا قلمی ورق ۵۶۷ الف

۱۲۴ تذکرہ گل رعنا قلمی ورق ۱۷۸ اب

۱۲۵ استوارٹ، فارسی قصص، ص ۸۵

۱۲۶ ریو، الف ۸۴۶ اور الف ۸۴۸

بندہ نیاز خصال کنھیا لعل بتاریخ پانزدہم شہر محرم الحرام ۱۲۳۰ھ باتمام رسید۔

بر پشت بیاض می نویسم   ایں قطعہ زبہر یاد گاری
شاید کہ بایں بہانہ روزے   برخط نگری و یادم آری[۱۲۷]

۱۲۔ انڈیا آفس لائبریری میں ایک مجہول الاسم اور مجہول المصنف قلمی فارسی مجموعے میں سترہویں قصے کا عنوان یہ ہے:

"در بیان راجہ سدھر ما والیِ ملک کامرو (پ)"[۱۲۸]

۱۳۔ کامروپ و کام لتا (فارسی) مجہول المصنف، تعداد صفحات ۷۳، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۸۹ء[۱۲۹]

اردو نسخے

۱۔ مثنوی کام روپ اور کلا کام از تحسین الدین۔ گارساں دتاسی کے پاس تحسین الدین کی مثنوی کے دو قلمی نسخے تھے، ان میں مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۱۷۰ھ بتایا گیا ہے، جس کے اعداد "گل و خوش بہار" سے حاصل کیے گئے ہیں۔[۱۳۰] تحسین الدین کی مثنوی کا مراد کی فارسی مثنوی دستور ہمت سے ترجمہ ہونا خلاف قیاس ہے۔ کیونکہ مراد کی مثنوی میں شہزادی کا نام "کام لتا" آیا ہے۔[۱۳۱] اس کے برعکس تحسین الدین کے ہاں محبوبہ کا نام "کلا کام" بتایا گیا ہے۔ تحسین کی مثنوی کے دو مخطوطے انڈیا آفس میں،[۱۳۲] ایک کتب خانہ

---

۱۲۷ لکھنؤ، ص ۲۵ نمبر شمار ۱۹۵، بہ شکریہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

۱۲۸ ایتھے نمبر ۱۹۹۴

۱۲۹ آر بری، ص ۱۴۷

۱۳۰ بلوم ہارٹ انڈیا نمبر ۱۲۶

۱۳۱ بانکی پور، جلد ۸، ص ۱۸۳

۱۳۲ بلوم ہارٹ انڈیا نمبر ۱۲۶ اور ۱۲۷

مانچسٹر میں،[۱۳۳] اور ایک انجمن ترقی اردو، علی گڑھ میں محفوظ ہے۔[۱۳۴] سال تصنیف ۱۱۷۰ھ ہے۔

۲۔ کامروپ، نظمِ اردو، از ضیغم[۱۳۵]

۳۔ کامروپ، نظمِ اردو، از آرزو[۱۳۶]

۴۔ کامروپ، نظمِ اردو، از حسن[۱۳۷]

۵۔ کامروپ، نظمِ اردو، از سراج[۱۳۸]

۶۔ مرغوب الطبع (نثر) از سید حسین علی خاں حیدر آبادی (قلمی) ادارۂ ادبیات اردو، حیدر آباد، سنۂ تصنیف ۱۲۴۸ھ ہے۔[۱۳۹]

۷۔ نسخہ نثر (دکھنی اردو) مصنف نامعلوم (سنہ تصنیف غالباً ۱۲۱۱۔۴۸ھ) مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ، حیدر آباد۔[۱۴۰]

۸۔ قصۂ کامروپ (نثر) از کندن لال (سنہ تصنیف ۱۸۴۹ء)

یہ کتاب مراد کی فارسی مثنوی "دستورِ ہمت" کے پہلے باب کا ترجمہ ہے۔[۱۴۱]

۹۔ قصہ کنور کام روپ از کمال خاں عرف منے خاں (قلمی) یہ مخطوطہ ۱۹۱۴ء میں کتب خانۂ آصفیہ میں موجود تھا اور اس کا ذکر کتب خانے کی وضاحتی

---

۱۳۳ بحوالہ مختار الدین آرزو، کتب خانہ مانچسٹر کے بعض مخطوطات، مشمولہ معاصر ۱۰، ص ۲۷

۱۳۴ مثنوی کام روپ اور کلاکام (قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ، نشان ۵۶۶/۱۳ نیز دیکھو اشپرانگر، ص ۶۳۹

۱۳۵ دتاسی، خطبات، ص ۱۵۵

۱۳۶ ایضاً

۱۳۷ ایضاً

۱۳۸ ایضاً

۱۳۹ ادارہ ادبیات، جلد اول، ص ۱۶۴

۱۴۰ سالار جنگ، نمبر ۹۱۷، ص ۳۳۷

۱۴۱ بلوم ہارٹ، برٹش ضمیمہ، ص ۱۷۱

فہرست مطبوعہ ۱۳۳۳ھ میں ملتا ہے۔[۱۴۲] لیکن اب معلوم کرنے پر پتا چلا ہے کہ اسے ۱۹۳۷ء میں کتب خانہ ہذا کے ذخیرے سے خارج کردیا گیا"۔

۱۰۔ مثنوی کام روپ و کام لتا (قلمی) مجہول المصنف، اوراق ۸۱، فی صفحہ ۱۵ سطریں، ادارۂ ادبیات اردو، حیدر آباد۔[۱۴۳]

زیر نظر مثنوی میں محبوبہ کا نام ہر جگہ کام لتا لکھا ہوا ہے نہ کہ کلا کام۔ اس نسخے میں ابتدائی چند ابیات محفوظ نہیں ہیں۔ یہ مخطوطہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

یہ لولاک و یٰسین و طٰہٰ عظیم   کہا حق میں ان کے خدائے کریم
بہار ادب ان پہ ہے جاوداں   جو باغ ازل کے ہیں سردار واں

ذکر احوالِ پدر کامروپ

قصہ کام لتا اور کنور کامروپ   تو سن بعد اس کے ارے خوش سروپ
میں دیتا ہوں حالت سے اسکے نشاں   اول سُن تو اس کے پدر کا بیاں
اودہ نامی اک ملک رنگیں بہار   اتھا گرد میں ہند کے آشکار

یہ نسخہ نہایت عمدہ دیسی کاغذ پر شکستہ آمیز خطِ نستعلیق میں غالباً ۱۲۰۰ھ کے قریب نقل کیا گیا ہے۔ ابتدائی ایک ورق اس میں محفوظ نہیں۔ بحالت موجودہ اس میں دو ہزار چار سو ابیات ہیں۔ اس کا اختتام ان ابیات پر ہوتا ہے:

رکھو سایہ میں اپنی بے شک و شباہ   کہا اپنی خدمت میں اس کوں اے شاہ
توں کر خوش رضا سے بھی رخصت مجھے[۱۴۴]   دیا خوش رضا سے میں اُس کوں تجے

اس مخطوطے میں چونکہ ابتدائی اور آخری اشعار نہیں ہیں، اس لیے مصنف کا نام اور سنہ تالیف معلوم نہیں ہوسکا۔ ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ یہ

---

۱۴۲   آصفیہ جلد ۲، ص ۱۲۸۴، قصص اردو نمبر ۶۳

۱۴۳   ادارہ ادبیات جلد ۵، ص ۴۴، نمبر ۹۰۲

۱۴۴   ایضاً، ص ۴۴، ۴۵

مثنوی تحسین الدین کی تصنیف ہے[۱۴۵] حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ تحسین الدین کی مثنوی مطبوعہ پیرس کا ایک نسخہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدر آباد میں محفوظ ہے۔[۱۴۶] ان دونوں کے اشعار کا تقابلی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ ادارۂ ادبیات کا نسخہ تحسین الدین کی مثنوی سے بالکل مختلف ہے۔ نیز تحسین کے ہاں محبوبہ کا نام ''کلا کام'' ہے اور نسخۂ ادارہ کی مثنوی میں اسے ہر جگہ ''کام لتا'' لکھا ہے۔ ممکن ہے یہ مثنوی کمال خاں عرف منے خاں کی تصنیف ہو یا ان چار شاعروں میں سے کسی ایک کا نتیجۂ فکر ہو، جن کا ذکر گارساں دتاسی نے کیا ہے۔[۱۴۷] لیکن ان مثنویوں میں سے کسی کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں۔ اس لیے نسخۂ ادارہ کے مصنف کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

میر داستاں کا نام مختلف روایتوں میں ''کنور کامروپ''، ''راج کنور''، ''کنور''، ''کامرو'' مختلف طرح سے آیا ہے۔ اسی طرح کسی نے محبوبہ کو ''کلا کام'' کسی نے ''کام کلا'' کسی نے ''کام لتا'' کسی نے ''لتا رام'' کسی نے ''کملتا دیوی'' اور کسی نے فقط ''کلا'' لکھا ہے۔

۱۱۔ مثنوی نیہ درپن از سید احمد ہنر (قلمی) ۱۱۴۴ھ کتب خانہ سالار جنگ، حیدر آباد۔[۱۴۸] (اس مثنوی کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا جاچکا ہے) فی الاصل یہ مثنوی بھی قصہ کامروپ پر مبنی ہے۔ شہزادے کا نام ''راج کنور'' اور شہزادی کا ''کملتا دیوی'' بتایا گیا ہے۔ باقی قصہ وہی ہے جسے تحسین نے ہنر کی مثنوی کے ۲۶ برس بعد ۱۱۷۰ھ میں نظم کیا۔ ہنر نے صراحت کر دی ہے کہ اس نے یہ قصہ فارسی روایت سے لیا۔

۱۲۔ مثنوی کامروپ اور کلا کام (اُردو) کے ایک ناقص الآخر قلمی نسخے

---

۱۴۵ ادارہ ادبیات جلد پنجم، ص ۴۴

۱۴۶ آصفیہ جلد ۳، ص ۵۲۶، قصص اردو نمبر ۱۸۹

۱۴۷ خطبات، ص ۱۵۵

۱۴۸ فہرست سالار جنگ، ص ۶۲۹

کا ذکر پروفیسر اختر اورینوی نے بھی کیا ہے۔ یہ مخطوطہ پٹنہ کے ایک سپاہی پیشہ شخص کی ملکیت تھا۔[۱۴۹]

۱۳۔ قصہ کامروپ و کام کلا اُردو (قلمی) ذخیرہ پنڈت اودے شنکر شاستری۔ یہ مخطوطہ اُردو نمائش پٹنہ منعقدہ ۱۹۵۹ء میں پیش کیا گیا۔

مثنوی کام روپ اور کلا کام از تحسین الدین

تحسین الدین کی یہ مثنوی یورپ میں بہت مشہور رہی ہے۔ دتاسی اس کے قصے کو عجیب و لاجواب کہتا ہے۔ اس کا بیان ہے: "ایک اعتبار سے اس قصے میں ہمارے لیے علم الانسان کی معلومات پوشیدہ ہیں۔ ممکن ہے کہ اس مضمون کی خاص کتابوں میں ہمیں اس قدر مواد نہ ملے جتنا کہ اس قصّے سے۔ اس قسم کی خیالی کہانیاں ہمیں اہلِ مشرق کی زندگی سمجھنے میں بہت مدد دے سکتی ہیں۔[۱۵۰]

یورپ میں تحسین الدین کی اس مثنوی کے تین اڈیشن شائع ہوئے۔ ہندستانی متن ۱۸۳۵ء میں، فرانسیسی ترجمہ ۱۸۳۴ء میں اور متن مع فرہنگ ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا۔ دتاسی نے اس مثنوی کا خلاصہ اپنے دسویں خطبے میں بیان کیا ہے۔[۱۵۱]

اس مثنوی کا ایک نسخہ نوابانِ اودھ کے کتب خانے میں تھا۔[۱۵۲] انڈیا آفس میں اس کے دو مخطوطے ہیں۔ ایک کا سنہ کتابت ۱۱۹۳ھ ہے (اوراق ۳۸)۔[۱۵۳] کتب خانہ مانچسٹر کا قلمی نسخہ ۱۲۲۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔[۱۵۴] ہندستان میں اس مثنوی کا صرف ایک مخطوطہ دستیاب ہوا ہے جو انجمن ترقی اردو ہند، علی

---

۱۴۹ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، ص ۳۱۹

۱۵۰ دتاسی، خطبات، ص ۳۰۲

۱۵۱ دتاسی، خطبات، ص ۲۹۱

۱۵۲ اشپرانگر، ص ۶۳۹

۱۵۳ بلوم ہارٹ، انڈیا نمبر ۱۲۷

۱۵۴ بحوالہ معاصر ۱۰، ص ۷۲

گڑھ کی ملکیت ہے۔[۱۵۵] سنہ کتابت ۱۲۲۱ھ ہے اور اوراق ۴۸ ہیں۔ مثنوی میں مصنف نے کہیں اپنا نام اور تخلص نہیں لکھا۔ اس مثنوی سے متعلق محمد ابرار حسین فاروقی ازہری کا ایک مضمون رسالہ معاصر شمارہ ۳ میں شائع ہوا تھا (ص ۱۴۵) اور موصوف نے درخواست کی تھی کہ ناظرین معاصر، مصنف کے نام، تخلص اور سالِ تصنیف کا پتا چلائیں۔ دتاسی نے اس مثنوی کا جو متن شائع کیا تھا، وہ ہندستان میں دستیاب نہیں، نہ ہندستان کے کسی کتب خانے میں اس مثنوی کے کسی دوسرے مخطوطے کا ہمیں علم ہے۔ اس لیے قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ نسخۂ انجمن تحسین ہی کی تصنیف ہے۔ البتہ قرائن اس کے حق میں ہیں۔ دتاسی کا بیان ہے کہ یہ مثنوی دکھنی زبان میں ہے۔[۱۵۶] نسخۂ انجمن کی زبان بھی دکھنی ہے۔ دتاسی نے قصے کا جو خلاصہ اپنے دسویں خطبے میں بیان کیا ہے[۱۵۷] وہ بنیادی طور پر نسخۂ انجمن سے ملتا جلتا ہے۔ دونوں نے کامروپ کے باپ کا نام مہاراجہ پت لکھا ہے۔ دونوں اسے اودے پور کا حکمران بتاتے ہیں۔ شہزادے کی پیدائش دتاسی بھی فقیر کے دیے ہوئے پھل کا نتیجہ بتاتا ہے۔ دونوں کہانیوں میں چھ وزیروں اور ان کے چھ بیٹوں کا ذکر آیا ہے جو شہزادے کے ہمجولی تھے۔ دونوں کے ہاں کامروپ بارہ برس کی عمر میں عشق کا شکار ہوتا ہے اور دونوں کے ہاں ہیروئن سراندیپ کی شہزادی ہے۔ اس گہری مطابقت کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ نسخۂ انجمن، تحسین الدین ہی کی تصنیف ہے۔ اگر یہ مثنوی کسی دوسرے مصنف کا نتیجۂ فکر ہوتی تو قصہ بالکل یہی نہ ہوتا۔ کیونکہ قدیم زمانے میں جب ایک ہی روایت پر مختلف شاعر طبع آزمائی کرتے تھے، تو قصے کو تازہ اور رنگین بنانے کے لیے مرکزی کرداروں اور مقامات کے ناموں اور بعض جزئیات میں تغیر و تبدل ضرور کرلیتے تھے۔ ایسی کسی تبدیلی کی غیر موجودگی میں انجمن

---

۱۵۵ نشان ۱۳/۵۶۶

۱۵۶ دتاسی، خطبات، ص ۲۹۱

۱۵۷ ایضاً، ص ۲۹۲/ ۳۰۳

کے نسخے کو تحسین الدین سے منسوب کرنا قرینِ قیاس ہے۔

تحسین الدین کی مثنوی کا وہ مطبوعہ نسخہ جسے گارساں دتاسی نے ۱۸۳۵ء میں پیرس سے شائع کیا تھا، بعد میں مجھے اسٹیٹ سنٹرل لائبریری، حیدر آباد میں دستیاب ہوگیا۔[۱۵۸] انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ کے قلمی نسخے[۱۵۹] سے اس کے مقابلے کے بعد اب یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ نسخۂ انجمن تحسین ہی کی مثنوی ہے اور تحسین کی مثنوی کا یہ واحد مخطوطہ ہے جو ہندستان کے کسی کتب خانے میں محفوظ ہے۔

قصے کا خلاصہ

اودے پور کے راجا (اصل مثنوی میں اودھ پور[۱۶۰] لکھا ہوا ہے۔ گارساں دتاسی نے اسے "ملک اودھ" بتایا ہے[۱۶۱] جو غلط ہے) "راج پت" کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے سادھوؤں، سنیاسیوں کی دعوت کی۔ ایک درویش نے اسے "شری" پھل دیا، جسے کھانے سے رانی سندر روپ کا پاؤں بھاری ہوگیا۔ چونکہ راجا کے چھ وزیر بھی لاولد تھے، ان کی بیگمات نے بھی یہ پھل چکھا اور مقررہ میعاد کے بعد سبھوں کے ہاں لڑکے پیدا ہوئے۔ شہزادے کا نام کامروپ (کامروپ دراصل دریاے برہم پتر کی وادی میں صوبہ آسام کے ایک علاقے کا نام ہے۔ اس کے شمال میں بھوٹان اور جنوب میں کھوسی کی پہاڑیاں واقع ہیں جو جنگلات سے ڈھکی ہوئی ہیں) رکھا گیا۔ پنڈتوں نے جنم پترا دیکھ کر بتایا کہ بارہ برس کے بعد شہزادے کے گرہ بھاری ہیں اور بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ شہزادے کو ایک عالی شان محل میں وزیروں کے چھے بیٹوں کے ساتھ رکھا گیا اور ان کی تربیت اور نگہداشت کے بہترین انتظامات کیے گئے۔

---

۱۵۸ آصفیہ، جلد ۳، ص ۵۲۶ قصص اردو نمبر ۱۸۹

۱۵۹ مثنوی کام روپ اور کلام کام (قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ نشان ۵۶۶/۱۳

۱۶۰ مثنوی تحسین الدین مخطوطہ علی گڑھ، ورق ۳ الف

۱۶۱ خطبات، ص ۲۹۲

لیکن ہونی ہو کے رہی۔ بارہ برس کی عمر میں ایک روز کامروپ نے خواب میں ایک شہزادی کو دیکھا، جو حسن و جمال میں یکتائے روزگار تھی۔ اس کا چہرہ کنول کا سا، آنکھیں ہرنی جیسی اور گردن ہنس کی سی تھی۔ حسنِ اتفاق کہ اسی روز شہزادی کلا کام نے بھی شہزادے کام روپ کو خواب میں دیکھا اور اس پر دل و جان سے فدا ہو گئی۔

کام روپ کی آنکھ کھلی تو اس کی دنیا بدل چکی تھی۔ اس پری چہرہ بتِ طناز کی یاد اسے رہ رہ کے ستانے لگی اور وہ ہزار کوشش کے باوجود بھی اسے بھلا نہ سکا۔ شہزادے کے دن پریشانی اور راتیں بے خوابی میں گزرنے لگیں۔ آخر وزیر زادے کے ذریعے بادشاہ پر یہ راز کھلا تو وہ بہت سٹ پٹایا۔ ملک ملک کے پردیسیوں، جوگیوں اور فقیروں کو دعوت دی گئی کہ کوئی شہزادی کا پتا بتا سکے۔ آخر سُمت نامی ایک برہمن نے جو سراندیپ کا رہنے والا تھا، کلا کام کا اتا پتا دیا۔ یہ برہمن دراصل کلا کام ہی کا بھیجا ہوا تھا۔ غرض شہزادہ کام روپ مع چھے رفیقوں کے، سُمت کے ہمراہ سراندیپ کو روانہ ہوا۔

دور دراز کا سفر تھا، سمندر پار کرتے ہوئے طوفان کا سامنا ہوا، اور جہاز پاش پاش ہو گیا۔ ایک کو ایک کی خبر نہ رہی۔ کامروپ تختے کے سہارے بہتا ہوا کنارے پر آلگا۔ رات جنگل میں گزری۔ یہ تریا راج رانی راوتا کا مقام تھا جو شہزادے پر عاشق ہو گئی اور دونوں مل جل کر رہنے لگے۔ شہزادہ کلا کام کو بھول چلا تھا کہ ایک رات وہ خواب میں آئی اور کام روپ کو سخت سُست کہا۔

اس واقعے کے بعد کامروپ راوتا کے چنگل سے نکل بھاگا۔ لیکن ایک پری کی ہوس کا شکار ہوا۔ یہاں سے ایک حاسد راکشس نے اسے سمندر میں پھینک دیا اور وہ سراندیپ کے کنارے جا لگا۔ اس جزیرے میں تسمہ پا رہتے تھے، جو کامروپ کے کاندھے پر سوار ہو کر اسے کوڑے مار مار کر ہانکنے لگے۔ کامروپ نے انگوروں کا رس نکال کر شراب بنائی، جسے پی کر تسمہ پا مدہوش ہو گئے۔ کامروپ اور دوسرے گرفتار لوگوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور تسمہ پاؤں

کو چن چن کر قتل کیا اور بھاگ نکلے۔ ان آزاد ہونے والوں میں وزیر کا بیٹا
مترچند بھی تھا۔ اسے ایک دیو نے گرفتار کرلیا تھا، جو بعد میں اس کا ہمدرد بن گیا
اور اپنے بالوں کے ذریعے ضرورت کے وقت مدد دینے کا مدعی ہوا۔ ابھی
مترچند اور کامروپ باتیں کررہے تھے کہ ان کا تیسرا ساتھی بھی آملا۔ یہ توتے
کی شکل میں تھا اور پاؤں کا دھاگا کھولنے پر انسان بن گیا۔ وہ ایک پری کا شکار رہا
جس کی قید سے آخر وہ اڑ نکلا تھا۔ اسی اثنا میں انھیں وہ برہمن بھی ملا، جس کے
پراسرار پھل کی بدولت کامروپ اور اس کے چھ ہمجولی پیدا ہوئے تھے، اس نے
انھیں سنگِ کیمیا دیا تاکہ شہزادہ غربت اور افلاس کے عالم میں پریشان نہ ہو۔

چند دنوں بعد شہزادے کے باقی ساتھی بھی مل گئے۔ ان میں سے ایک
نقاش تھا اور ایک طبیب۔ دونوں بادشاہ کامراج کے دربار میں ملازم ہوگئے تھے۔
نقاش نے شاہی محل میں نقش و نگار بنائے اور طبیب شہزادی کلا کام کا علاج کرتا
رہا۔ اس نے بادشاہ کو بتایا کہ شہزادی مرضِ عشق میں مبتلا ہے۔ بادشاہ نے نقاش
سے شاہی محل میں جگہ جگہ کامروپ کی تصویریں بنوائیں، جنھیں دیکھ کر کلاکام
کے مرض میں کچھ کمی ہوئی۔ آخر سوئمبر منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ کامروپ نے
اپنے ایک ساتھی کو توتا بناکر شہزادی کے پاس بھیجا کہ وہ اس رسم کے موقع پر
فقیر کے بھیس میں آئے گا۔ چنانچہ جب شہزادی نے موتیوں کا ہار بجائے
راجاؤں، مہاراجوں کے ایک فقیر کے گلے میں ڈالا تو اس کے باپ کامراج کے
غصّے کی انتہا نہ رہی۔ لیکن دیو کے بالوں اور سنگِ کیمیا کی مدد سے کامروپ نے آناً
فاناً شہزادوں کی سی دولت و حشمت اور شان و شوکت پیدا کرلی۔ کامراج کو جب
شہزادے کی اصلیت معلوم ہوئی تو بڑا خوش ہوا۔ غرض اس طرح مدتوں کی
جدوجہد کے بعد کامروپ اور کلاکام اپنے ارادوں میں کامیاب ہوئے۔

....

تحسین الدین کی مثنوی حسبِ معمول، حمد و نعت سے شروع ہوتی ہے۔

الٰہی بجق توں ہی کرتار ہے　　دو عالم کا پیدا کرن ہار ہے
نہ کوئی کرے تیری قدرت بیاں　　نہیں علم تیرا کسی پر عیاں

اس کے بعد چند اشعار عشق کی تعریف میں ہیں۔ مثنوی کی زبان دکھنی ہے لیکن ادق اور مشکل نہیں۔ شاعر کے انداز بیان میں سادگی، لطافت، روانی اور صفائی ہے۔ وہ قصّے کی دلچسپی ہر جگہ قائم رکھتا ہے اور مناظر و واقعات کو اچھوتے اور دلکش انداز میں بیان کرنے پر قادر ہے۔ بعض تشبیہات جدت و ندرت کا پتا دیتی ہیں۔ شہزادی کلا کام کے سراپا سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سکچتی چلے چال وہ پگ اُٹھائے　　بجیں پگ میں گھنگھرو محل چھن چھنائے
بھریں ہاتھ مہندی کے وہ لعل لال　　بھریں کیس موتی گُندھے بال بال
دو نینوں میں کاجل دیے من ہرن　　مسی مل کے نیلی پھرے وہ پرن
سُرج دیکھ صورت کھڑا تھرتھرائے　　چندرماں بدن دیکھ کر مکھ چھپائے

کامروپ کے کامران و کامیاب واپس آنے پر:

سُنی فوج کی راج پت نے خبر　　کہا اپنے دیوان کو دیکھ کر
بلا کر کرم چند دیوان کوں　　کہا فوج میں جا کے پہچان توں
کہاں کا مہاراج کیا نام ہے　　اودے پور میں آیا ہے، کیا کام ہے
کہو جاکے کس دیس میں تم رہو　　کنور کامرو کی خبر کچھ کہو

یہ دراصل کامروپ کی فوج تھی، مدتوں کے بچھڑے ملے، کامروپ نے اپنی دشت نوردی اور کامیابی کی داستان سنائی، بالآخر:

بتھا سن مہاراج نے تب کہا　　کرم میں ترے تھا یہی دُکھ بدا
بہت دھیان کرکے کیا تھا جتن　　کہ تجھ پر نہ آئے برہ کی کٹھن
کبھی فکر اور عقل سے کچھ نہ ہوئے　　بدھاتا جو چاہے کرے سوئی سوئے
رہو سکھ میں خوش ہوکے اپنے نگر　　کرو راج اب بیٹھ کر بے فکر

خاتمہ:

کرے عِشق اس طرح سیں جو کوئی   نہیں شک یقیں اولیا وہ جو ہوئی
مقرر ہے محنت میں راحت ملے   ورے نیک بختی بہ طاعت ملے[۱۶۲]

نسخہ پیرس میں مثنوی کا نام ”قصۂ کامروپ و کلا“ درج کیا گیا ہے۔ مقدمہ اور متن ۵۸ + ۹۶ صفحات میں شائع ہوا ہے۔ اس کے دائیں جانب کے سرورق کی بجنسہ نقل یہ ہے:

قصہ کامروپ و کلا
کہ جو
تحسین الدین نے
تصنیف کی
اب
غرسین دتاسی کا
تصحیح کیا ہوا
شہر پاریز کی
پادشاہی چھاپی خانی میں چھاپا گیا ھی
سنہ ۱۸۳۵ عیسوی
مطابق سنہ ۱۲۵۱ ہجری کی

آغاز:

الٰہی بجق تو کرتار ہے   دو عالم کا پیدا کرنہار ہے
نکوئ کرے تیری قدرت بیاں   نہیں علم تیرا کسی پر عیاں

عنوانات فارسی میں ہیں۔ پہلا باب یوں شروع ہوتا ہے: ”در ذکر

۱۶۲ مثنوی کام روپ اور کلا کام (قلمی) انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، نشان ۱۳/۵۶۶

نمودن سدا برت و آمدن فقیر چرم پوش و دادن سری پھل و خورانیدن رانی و تولد شدن کنور کامروپ"۔

سنو اب کتھا عشق کے نام کی — کنور کام رو اور کلا کام کی
اودھ پور رکھتا تھا وہ راج پت — کہیں نام اس کا مہاراج پت
رہے راج پت نت اسی فکر سے — کہ دیوے خدا ایک فرزند اسے

کنور کامروپ کے ماں باپ سے بچھڑنے اور سفر پر روانہ ہونے کا منظر:

سندر روپ نے تب گلے سے لگا — گلے سیں لگا کر کنور سے کہا
تو جاتا ہے ماتا[۱۶۳] کے تئیں چھوڑ کر — کنور جاشتابی سیں پھریو ایدھر
بلا کر سندر روپ نے تب کہی — لیادیں کنور کے شکن[۱۶۴] کی دہی
دہی لے کے ماتا نے ٹیکا دیا — شگن میں کنور کوں بدا تب کیا
کنور نیں[۱۶۵] لیا کونچ[۱۶۶] اودھ پور سوں — چلا اب خوشی ہو سراندیپ کوں

....

کنور کوں خبر کچھ نہ دن رات کی — اُسے تھی وہی دھن اُسی بات کی
کنور تب وہ بانمہن[۱۶۷] سے بولا بچن — کلاکام کا اب کہاں ہے وطن
کنور کچھ نہ آرام پر چیں[۱۶۸] کرے — کلاکام کا نام سمرن کرے
کلاکام کی بات بھاوے اسے — کلا بن نہ کچھ بات آوے اُسے
چلا کوچ در کوچ واں سے کنور — گیا چند مدّت میں ہجلی[۱۶۹] نگر

تحسین الدین نے مثنوی کا خاتمہ دعائیہ اشعار پر کیا ہے، چند ملاحظہ ہوں:

---

۱۶۳ ماتا — ۱۶۴ شگن
۱۶۵ نے — ۱۶۶ کوچ
۱۶۷ برہمن — ۱۶۸ چین
۱۶۹ ہگلی

مری آل اولاد کو شاد رکھ　　مرے دوستوں کو تو آباد رکھ
میں کھاتا ہوں جس کا نمک اے کریم　　سدا رحم کر اس پہ تو اے کریم
جیوں آبرو اور حرمت کے ساتھ　　رہوں میں عزیزوں میں عزت کے ساتھ
برآویں مرے دین و دنیا کے کام　　بحق محمد علیہ السلام(۱۷۰)

شمالی ہندستان کی مثنویاں

مثنویات سنگھاسن بتیسی

سنگھاسن بتیسی ۳۲ کہانیوں کے اس مجموعے کا نام ہے جو راجا بکرماجیت کے جودوسخا اور ہمّت و شجاعت کے بارے میں زمانۂ قدیم سے مشہور رہی ہیں۔ ان کی اصل سنسکرت ہے۔ ایتھے سنسکرت نسخے کا نام ''سنہاسن ادواترنشتی'' بتاتا ہے۔(۱۷۱) لیکن دتاسی نے سنگھاسن بتیسی کا ماخذ سنسکرت کتاب ''وکرماچرترم'' کو قرار دیا ہے۔(۱۷۲) سنسکرت میں تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی کے لکھے ہوئے متعدد نسخے ملتے ہیں۔ ہندستان کی مختلف علاقائی زبانوں، خصوصاً بنگالی، مراٹھی میں بھی سنگھاسن بتیسی کے تراجم ملتے ہیں۔ برج بھاشا میں سنگھاسن بتیسی کو سندر داس کبیشر نے ۱۶۳۱ء کے لگ بھگ لکھا۔(۱۷۳) فارسی میں اس کے ۹ اور اردو میں ۸ نسخوں کا علم ہے، جن کی وضاحت آگے کردی گئی ہے۔ جرمن، فرانسیسی اور انگریزی میں بھی ان کہانیوں کے تراجم شائع ہوئے ہیں۔ جرمن ترجمہ جلگ (۱۸۶۸ء) سے منسوب ہے۔ فرانسیسی زبان میں ترجمہ Boron Lescallier نے کیا۔ یہ ۱۸۱۷ء میں نیویارک سے شائع ہوا۔(۱۷۴) R. Roth

۱۷۰　مثنوی کام روپ وکلاکام از تحسین الدین، مطبوعہ پیرس ۱۸۳۵ء، ص ۹۶
۱۷۱　ایتھے، ص ۱۹۸۸
۱۷۲　تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی (تبصرہ و تلخیص) معاصر ۱۱، ص ۱۲۸
۱۷۳　بلوم ہارٹ، برٹش کتب، ص ۱۶۴
۱۷۴　ریو، ۷۶۳، نیز دتاسی، تاریخ ادبیات، حوالہ ماسبق، ص ۳۱۰

نے سنگھاسن بتیسی کا خلاصہ ژورنال (۱۸۴۵ء) میں پیش کیا تھا۔[۱۷۵] دتاسی نے اپنے دسویں خطبے (۱۸۶۰ء) میں کہا ہے کہ "Fitz E. Hall نے حال ہی میں سنگھاسن بتیسی کا ایک ایڈیشن شائع کیا ہے۔[۱۷۶] انگریزی کے دوسرے ترجمے Miss Busk اور ایڈگرٹن کے ہیں۔[۱۷۷] فرینکلن ایڈگرٹن نے چار مختلف نسخوں کی مدد سے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا۔ یہ ترجمہ سنسکرت متن کے ساتھ ہارورڈ اورینٹل سیریز کے تحت دو حصوں میں ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ منگولی زبان میں سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ ارجی بورجی خاں کے نام سے کیا گیا[۱۷۸]۔

سنگھاسن بتیسی گو سنسکرت کی ایک مستقل تصنیف پر مبنی ہے، لیکن اس کی کئی کہانیاں، بیتال پچیسی، جاتک کہانیوں اور کتھاسرت ساگر سے ملتی جلتی ہیں۔[۱۷۹] روایت ہے کہ یہ کہانیاں مہادیو جی نے گوری یعنی پاربتی جی کو سنائی تھیں۔ قصے کی تمہید یوں ہے:

چندر کرن ایک آسمانی بادشاہ نے ایک زریں سنگھاسن (تخت) بنوایا جو اس نے مہادیو جی کی نذر کر دیا۔ مہادیو جی نے اسے راجہ اندر کو دیا اور راجہ اندر نے اجین کے راجہ بکرماجیت کی کسی بات سے خوش ہو کر یہ سنگھاسن اسے بخش دیا۔ بکرماجیت کے بعد اس کا لڑکا کرم سین بادشاہ ہوا اور اس تخت پر بیٹھنا چاہا۔ لیکن تخت میں لگی ہوئی ۳۲ پتلیوں نے اسے منع کیا۔ تخت زمین میں دفن کر دیا گیا اور کرم سین اسی حسرت میں دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کی موت کے بعد یہ سنگھاسن راجہ بھوج کے ہاتھ آیا۔ اس نے بھی اس پر بیٹھنے کی کوشش کی۔ سنگھاسن میں لگی ہوئی ۳۲ پتلیاں ہر روز راجہ بھوج کو بکرم کی شجاعت اور

---

۱۷۵ دتاسی حوالہ ماسبق، ص ۱۷

۱۷۶ دتاسی خطبات، ص ۲۷۹

۱۷۷ نثری داستانیں، ص ۵۹۱

۱۷۸ ایضاً

۱۷۹ نثری داستانیں، ص ۷۷

سخاوت کا ایک واقعہ سناتیں اور اس طرح اسے سنگھاسن پر بیٹھنے سے باز رکھتی تھیں۔ ستائیسویں دن راجہ بھوج نے ان کے روکنے کے باوجود تخت پر بیٹھنا چاہا تو اندھا ہو گیا۔ بکرم کا نام لیتے ہی اس کی آنکھیں ٹھیک ہو گئیں۔ لیکن بعد کے پانچ دن اس نے پھر سنگھاسن پر بیٹھنے کی کوشش کی۔ آخری دن یہ راز کھلا کہ اس سنگھاسن پر بیٹھنے کا حق صرف بکرماجیت کو تھا۔ اور یہ پتلیاں راجہ اندر کی پریاں تھیں جو اپنے اعمال کی وجہ سے پتھر کے بُت بن گئی تھیں۔ راجہ بھوج کو بکرم کی سخاوت کے قصے سنانے کے بعد انھیں واپس اپنی اصلی حالت میں آجانا تھا۔ چنانچہ یہ سب پریاں بن کر اڑ گئیں اور تخت دفن کر دیا گیا۔

فارسی نسخے

۱۔ ''شاہنامہ'' از ''چتر بھج داس بن مہر چند کایت (کایستھ) ساکن در شہرِ سون (سونی) پت'' بعہدِ اکبرِ اعظم[(۱۸۰)]

۲۔ ''نامۂ خرد افزا''[(۱۸۱)] از عبدالقادر بدایونی۔ انھوں نے ایک عالم برہمن کی مدد سے سنگھاسن بتیسی کو فارسی نظم و نثر میں ترجمہ کیا۔ سنہ تصنیف ۹۸۲ھ منتخب التواریخ (ج ۱، ص ۶۷) میں لکھا ہے کہ ۱۰۰۳ھ میں اس پر نظرِ ثانی کر کے نیا نسخہ مرتب کیا گیا۔[(۱۸۲)]

۳۔ ''گل افشاں'' مصنف نامعلوم۔[(۱۸۳)] خلاصۃ التواریخ میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے ''گل افشاں'' نام کی ایک مثنوی کو قاسم کاہی کی تصنیف بتایا ہے۔[(۱۸۴)]

---

۱۸۰ باڈلین ۱۳۲۴، ریو، ص ۷۶۳

۱۸۱ منتخب التواریخ، وکلاکام از تحسین الدین مطبوعہ پیرس ۱۸۳۵ء، ص ۹۶

۱۸۲ ریو، ۷۶۳

۱۸۳ بحوالہ ریو، ۲۳۰

۱۸۴ منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۷۴

سُجان رائے بھنڈاری نے مصنف کا نام نہیں بتایا، فقط اتنا لکھا ہے:
"...... گل افشاں ترجمہ سنگاسن بتیسی متضمن احوال راجہ بکرماجیت کہ مخترع آں برج پنڈت وزیر راجہ بھوج است"[(۱۸۵)]

۴۔ سنگھاسن بتیسی از بھاڑامل بن راج مل کھتری۔ سنہ تصنیف ۱۰۱۹ھ[(۱۸۶)]
سنگھاسن بتیسی از بھاڑامل کا ایک قلمی نسخہ بوہار لائبریری میں محفوظ ہے۔ مکتوبہ ۱۸۲۶ء۔ اس میں مصنف کا نام "بہار مل" لکھا ہوا ہے۔[(۱۸۷)] نسخہ آصفیہ میں نام یوں درج ہے۔ "بھاڑامل ابن راج مل اولاد ملک ساکھو ساکن عمدہ سیتاپور سرکار صوبہ پنجاب"۔[(۱۸۸)]

۵۔ سنگھاسن بتیسی از ابن ہر کرن۔[(۱۸۹)] برٹش میوزیم کے ایک مخطوطے میں یوں دیا ہوا ہے: "بسب رائے ابن ہر کر بداس کایتھ" یہ قنوج کا باشندہ تھا۔ اس نے یہ ترجمہ شاہجہاں کے عہد میں ۶۲۔۱۰۶۱ھ میں کیا۔[(۱۹۰)]

۶۔ سنگھاسن بتیسی از کشن داس ابن مول چند تنبولی، باشندۂ لاہور، بعد جہانگیر[(۱۹۱)]

۷۔ سنگھاسن بتیسی از چاند ابن مادھو رام نسخہ کوپن ہیگن (فہرست ص۲۹)[(۱۹۲)]

۸۔ سنگھاسن بتیسی از "سید امداد علی اور شیو سہائے کایستھ باشندگان گلاؤٹھی، بلند شہر، ضلع میرٹھ" انھوں نے یہ ترجمہ براہ راست سنسکرت سے

---

۱۸۵ خلاصہ التواریخ، ص ۶

۱۸۶ ایتھے ۱۹۸۸

۱۸۷ بوہار، ص ۳۱۹، نمبر ۴۴۶

۱۸۸ آصفیہ ج ۳، ص ۵۲۶، نمبر ۲۲۹

۱۸۹ باڈلین، ۱۳۳۵

۱۹۰ ایتھے ۹۲۔۱۹۹۰ نیز ریو ۷۶۳

۱۹۱ ایتھے ۱۹۸۹

۱۹۲ بحوالہ ریو ۷۶۳

Edward Clive Bayley (۱۹۳) کے تحریری حکم مورخہ ۱۰/ اپریل ۱۹۴۵ء کی تعمیل میں کیا۔ مکتوبہ ۱۸۴۵ء(۱۹۴)

۹۔ سنگھاسن بتیسی (نظم) مسمیٰ بہ ''کانِ وجود'' مخزونہ سالار جنگ میوزیم۔(۱۹۵)

۱۰۔ مفتاح القلوب 'ترجمہ سنگھاسن بتیسی' (فارسی) مصنفہ عباداللہ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جس میں 'بہاڑامل ابن راج مل' کی سنگھاسن بتیسی (سنہ تصنیف ۱۰۱۹ھ) خلط ملط ہو گئی ہے، اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ ابتدائی سطور جن میں کتاب کا نام اور سال تصنیف درج ہے، یہ ہیں:

''بندہ کمترین عباداللہ چنیں گوید کہ میل خاطر طبع زاد عزیزاں را در اخبار قدیمی و اسما ماضی مایل بود۔ بنا بر ایں چند کلمہ را آراستہ بزبان فارسی در آوردہ و قبل ازاں ایں مجموعہ را سنگھاسن بتیسی ہندوی می گفتند ...... اکنوں بتائید ربّانی و از عاطفت سبحانی مسمیٰ مفتاح القلوب معروف شد ...... تاریخ ایں ز ہجرت یکہزار و سی و پنجست ......''(۱۹۶)

۱۱۔ فارسی نثری ترجمہ (قلمی) مجہول المصنف، (مخطوطے میں چونکہ دیباچہ وغیرہ نہیں ہے، مترجم، کاتب کا نام اور سنہ تالیف معلوم نہیں ہو سکا) سنہ کتابت ۱۲۲۵ھ۔ آغاز: ''یک وقت سری مہادیو بر کیلاش پربت ......''(۱۹۷)

---

۱۹۳ E.C.Bayley حکومت ہند کے فارن ڈپارٹمنٹ میں ''انڈر سکریٹری'' تھے۔ بلوم ہارٹ، ص۵۹

۱۹۴ ریو ۱۰۰۶

۱۹۵ سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد، فن نظم فارسی، نمبر ۵۷۳

۱۹۶ آصفیہ ج ۲، ص ۵۲۶، نمبر ۲۲۹

۱۹۷ بمبئی نمبر ۱۲، ص ۲۷۷

اردو نسخے

نثر:

۱۔ سنگھاسن بتیسی۔ مصنف نامعلوم۔ یہ نسخہ قدیم دکھنی اردو میں ہے۔ مصنف نے صراحت کردی ہے کہ اس نے قصۂ چتر بھج داس کی فارسی سنگھاسن بتیسی موسوم بہ "شاہ نامہ" سے ترجمہ کیا ہے۔ سنہ تصنیف قبل ۱۲۰۰ھ ہے۔[۱۹۸]

۲۔ سنگھاسن بتیسی کو کاظم علی جوان اور للو لال نے ۱۸۰۴ء میں سندر داس کبیشر کی برج تصنیف سے فورٹ ولیم کالج کے لیے ترجمہ کیا۔ اس کے جو ایڈیشن شائع ہوئے، ان میں سے دہلی ۱۸۶۶ء اور لکھنؤ ۱۸۶۸ء کے ایڈیشن کتب خانہ برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔ سنگھاسن بتیسی از کاظم علی جواں اور للو لال کے مندرجہ ذیل ایڈیشن کتب خانہ انڈیا آفس، لندن میں ہیں:

کلکتہ ۱۸۰۵ء لکھنؤ ۱۸۷۰ء، لکھنؤ (دیگر) ۱۸۷۰ء، لکھنؤ ۱۸۷۳ء، دہلی ۱۸۷۵ء اور لکھنؤ ۱۸۷۷ء۔[۲۰۰] اسی کتب خانے میں دیوناگری رسم الخط کے ۱۴ اور گورکھی رسم الخط کے ۵ ایڈیشن محفوظ ہیں۔[۲۰۱] برٹش میوزیم لندن میں بھی بارہ بنکی سے ۱۹۰۳ء کا چھپا ہوا ایک ایڈیشن محفوظ ہے۔[۲۰۲]

۳۔ سنگھاسن بتیسی (اردو نثر) راجا درگا پرشاد، آگرہ ۱۸۶۲ء[۲۰۳]

۴۔ سنگھاسن بتیسی مصور (اردو نثر) مجہول المصنف، نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۰ء، تعداد صفحات ۱۴۲ (اسی مطبع سے اس نسخے کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں)۔

---

۱۹۸ سالار جنگ، ص ۱۸۷، نمبر ۹۱

۱۹۹ بلوم ہارٹ، برٹش کتب، ص ۱۶۴

۲۰۰ انڈیا مطبوعات، ص ۱۵۰

۲۰۱ انڈیا ہندی، ص ۶۴، ۶۵

۲۰۲ ہندی ۳۴۲

۲۰۳ بمبئی، ص ۲۷۷

۵۔ سنگھاسن بتیسی (اردو نثر) از عبداللہ فرضی۔[۲۰۴]

۶۔ سنگھاسن بتیسی (آسان اور عام فہم اُردو نثر) از مجنوں گورکھپوری، لکھنؤ ۱۹۴۱ء۔[۲۰۵]

نظم:

۱۔ سنگھاسن بتیسی بکرماجیت (قلمی) مصنف نامعلوم (شاگرد میر درد) سنہ کتابت ۱۲۶۷ھ، اوراق ۹۱۔[۲۰۶]

۲۔ ویر بکرم (قلمی) اس کا مصنف اور سنہ تصنیف بھی معلوم نہیں۔ اوراق ۹۲۔[۲۰۷]

۳۔ سنگھاسن بتیسی از منشی منسارام ناتواں، خلف لکھپت رائے، خلف رائے ہردے رام کھتری سرہندی، باشندۂ دہلی۔ بشاش سے روایت ہے کہ ناتواں نے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ اردو مثنوی میں کیا تھا۔[۲۰۸]

۴۔ سنگھاسن بتیسی از منشی رنگ لال چمن۔ یہ مثنوی ۱۸۶۹ء میں شائع

---

۲۰۴ صدیق، ص ۱۹۶

۲۰۵ مکتوب جناب مجنوں گورکھپوری بنام مولف۔ "فہرست کتب خانہ" میں اس کتاب کی جائے اشاعت گورکھپور بتائی گئی ہے (ص ۴۴)

۲۰۶ لٹن لائبریری، علی گڑھ، ذخیرہ سر شاہ سلیمان، نشان ۱۱۵

۲۰۷ کتب خانہ، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، نشان ۴۹ / ۶۰۴

۲۰۸ ناتواں کی سنگھاسن بتیسی اب نایاب ہے۔ انھوں نے ساٹھ ستر کتابیں فارسی، اردو، بھاکا میں لکھیں۔ بعض کتابیں ان کے فرزند درگا پرشاد نادر مولف خزینۃ العلوم نے شائع کرادیں۔ ناتواں کا انتقال سمت ۱۹۳۵ میں ہوا۔ (بشاش، آثارالشعرائے ہنود، ص ۱۲۷)
درگا پرشاد نادر کی تصنیف کا پورا نام "خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم" خطاب "گلدستۂ نادرالافکار" اور عرف "تذکرہ شعرائے دکن" ہے۔ انھوں نے "تذکرۃ النساء" کے نام سے شاعرات کا ایک تذکرہ بھی لکھا، جس کا تاریخی نام "مراۃ خیالی" اور لقب "گلشنِ مرأت نادر" ہے۔

ہو چکی ہے۔[209]

۵۔ سنگھاسن بتیسی، از رنگیں لال متخلص بہ رنگیں۔ یہ مثنوی مطبع اودھ اخبار لکھنؤ سے چھپی تھی۔[210]

٦۔ سنگھاسن بتیسی۔ از منشی مکھن لال[211]

مثنوی سنگھاسن بتیسی، بکرماجیت

لٹن لائبریری کا یہ نسخہ "یافتاح" اور "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے شروع ہوتا ہے۔ پہلے صفحے پر یہ عنوان درج ہے:

"از اصل کتاب لالہ بھوری مل برائے دلچسپی خود در چھاپہ خانہ گمنام تحریر شد"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصل نسخے کی نقل ہے۔ مصنف کا نام اور سنہ تصنیف کہیں درج نہیں۔ البتہ مثنوی کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ شاہ عالم کے زمانے میں لکھی گئی تھی، اور مصنف خواجہ میر درد کا کوئی شاگرد تھا۔ حمد کے پہلے دو شعر ملاحظہ ہوں:

بنائی آسماں کی جس نے جو سق ‏ ‏ دلآرامِ جہاں رزاقِ مطلق
رکھا اپنے تئیں سب سے چھپائے ‏ ‏ مہ و خورشید کر روشن دکھائے

تعریف حضرت خواجہ میر درد قدس سرہٗ:

جنابِ پاک دردِ عشق بازاں ‏ ‏ اثر ...... جان مہر سازاں (کذا)
ہر اک دم عندلیب و گل کا دم ساز ‏ ‏ کرے ہے عرش پر درک اس کا پرواز
زمین و آسماں تک اس پہ روشن ‏ ‏ نمایاں اس کی نظروں سے ہو گلشن

---

۲۰۹ سنگھاسن بتیسی، مطبع نول کشور، کانپور، تعداد صفحات ۱۲۹

۲۱۰ یہ مثنوی بھی بظاہر نایاب ہے۔ تذکرہ آثار الشعرائے ہنود، ص ٦۸

۲۱۱ نثری داستانیں، ص ۵۹۱

گیا ہے اس کے در تک جو کوئی یاں پھر آیا جمع کر جانِ پریشاں
کوئی عقدہ جو لاینحل رہے ہے او نہیں کے ہاتھ سے آخر کھلے ہے
عجب توحید کا رنگیں چمن ہے وہی سمجھے کھلا یاں جس کا من ہے
نہیں دیکھا کوئی انسان ایسا جہاں میں آپ ہی ہے آپ جیسا
کہاں تعریف بندہ کر سکے ہے
کہ عقلِ کل سخن کہتی تھکے ہے

تعریف شاہ عالم بادشاہ:

شہنشاہِ زمانہ شاہِ عالم کہ جس کے عدل سے آباد عالم
دکھن سے لے کے تا ایراں ہے محکوم نہیں اس عہد میں کوئی بھی مغموم
فلک نے اس کا جو دشمن اُٹھایا ظفر نے خاک و خوں میں ہے ملایا
عدالت سے ہے اس کی امن میں خلق تلے خنجر کے ہے بدخواہ کا حلق

مثنوی کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے:

اے ساقی زری پینا ہے مئے سودے اب کب تغافل کی جگہ ہے (کذا)
خموشی سے کروں ہوں گرم صحبت سخن گوئی سے تا کے مہر و الفت

ترقیمہ: تمام شد کتاب سنگھاسن بتیسی در تعریف راجہ بکرما جیت ۱۲۶۷ھ بتاریخ ۱۹/ ذیعقدہ مطابق ۱۶/ ستمبر ۱۸۵۱ء، یعنی سوج بدلی جیٹھ ۱۹۸۹ روزِ سہ شنبہ بوقت یک گھڑی روز باقیماندہ، بپاس خاطر عزیز القدر از جان لالہ لکھپت رائے[۲۱۲] تحریر یافت، خطاے و سہوے اگر شدہ باشد، پوشیدہ ساختہ اصلاح باید داد"۔[۲۱۳]

---

۲۱۲ غالباً یہ لکھپت رائے وہی ہیں جن کا ذکر اوپر نسخہ ۳ کے ضمن میں آیا ہے۔
۲۱۳ سنگھاسن بتیسی (قلمی) لٹن لائبریری (ذخیرۂ شاہ سلیمان) نمبر ۱۱۵

مثنوی ویر بکرم

سنگھاسن بتیسی کا یہ قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہے۔ اس کا مصنف بھی معلوم نہیں ہوسکا۔ دیباچے میں مذکور ہے کہ یہ فارسی مثنویوں کا ترجمہ ہے۔ مخطوطہ ناقص الآخر ہے۔ اس لیے کوئی ترقیمہ نہیں جس سے مصنف کا نام، سالِ تصنیف یا زمانۂ کتابت کھل سکے۔ یہ نسخہ مصنف کا ذاتی معلوم ہوتا ہے۔ حاشیے پر اصلاحی الفاظ دیے ہوئے ہیں اور پورا مسودہ جگہ جگہ کٹا چھٹا ہے۔ زبان دکھنی ہے۔ آغاز:

زباں سے نہ ہو حق کا حمد و سپاس　　کہ بے چونِ قدرت وہ ہے بے قیاس
زمیں آسماں اس نے پیدا کیا　　مہ و مہر پرویں ہویدا کیا
عجائب غرائب بنایا جہاں　　بشر کو کیا خاک سے پھر عیاں

خاتمہ:

یہ سن کر بنایا نشاں شاد شاد　　لگایا خدا پر او رکھ اعتقاد
....　　گیا تیر سوفار سے پار او
زبس دیکھ کر وہ اُٹھا خواب سے　　رہائی ہوئی قہر کے باب سے[214]

مثنوی سنگھاسن بتیسی، چمن

رنگ لال چمن کی مثنوی کا سالِ تصنیف ۱۸۶۴ء ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ سے ظاہر ہے:

ہوا آراستہ یہ باغِ نو جب　　ہر اک کشور میں پہنچی بوے تعریف
کہی میں نے سریرِ دیں سے تاریخ　　ہوئی یہ نظمِ نو کیا عمدہ تصنیف

۲۱۴　کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، نشان ۴۹/ ۶۰۴

مثنوی کے شروع میں چند شعر واجد علی شاہ کی مدح میں درج ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کی ابتدا ۱۸۵۶ء سے پہلے ہوئی۔ ورنہ معزول بادشاہ کو "ماہ و ماہی کا فرماں روا اور افسرِ شاہانِ عالم" کے خطابوں سے نوازنا بے معنی ہے۔ مدح کے آخری اشعار سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے:

لکھیں اب مدحتِ سلطانِ عالم　　کہ ہے وہ افسرِ شاہانِ عالم
تہِ فرماں ہے اس کے ماہ و ماہی　　شہنشاہِ جہاں، ظلِ الٰہی
یہی میری دعا شام و سحر ہے　　کہ جب تک جلوۂ شمس و قمر ہے
رہے واجد علی دنیا میں قائم　　فزوں ہو شوکت و اقبال دائم

یہ مثنوی سب سے پہلے مطبع نول کشور کانپور سے ۱۸۶۹ء میں طبع ہوئی۔(۲۱۵) دوسرا ایڈیشن کانپور سے ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا۔

منشی رنگ لال چمن، منشی رام سہائے رونق کے شاگرد اور روشن لال ولد منشی جگن ناتھ خوشتر صاحبِ رامائن، اردو منظوم کے ہم عصر تھے۔(۲۱۶) چمن نے سببِ تالیف بتاتے ہوئے صراحت کردی ہے کہ سنگھاسن بتیسی کا مشہور قصہ انھوں نے اپنے احباب کی فرمائش پر نظم کیا۔ ماخذ کے بارے میں مثنوی خاموش ہے۔

لوح پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم درج ہے۔ واجد علی شاہ کی مدح اور سببِ تالیف کے بعد نول کشور اور ان کے مطبع کی تعریف ہے۔ چند اشعار اپنے اُستاد رام سہائے رونق کے بارے میں ہیں۔ پھر ساقی نامہ ہے اور مہادیو جی اور کیلاش پربت کی مدح ہے۔ اس کے بعد بکرماجیت کی پیدائش اور راجہ اندر کے ذکر سے کہانی چل نکلتی ہے۔ راجہ بھوج کو سنگھاسن پر بیٹھنے سے باز رکھنے کے لیے پتلیاں جو کہانیاں سناتی ہیں، ان میں سے اٹھائیسویں کہانی یوں ہے:

۲۱۵　بلوم ہارٹ، برٹش کتب، ص ۲۹۷

۲۱۶　تذکرہ آثار الشعرائے ہنود، ضمیمہ ص ۴

اٹھائیسویں دن صبح ہوتے ہی راجا بھوج نے پھر سنگھاسن پر قدم رکھنا چاہا۔ اٹھائیسویں پتلی زہرہ بولی۔ "اس تخت پر وہ بیٹھے جو انصاف کی خاطر جان قربان کرسکے"۔ بھوج نے پوچھا، یہ کیسے؟ پتلی بولی، "ایک مرتبہ بکرماجیت اندرلوک میں مدعو تھے۔ تمام فرشتوں کے سامنے راجا اندر نے بکرماجیت کے اوصاف کی تعریف کی۔ اس پر دو فرشتوں نے مارے حسد کے بکرماجیت کو نیچا دکھانے کے لیے چال چلی۔ ایک گائے بن گیا اور ایک شیر۔ چنانچہ:

میانِ راہ بیٹھے بن کے دیوار — نظر تھی آمدِ بکرم پہ ہر بار
شہنشہ اس طرف جس وقت آئے — ہوئے ہشیار دونوں چار پائے
کہا لو آج بکرم کا مضما (کذا) — نہ جانے دو انھیں میداں سے اصلا
کرامات ان کی دیکھو آج یکسر — کہ ہیں مداح اون کے شاہ یکسر
کیا یہ گاؤ نے اک مرتبہ زور — کہ بھاگی شیرِ نر کے پاس سے دور
ہوئی پوشیدہ ذیلِ شہ میں جاکر — امانِ جان چاہی ان سے یکسر
وہ دامن میں شہنشہ کے چھپی جب — یہ شیرِ نر حضورِ شہ گیا تب
کہا یہ گاؤ مادہ مجھ کو دو تم — خوشی سے راہ اپنے گھر کی لو تم
شہنشہ نے کہا اے شیرِ عیار — نہ پائے گا یہ گاؤ مادہ زنہار
ہمیں تو کیا نہیں پہچانتا ہے — ہمارا نام عالم جانتا ہے

اس تکرار کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ شیر گائے پر جھپٹ کر اسے ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بکرماجیت نے یہ سوچ کر کہ کمزور کی حفاظت نہ کرسکنے سے مرنا بہتر ہے۔ خنجر اپنے سینے میں گھونپ لیا۔

جو دیکھا شیرِ نر نے شہ کا یہ رنگ — شکم اپنا بھی پھاڑا ہو کے دل تنگ
ہوئے جب تین تن اک دشت میں ڈھیر — بکرماجیت و گاؤ مادہ و شیر
سری شو اور سری گورا قضارا — ہوئے اس دشت و بر میں جلوہ آرا

چنانچہ سری شو (مہادیو جی) کی نظرِ عنایت سے تینوں پھر زندہ ہوئے اور:

ملائک نے جو دیکھا یہ تماشا   رہے حیرت میں وہ آئینہ آسا
کہا بے جا یہ ان کا امتحاں تھا   ہمیں بے فائدہ وہم و گماں تھا
بہ لطفِ بیش جب شیو پیش آئے   ہمیں کیونکر تصور میں وہ لائے
ہوئے نادم بہت وہ قصہ کوتاہ   ہوئے حاضر حضورِ شاہِ ذیجاہ

جیسا کہ ظاہر ہے یہ کہانیاں بجائے خود مکمل نہیں ہیں۔ ان سب کا مقصد بکرم کی عظمت، سخاوت یا شجاعت کا بیان ہے۔ بکرماجیت کو انصاف پسند، حق پرست اور نہایت جری و بہادر دکھایا گیا ہے۔ وہ ہر مشکل کا سامنا کرتا ہے اور اپنی غیر معمولی طاقت کی وجہ سے کامیاب رہتا ہے۔ وہ کمزوروں کا مددگار اور بے نواؤں کا سہارا ہے اور سچائی کی خاطر جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

اردو کے دوسرے مترجموں کی طرح رنگ لال چمن نے بھی مرکزی کردار یعنی بکرماجیت کے علاوہ دوسرے بہت سے نام بدل دیے ہیں۔ مثلاً وہ پتلیوں کو زمرد، جواہر، یاقوت، زہرہ، مشتری، نادر، نسرین، صنوبر، رعنا وغیرہ ناموں سے یاد کرتا ہے۔ اس کے باوجود ان کہانیوں میں ہندستانی فضا نہایت گہری ہے۔ دراصل ان کی بنیاد ہندو دیومالا پر ہے اور اندر، اندر لوک، پاتال، امرلوک، بیتال، برہمن، یوگی، یکش، یکشنی وغیرہ کا ذکر بار بار آتا ہے۔ جس سے کہانیوں کی قدیم فضا برابر قائم رہتی ہے۔

رنگ لال چمن نے کہانیوں کو بے جا طول نہیں دیا۔ گو کلام اسقام سے خالی نہیں۔ لیکن زبان صاف اور سلیس ہے اور قصے کی دلچسپی میں مزاحم نہیں ہوتی۔

مثنوی مورنامہ

اسٹیٹ لائبریری رامپور میں کلیات میر کے دو قلمی نسخے ہیں۔ مخطوطہ نمبر ۳۸۴ میں ایک مثنوی مورنامہ شامل ہے، جو عبدالباری آسی کے مرتبہ نول

کشور ایڈیشن میں نہیں۔ اس کا متن ڈاکٹر گیان چند جین نے رسالہ اردو ادب، جون ۱۹۵۷ء میں شائع کردیا ہے۔ اس کا قصہ غیر فطری اور سیدھا سادہ ہے جس میں ایک رانی کا مور سے عشق کرنا اور اس پر جان دینا دکھایا گیا ہے۔ قصّے کے مرکزی کردار راجا رانی اور مور ٹھیٹھ مقامی فضا کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ہندستانی قصوں میں اس سے ملتے جلتے واقعات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً پدماوت میں سنہل دیپ کے راجا گندھروسین کی بیٹی پدماوتی ایک توتا ہیرامن پالتی ہے جو اُسے روز عشق و عاشقی کے قصّے سناتا ہے۔ راجا اسے ہلاک کرنے کی تدبیریں سوچتا ہے، لیکن شاہزادی اس کی جان بچانے کے لیے اسے گھر سے اڑا دیتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رانی اور مور کے عشق کا کوئی عوامی قصہ میر تک کسی مقامی روایت کے ذریعے پہنچا ہو، مگر اس کا تحریری ثبوت نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ قصّہ میر ہی کی تخلیق ہو۔ بہر حال اس میں دو باتیں ایسی ضرور ہیں جنھیں میر کی ذہنی افتاد سے خاص مناسبت ہے۔ ایک تو یہی عشق کی عالم گیر ہنگامہ آرائی یعنی انسان تو کیا چرند و پرند بھی عشق کے سودازدہ ہیں۔ دوسرے کہانی کا درد انگیز اور الم ناک انجام جس میں عاشق و معشوق دونوں جان سے جاتے دکھائے گئے ہیں۔

قصے کا خلاصہ یہ ہے: ایک مور جنگل سے بستی میں آیا۔ یہاں کی رانی حسن و خوبی میں لاثانی تھی۔ مور اس کے دیدار کے لیے شاہی محل پہنچا۔ رانی کا سامنا ہوا تو مور حیرت کی تصویر بنا، جہاں کھڑا تھا، وہیں کا وہیں رہ گیا۔ رانی نے اک بے زبان پرندے کو اپنے حُسن کا ایسا گرویدہ پایا تو وہ بھی اُسے پیار دُلار کرنے سے رہ نہ سکی اور مور وہیں محل میں رانی کے پاس خوشی خوشی رہنے لگا۔ لیکن:

مختلط رہنے سے بعد از چند روز — شور بدنامی اٹھا اک سینہ سوز
کھل گئی غماز لوگوں کی زباں — سب پہ ظاہر ہوگیا رازِ نہاں

راجا لوگوں کے لگانے بجھانے سے حسد کے انگاروں پر لوٹنے لگا اور مور کی جان

کا لاگو ہو گیا۔ رانی نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو دل پتھر کر کے مور کو چوری چھپے محل سے نکال دیا۔

گرتے پڑتے دو قدم پرواز کی حزن کے ساتھ اک حزیں آواز کی
صبر سے ناچار پھر چارا کیا دیر سر دیوار سے مارا کیا
جور ہجر یار کے سہنے لگا پاس سے کچھ دور ہی رہنے لگا

لیکن راجا تو اس کی جان کے درپے تھا۔ اس نے جگہ جگہ مور کی تلاش میں جاسوس دوڑائے۔ رانی تاسف سے اندر ہی اندر گھلنے لگی۔ ادھر مور کا حال بھی درہم تھا۔ اس نے جنگل میں جاکر دانہ پانی ترک کر دیا اور صبا کے ہاتھوں رانی کو پیغام دینے لگا:

پھیکے خط کے حرف سانٹتا ہوں صاف جائے تو رانی سے کہیو واشگاف
دور تجھ سے ہوگئی شرمندگی اب تلک جیتا تو ہوں پر زندگی
کرتا ہوں اندھا سا میں فریاد و شور آنکھیں رہتی ہیں لگی تیری ہی اور
آنکلتا ہے تو پھر آتا نہیں اب کوئی اس راہ سے جاتا نہیں
اب جو نالے کرتا ہوں سو تلملا شور کرتے کرتے پھاٹا ہے گلا

جاسوس مور کا اتا پتا لے آئے کہ وہ اژدہوں کے ایک تیرہ و تار جنگل میں پناہ گزیں ہے۔ راجا نے فوراً فوج کشی کا حکم دیا اور خود مور کو ہلاک کرنے چلا۔ ادھر اس جگر سوختہ کے سوز دروں سے جنگل میں آگ لگ گئی اور سینکڑوں مار و اژدر اور شیر و کرگدن جل کر راکھ ہوگئے۔ مور بیچارہ بھی اسی آگ میں جل مرا اور راجا کو فقط اس کا لاشہ ہاتھ آیا۔ غرض:

اور راجا کا بھی اودھر گھر جلا پھر پڑی جو آگ سب لشکر جلا
آتشِ غم سے جلا اس کا جگر یعنی رانی نے سنی جو یہ خبر
خاک ہوکر خاک ہی میں رل گئی کیا لگی دل کو کہ رانی جل گئی

عشق ہی کی ہیں یہ تازہ کاریاں   عشق نے پردے میں جانیں ماریاں
عشق سے کیا میر اتنی گفتگو   خاک اڑا دی عشق نے ہر چار سو
طائر و طاؤس و حیواں اژدہے   سب کھپے کیا عشق کی کوئی کہے
یہ فسانہ رہ گیا عالم کے بیچ   باز ماندہ اُن کے ہیں سب غم کے بیچ

یہ مثنوی میر کے مذکورہ بالا کلیات کے دیوانِ پنجم میں شامل ہے، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ اسے انھوں نے اپنی آخری عمر میں لکھنؤ میں لکھا ہوگا۔ بظاہر اس مثنوی کا قصہ غیر فطری معلوم ہوتا ہے، لیکن ہمارے نزدیک میر نے اسے تمثیل Allegory کے انداز پر نظم کیا ہے۔ مثنوی کے مرکزی کرداروں کا اگر غور سے تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ راجا رانی اور مور محض نام ہی نام ہیں۔ میر نے انھیں حسن و عشق کی بنیادی قوتوں کی تمثیل بنا کے پیش کیا ہے۔ مثنوی میں ایک جگہ وہ خود کہتے ہیں:

فتنہ در سر عشق کے یہ کام ہیں
مور اژدر رانی راجا نام ہیں
عشق ہے ہنگامہ ساز شور و شر
قصے قضیے عشق سے ہیں مختصر

مور دراصل عشق ہے، رانی حُسن ہے اور راجا حسد کی نمائندگی کرتا ہے۔ میر نے حسن و عشق کے سوز و ساز اور حسد و رقابت کی آویزش و پیکار کے ازلی افسانے کو ایک نئے پیرائے میں بیان کرتے ہوئے عشق کی اہمیت و عظمت کے اُسی مقدمے کو پھر دہرایا ہے، جسے وہ اپنی عشقیہ مثنویوں میں اس سے پہلے بھی کئی بار پیش کر چکے تھے۔ یعنی کائنات کی بنیادی قوت عشق ہے۔ یہاں زمین سے آسمان تک عشق ہی عشق بھرا ہے۔ بوستانِ ناز کی بہار اور لیل و نہار کی گردش، دنیا میں سبھی کچھ عشق ہی کے دم قدم سے ہے۔ زیرِ نظر مثنوی کا

آغاز بھی حسب معمول عشق کی تعریف سے ہوا ہے اور میر نے اس پر ۴۱ اشعار صرف کیے ہیں۔ البتہ ایک لحاظ سے یہ مثنوی میر کی دوسری مثنویوں سے مختلف ہے۔ یعنی اس سے پہلے میر عشق کی شورانگیزی افسانوں میں دکھاتے آئے تھے، اب وہ خاص طور سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ذی عقل تو کیا، طیور و وحشی بھی اس کی ہنگامہ آرائی سے نہیں بچ سکتے۔ مثنوی کے آغاز میں کہتے ہیں:

وہ حقیقت سب میں یاں ساری ہوئی — ہے گی ہر شے عشق کی ماری ہوئی
چار سو ہنگامہ آرا عشق ہے — عشق کیا کہیے کہ کیا کیا عشق ہے
عشق زور آور سے سب ہیں ہرسناک — کشتے اس کے ہوگئے عالم سے پاک
کیا درندہ کیا چرندے کیا پرند — دل ہے جن کے عشق ہے اُن کا کشند

دوسری جگہ پھر اسی بات کو دہرایا ہے:

طائر و طاؤس و حیواں اژدہے — سب کہے کیا عشق کی کوئی کہے

پال ہاروے کا بیان ہے کہ تمثیل میں مجازی سطح کے نیچے کوئی نہ کوئی مقصد ضرور کارفرما رہتا ہے۔ میر نے بھی اپنی اس تمثیلی مثنوی میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا ہے کہ کائنات کی بنیادی قوت عشق ہے۔ یہ فقط انسانوں کی جاگیر نہیں، پرندے بھی اس کے شراروں سے اپنا نشیمن پھونک سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو وہ مور کی شورش عشق کا ذکر کن الفاظ میں کرتے ہیں:

دل لگی تو اک خدا کا ہے غضب — اس سے پھر یارب، ہے لب پر روز و شب
دل گرفتہ دل شکستہ دل زدہ — ان نے مارے مرد کیا کار آمدہ
ہے گی یہ دل بستگی خانہ خراب — در بدر پھرنے کا کر دیوے ہے باب
کیا اڑایا ہے تجھے اے مشتِ پر — خاک سے لے کر گیا افلاک پر
واں سے پٹکے دیکھیے کیونکر تجھے — ساتھ آوارہ کرے کیدھر مجھے

راجا کے حسد اور بدگمانی کو بھی میر نے پوری توجہ سے اجاگر کیا ہے۔ کسی انسان کا پرندے کو اپنے پاس رکھنا یا اُسے چاہنا ایسا جرم نہیں کہ گردن مارنے کی نوبت آئے۔ لیکن غیرتِ عشق کے بھی کچھ تقاضے ہیں۔ رشک و رقابت اور عشق میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عشق دوسرے کی شرکت کہاں گوارا کرتا ہے خواہ وہ چرند و پرند ہی کیوں نہ ہو! ملاحظہ ہو، بدگمانی کے زور سے راجا کا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے اور معقول بات بھی اسے نامعقول معلوم ہوتی ہے:

کان راجا کے بھرے دشمن ہوا — بدگمان و بد بر و بد ظن ہوا
کارِ ظنِّ بد کھنچا اک طول کو — سمجھا نامعقول وہ معقول کو
آنا جانا گھر میں اب کا ہوچکا — پاسِ ربط و رابطہ سب ہوچکا
گھر میں لاتے ہیں کبھو تو گھیر کر — بات کہتا ہے تو منھ کو پھیر کر
راہ میں ہے یا کبھو پھر جائے ہے — پھر گیا تو دیر میں پھر آئے ہے

....

دشمنی کی بات ہی کچھ اور ہے — بے ترحّم ہے نہ مطلق غور ہے
جانور کا اُنس کچھ ثابت نہیں — اُنسِ انساں کی سی یہ تہمت نہیں

اب رانی کا کردار ملاحظہ کیجیے۔ میر نے اسے بھی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ رانی کی خوبی اور خوب صورتی کا ایک عالم میں شور تھا۔ میر اگر کسی انسان کو رانی پر دیوانہ دار قربان ہوتے ہوئے دکھاتے تو کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ کیونکہ انسان کا انسان پر فریفتہ ہونا کون سی نئی اور چونکا دینے والی بات ہے۔ چنانچہ میر نے ایک پرندے کو رانی پر والہ و شیدا ہوتے دکھا کر حُسنِ انسانی کی غیر معمولی کشش کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ چونکہ قصّے کا مقامی رنگ برقرار رکھنا چاہتے تھے، انھوں نے پرندوں میں سے بھی مور کا انتخاب کیا تاکہ اس کے بال و پر کی رنگینی و دلآویزی قصّے کی رومانیت کا ساتھ دے سکے۔ حُسن یوں تو بے مہر

اور سنگدل ہوتا ہے، لیکن اگر عشق صادق ہو تو اثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ ملاحظہ ہو مور کے اضطراب سے رانی کا کلیجہ کیسا پسیجتا ہے:

اضطرابِ عشق نے تاثیر کی　　دل دہی کرنے اٹھی دل گیر کی
پیار سے کہنے لگی مت ہو اداس　　پاس رہ میرے کروں گی میں بھی پاس
تو ہے وحشی اس قدر مانوس ہے　　اُنس انساں کو نہ ہو افسوس ہے
پاس رہنے سے ترے ہے دل خوشی　　ہے بلا اس بال و پر میں دل کشی

میر رانی کو عشق میں ثابت قدم دکھانا چاہتے ہیں۔ ہندستانی روایت کے مطابق یہ تبھی ممکن تھا جب رانی کو ستی ہوتے ہوئے دکھایا جائے۔ میر کو اس مرحلے کا شروع ہی سے احساس تھا۔ چنانچہ وہ مثنوی کے ابتدائی حصّے میں اس کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

عاشق و معشوق رفتہ عشق کے　　یعنی دونوں سینہ تفتہ عشق کے
بھر کے آتش عشق کی دونوں چلے　　ڈوبے دریا میں ہوں گو پانی تلے
یا جلایا ایک ہندستاں کے طور　　جا جلے ہے زن بھی اس بے جاں کے طور
جل چکے کو ہندی کہتے ہیں ستی　　ست بمعنی استقامت واقعی
آگ میں جا بیٹھے زن کا ظرف کیا　　عشق ہی کا جاذبہ دے ہے جلا

عورت کا خاوند کی لاش کے ساتھ ستی ہو جانا محبت کی انتہا ہے۔ لیکن کسی عورت کا پرندے کے غم میں ستی ہونا انتہائی وابستگی اور وفاشعاری کی غیر معمولی مثال ہے۔ میر رانی کے مور پر قربان ہوجانے کی فضا تو پہلے ہی تیار کرچکے تھے۔ آخر میں اسے خاک سیاہ ہوتے دکھاکر کردار نگاری کے فرائض سے بطریقِ احسن سبک دوش ہوگئے:

یعنی رانی نے سُنی جو یہ خبر　　آتشِ غم سے جلا اُس کا جگر
کھینچ آہ سرد یہ کہنے لگی　　عشق کی بھی آگ کیا بہنے لگی

بن جلا کر بستیوں میں آ لگی   پھیل کر یاں دل جگر کو جا لگی
جمع کر خاشاک و خار و خس شتاب   جل گئی دے آگ وہ بھی بس شتاب
کیا لگی دل کو کہ رانی جل گئی   خاک ہو کر خاک ہی میں رل گئی

غرض قصّے میں تمثیلی رنگ کو نبھانے اور عشق کو فتح مند ثابت کرنے میں میر کامیاب رہے ہیں۔ گو تمثیل نگاری کے جدید نظریہ کی رو سے اس قصّے میں ایک کمزوری ہے۔ تمثیل کی جدید تعریف کے مطابق اس میں اندرونی معنویت کے باوصف اس کا مجازی مطلب بھی منظّم و مربوط ہونا چاہیے۔ مورنامہ کا قصّہ اس شرط پر پورا نہیں اُترتا۔ ایک انسان سے مور کا عشق بظاہر غیر عقلی بات ہے، لیکن یہ خصوصیت مشرقی ادب کی ان تمام تمثیلوں میں ملتی ہے، جن میں بعض کِردار انسان ہیں اور بعض حیوان مثلاً شک سپ تتی میں توتا ہی داستانوں کے پیرائے میں عقل کے رموز و نکات بیان کرتا ہے۔ پدماوت میں فقط توتا غیر انسانی کردار ہے جو دراصل عقلِ سلیم کی تشکیل ہے اور راجا رتن سین یعنی نفسِ انفرادی کو پدمنی یعنی عرفانِ حق کی طرف راغب کرتا ہے۔ اسی طرح مورنامہ میں مور حیات و کائنات کے بنیادی جذبۂ عشق کی تجسیم ہے، جس کی تائید قصّے کے واقعات اور انجام سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

مثنوی کا قصّہ مختصر اور دلچسپ ہے۔ کردار نگاری کے اعتبار سے مثنوی خاصی دلچسپ ہے، لیکن میر کا ''شعر شور انگیز'' والا انداز اس میں نہیں ملتا۔ حالانکہ کہانی کا المیہ انجام میر کے مزاج سے پوری مناسبت رکھتا ہے اور اس میں درد انگیز اور پُر تاثیر اشعار نکالنے کے بڑے مواقع تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مثنوی کے اکثر بیانات طویل ہوگئے ہیں اور میر کا لب و لہجہ بجھا بجھا اور افسردہ معلوم ہوتا ہے۔ جسے دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ بڑھاپے اور علالت کے باعث یا کسی دوسری وجہ سے میر اس مثنوی میں اپنی طبیعت کا پورا زور صرف کرنے اور نطق کا اعجاز دکھانے سے قاصر رہے ہیں۔

مثنوی گلشن عشق یعنی قصہّ راجا بلوان مل و چتر سین

اس مثنوی میں بدایوں کے عنایت اللہ روشن نے راجا بلوان مل اور چتر سین کا قصہّ بیان کیا ہے۔ آغازِ قصہّ کے اشعار یہ ہیں:

اب سنئے خامہ کی زبانی   تازہ قصہ، نئی کہانی
تھا ہند میں ایک صاحبِ تخت   راجا بلوان مل، جواں بخت
کرتا یہ دعا بہ آہ و زاری   اک لال دے دے جنابِ باری

ہزار منتوں مرادوں سے بیٹا پیدا ہوا۔ چتر سین نام رکھا گیا۔ چودہ سال کے بعد تخت و تاج کا وارث ہوا۔ حسنِ اتفاق سے سنگل دیپ کی ایک پری کو دل دے بیٹھا۔ پری کے اقربا کو خبر ہوئی تو اسے پابہ زنجیر کردیا۔ نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہوا۔ چتر سین سنگل دیپ پہنچا۔ دایہ کی مدد سے پری کے والدین کو ہموار کرنے میں کامیاب ہوا اور شادی کر کے گھر لوٹا۔

اس روایتی قصے میں شاعر نے ندرت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ ایک پست مثنوی ہے۔ شاعر کی زبان غیر صاف اور ناہموار ہے اور مثنوی میں دلکشی پیدا نہیں ہو سکی۔[۲۱۷] مثنوی گلشنِ عشق (قصہ راجا بلوان مل و چتر سین) کے مصنف عنایت اللہ روشن بدایونی کی ایک اور مثنوی خورشید روشن بھی ہماری نظر سے گزری ہے۔ سال تصنیف ۱۳۱۷ھ ہے۔ مطبع نامی لکھنؤ سے دوسری بار ۱۹۰۴ء میں ۱۶ صفحوں پر مع غزلیاتِ مصنف طبع ہوئی۔ اس میں عشق کا ایک عامیانہ قصہ بیان کیا گیا ہے۔ لیکن زبان و بیان کے لحاظ سے یہ، مثنوی گلشنِ عشق پر فوقیت رکھتی ہے۔

مثنوی افسانۂ غم یعنی قصہّ روپ بسنت

اردو میں اس قصے کو منشی ہرچند رائے ہرچند (سر رشتہ دارِ محکمہ

---

۲۱۷ مثنوی گلشن عشق از عنایت اللہ روشن، مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۸۹۵ء، تعداد ص ۱۴

بندوبست ساگر دلا رائے سنگھ، قوم اگروال ساکن قصبہ سردھنہ ضلع میرٹھ) نے نظم کیا ہے۔ مثنوی کا نام "افسانۂ غم" اور تاریخ تصنیف ۱۸۵۴ء ہے۔ یہ مثنوی مطبع نول کشور، کانپور سے شائع ہوئی تھی۔ ہرچند رائے، ہرچند (خلف رائے سنگھ) نے مثنوی افسانۂ غم (قصہ روپ بسنت) کے علاوہ چار اور مثنویاں بھی لکھیں۔ گلزار بے خار (۱۸۲۶ء) ستم نامہ (۱۸۵۵ء) نامۂ عشق (۱۸۵۶ء) کشف الدقائق (۱۸۶۷ء) وہ آٹھ ضخیم دواوین کے مصنف بھی تھے۔ (۱) رشک گلشن ۱۸۶۴ء، (۲) شایستہ پاسخ ۱۸۶۹ء، (۳) محبت مظہر ۱۸۷۰ء (دو جلدیں)، (۴) گلدستۂ انجمن ۱۸۷۱ء، (۵) بہار شفقی ۱۸۷۲ء (دو جلدیں)، (۶) مرغوب طبیعت ۱۸۷۴ء، (۷) دریاے سخن ۱۸۷۵ء اور (۸) مخزنِ شوق ۱۸۷۷ء۔ ان میں سے دوسرا دیوان ناسخ کے جواب میں، تیسرا بہادر شاہ ظفر، پانچواں میر تقی میر، چھٹا جرأت اور آٹھواں ذوق کے جواب میں لکھا گیا۔ ان کا بیان ہے کہ انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔[218]

مثنوی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتی ہے۔ حمد و مناجات کے بعد سببِ تالیف ہے۔ شاعر نے صراحت کر دی ہے کہ یہ قصہ کبت اور دوہرہ کی شکل میں موجود تھا۔ بعض لوگ اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے اسے اردو میں مفصل لکھا گیا:

کبت اور دوہرہ میں تھا وہ مرقوم　　نہ ہوتا تھا مفصل حال معلوم

ہر چند رائے ہر چند نے قصہ روپ بسنت مجلس رائے بقال کی ہندی روایت سے لیا۔ ہندی کی دوسری روایت لکشمن سنگھ اور ہردیو سہائے کی ہے جو میرٹھ سے ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی۔[219]

راجہ رتن سین کے ہاں بڑھاپے میں بڑی منتوں سے دو بیٹے پیدا

۲۱۸　دیوان ہرچند، محبت مظہر، مقدمہ، ص ۴، ۵

۲۱۹　ہندی کتب برٹش، کالم: ۹۰

ہوئے۔ روپ اور بسنت نام۔ بچپن ہی میں ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ماں مرتے وقت راجہ سے کہہ گئی کہ بیٹوں کو خود سے جدا نہ کرنا۔ بیٹوں کے نوجوان ہونے پر راجہ نے دوسری شادی کی۔ سوءِ اتفاق نئی رانی بڑے لڑکے روپ پر مائل ہوگئی، لیکن روپ نے التفات نہ کیا۔ رانی نے الٹا روپ پر بد چلنی کا الزام لگا کر لڑکوں کو گھر سے نکلوادیا۔ دونوں بھائیوں کی پہلی رات ایک جنگل میں بسر ہوئی۔ بسنت کے سانپ ڈس گیا اور روپ حسن اتفاق سے ریاست بھوپاولی کے لاولد راجہ کا جانشین بن گیا۔ ادھر ایک جوگی نے بسنت کے جسم سے سانپ کا زہر اتارا۔ کچھ مدت بعد بسنت نے ایک سوداگر کی مدد کی اور سوداگر نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔ اسی دوران میں محل پوری کے راجہ کی بیٹی مالتی بسنت پر عاشق ہوئی اور دونوں کی شادی کردی گئی۔ بسنت سوداگر کے ساتھ جہاز میں سفر کر رہا تھا کہ سوداگر مالتی پر عاشق ہو گیا اور اس نے بسنت کو سمندر میں پھینک دیا۔ جہاں اسے ایک مگرمچھ نگل گیا۔ یہ مگرمچھ ایک ماہی گیر کے جال میں پھنسا۔ ماہی گیر نے مگرمچھ کا پیٹ چیر کر بسنت کو زندہ باہر نکالا اور بھوپاولی شہر میں جہاں کا راجہ روپ تھا، فروخت کردیا۔ اس دوران میں سوداگر کے جہاز بھی بھوپاولی پہنچ گئے۔ بسنت نے ایک مالن کے ذریعے مالتی کو اپنے حال سے آگاہ کیا۔ ادھر سوداگر مالتی کو شادی کے لیے مجبور کر رہا تھا۔ بسنت کا اشارہ پاکر مالتی نے سوداگر سے شادی کرنے کی یہ شرط رکھی کہ وہ اسے راجہ اور امراء شہر کی موجودگی میں روپ بسنت کا قصہ سنوائے۔ ڈھنڈورا پٹوایا گیا۔ بسنت نے بھیس بدل کر راجہ روپ کے دربار میں سب کے سامنے یہ قصّہ سنایا۔ بالآخر دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا اور مالتی بسنت کو واپس مل گئی۔

خاتمہ:

یقیں ہے جو پڑھے ہو چشمِ پُر نم	تو رکھا نام میں افسانۂ غم
گنی میں نے جو کہہ کر شوق کے سات	ہوئیں چودہ سو پوری جملہ ابیات

مثنوی میں تسلسل موجود ہے۔ اختصار سے کام لیا ہے۔ اندازِ بیان زیادہ دلکش نہیں۔ بسنت کے سانپ سے ڈسے جانے کی کیفیت ان اشعار میں ملاحظہ ہو:

جگا جب روپ رشکِ ماہ پارا — بسنت کو پیار سے اس نے پکارا
کہ ہو بیدار تو زہرہ جبیں اب — گئی نورِ سحر سے ظلمت شب
ملاہٹ تن پہ جو دیکھی نمودار — تو جانا ڈس گیا ہے مار خونخوار[۲۲۰]

اردو نثر میں اس قصّے کو "فسانہ روپ بسنت" کے نام سے کشوری لال رکن نے لکھا۔ یہ کتاب دہلی سے ۱۸۹۰ میں شائع ہوئی۔ کل صفحات ۸۰ ہیں۔[۲۲۱]

اب شمالی ہندستان کی بعض ایسی مثنویوں کا ذکر کیا جاتا ہے، جن کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں اور جن سے براہ راست استفادے کا موقع نہیں ملا۔

مثنوی قصّہ راجا رام اور کنول دیٔ

بہار کے قصبہ پھلواری شریف کے ایک بزرگ حضرت آیت اللہ جوہری (۱۷۰۷ء - ۱۸۰۱ء) نے راجا رام اور کنول دیٔ کے مقامی قصے کو نظم کیا تھا۔ سنہ تصنیف ۱۷۴۸ء ہے۔ مثنوی کا نام "گوہر جوہری" ہے، جس کا ذکر ایک شعر میں یوں آیا ہے:

کیا ریختہ بیچ یہ مثنوی — رکھا نام میں "گوہر جوہری"

حضرت آیت اللہ، جوشش کے معاصرین میں سے تھے۔ مثنوی کی زبان صاف ہے، لیکن اسلوب پر بارہ ماسے کا اثر نمایاں ہے:

---

۲۲۰ مثنوی افسانۂ غم، ہرچند، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۲۸۲ صفحات ۳۰

۲۲۱ انڈیا کتب، ص ۱۴۰

اساڑھ آیا لگا بادل گرجنے اندھیری رات میں بجلی چمکنے
گھٹا ساون کی کاری جب پڑی جھوم مرے جی بیچ برہا آکرے دھوم
اکارت جائے ہے میری جوانی پیا پردیس، یہ کیا زندگانی[۲۲۲]

حضرت آیت اللہ اور ان کی مثنوی "گوہر جوہری" کے بارے میں مزید معلومات درج ذیل ہیں:

ان کا پورا نام حضرت غلام سرور المعروف بہ شاہ آیت اللہ تھا۔ شاہ محمد مخدوم قدس سرہٗ کے بیٹے تھے، ۱۱۲۶ھ (۱۷۱۴ء) میں پیدا ہوئے۔[۲۲۳] اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور شورش تخلص کرتے تھے۔ بقول عشقی مراثی میں تخلص مذاقی تھا۔[۲۲۴] اُردو مثنوی "گوہر جوہری" میں جوہری تخلص استعمال کیا ہے۔ چوراسی برس کی عمر میں ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء) میں انتقال کیا۔ مثنوی گوہر جوہری کے علاوہ اُردو میں ان کے مرثیے، منقبت، شہر آشوب اور قصائد بھی دستیاب ہوئے ہیں۔[۲۲۵]

مثنوی گوہر جوہری کا ایک نسخہ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری اور ایک نامکمل نسخہ شاہ مجتبیٰ حسن کے کتب خانہ بہار شریف میں محفوظ ہے۔ اس مثنوی کا مفصل تعارف پروفیسر سید حسن عسکری نے رسالہ اُردو، اپریل ۱۹۴۰ میں کرایا تھا۔[۲۲۶] مندرجہ ذیل معلومات اسی ماخذ کی بنا پر پیش کی جارہی ہیں۔

مثنوی کا آغاز حمد و نعت سے ہوا ہے۔ اس کے بعد "مدح سخن" ہے۔

---

۲۲۲ سید حسن عسکری، اردو، اپریل ۱۹۴۰

۲۲۳ تذکرۃ الصالحین بحوالہ "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا"، ص ۲۳۸۔ سید حیدرالدین فضا، صدر شعبہ اردو، پٹنہ کالج کا بیان ہے کہ سال ولادت جو تذکرۃ الصالحین میں ہے صحیح نہیں۔ قاضی عبدالودود، نوائے ادب، بمبئی، اکتوبر ۱۹۵۸ء، ص ۳۸

۲۲۴ تذکرۂ عشقی مشمولہ، دو تذکرے، ص ۱۱۶

۲۲۵ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، ص ۲۳۸

۲۲۶ ص ۲۲۵۔ ۲۶۰

اور مثنوی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پوری مثنوی مختلف بیانات اور داستانوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً: سیرِ گلشن، پیرو مرشد کی مدح، وصفِ عشق، داستانِ پیر، داستانِ گدا، داستان ملک ہڑبونگ، داستان عشق وغیرہ۔ ہر بیان یا داستان کی ابتدا مع ضروری خلاصے کے بحر متقارب میں چند شعروں پر ختم کر کے بحر ہزج میں مفصل بیان مع تمام واقعات نظم کیے گئے ہیں۔ مثنوی کی جان آخری قصہ یعنی "داستانِ عشق" ہے۔ جس میں کنول دیٔ اور راجا رام کے عشق کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ پروفیسر سید حسن عسکری کا بیان ہے: "مثنوی (گوہر جوہری) پر محمد افضل جھنجھانوی کے بارہ ماسے کا اثر خلاف واقعہ نہیں معلوم ہوتا۔ زبان ملتی جلتی ہے۔ فارسی ترکیبوں کا انداز، الفاظ کا استعمال، سب باتیں بکٹ کہانی میں بہت حد تک پائی جاتی ہیں۔ اس لیے قرین قیاس ہے کہ مصنف نے یہ مثنوی بکٹ کہانی کے طرز پر لکھی"۔

قصّے کا خلاصہ یہ ہے کہ اکبر آباد میں ایک خوش رو نوجوان راجا رام رہتا تھا۔ وہ ایک خوب صورت عورت کنول دیٔ پر عاشق ہو گیا۔ رفتہ رفتہ عاشق و معشوق دونوں آتشِ عشق میں جلنے لگے۔ ایک دن کنول دیٔ پوجا کے بہانے گھر سے نکلی۔ راہ میں کسی کے رونے کی آواز سُنی۔ فوراً دل میں درد اُٹھا:

اثر اس نام میں کیا کچھ بلا ہے — شکستِ چینی دل کی صدا ہے
مرے جی بیچ کیا کیا درد بانٹا — کسی کاٹے گلے کا ہے خراٹا

کنول دیٔ اپنے عاشق کے پاس پہنچ گئی تو دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا:

جو کھولا آنکھ یار اپنے کو دیکھا — دل و دلبر نگار اپنے کو دیکھا
جنوں بھڑکا پڑی دیوانگی جاگ — جلے جی میں پکارا آگ رے آگ

محبت جب صبر و قرار کی حدوں سے آگے بڑھ گئی تو ایک رات راجا رام نے کنول دیٔ کو خواب میں دیکھا۔ دونوں میں شکوے شکایتیں ہوئیں۔ کنول دیٔ نے راہ سجھائی کہ اپنے باپ کے ذریعے میرے والدین کو پیام بھجواؤ۔ وہ

منظور کرلیں گے۔ غرض ایسا ہی کیا گیا اور بہت کچھ انتظار کے بعد دونوں کی شادی ہوگئی۔

عاشق و معشوق خوشی خوشی رہنے لگے۔ لیکن چرخ فتنہ پرور کو یہ کب منظور تھا۔ راجا رام کو کام سے باہر جانا پڑا۔ چنانچہ ہجر و فراق کے رنج و الم کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس موقعے پر شاعر نے کنول دیٔ کی زبانی بارہ ماسہ منظوم کیا ہے اور تخییل کی جولانی دکھائی ہے۔ بارہ ماسہ کیا ہے۔ جدائی کے آلام و مصائب کا تڑپا دینے والا بیان ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اساڑھ آیا لگا بادل گرجنے — اندھیری رات میں بجلی چمکنے
گگن پر برق نہیں ہے گا چمکتا — مرا شوقوں ستیں ہے دل پھڑکتا
پیا بن میں بھری برسات روؤں — نہ ہے بر ساتھ کیونکر ساتھ سوؤں
ہرا جنگل ہوا پانی میں اور روکھ — مرا ہردا گیا برسات میں سوکھ
گھٹا ساون کی کاری جب پڑی جھوم — مرے جی بیچ برہا آکرے دھوم
کوئی جھومر کوئی گاویں ملا ریں — سب اپنے پیو سنگ کھکیں دھماریں
پیا مجھ گھر اگر آوے سبیرا — چڑھاؤں اے خضر تیرا میں بیڑا

ایک برس کے جانکاہ انتظار کے بعد کنول دیٔ کی مراد بر آئی اور راجا رام گھر آیا لیکن کنول دیٔ لاغر اور نحیف ہوچکی تھی، بیمار پڑگئی۔ علاج شروع ہوا۔ راجا رام نے بڑے ہاتھ پاؤں مارے لیکن افاقہ نہ ہوا اور موت کی گھڑی قریب آہی پہنچی۔ آخری وقت میں کنول دیٔ نے راجا رام کو بلایا۔ غرض:

دم آخر میں وہ شوریدہ تصویر — ہوا معشوق سے جاکر بغل گیر
لگی کہنے کہ اے دیوانہ میرا — میں تیری شمع تو پروانہ میرا
کوئی ساعت میں آوے گی قیامت — میں جاتی ہوں سدا تو رہ سلامت
تری تئیں دیکھ کر آتی روائی — کہ دے گی اب اجل داغ جدائی
رہے گا کیوں کہ بے لیلیٰ کے مجنوں — پھرے گا کس طرح ہاموں بہ ہاموں

اور یہ کہتے کہتے دم نکل گیا۔ رونے دھونے کے بعد لاش کو جلانے کی جگہ لایا گیا اور چتا کی آگ میں برگِ گل سی وہ نازک بدن دیکھتے ہی دیکھتے راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ راجا رام کی نگاہوں میں دنیا تیرہ و تار ہو گئی۔ چند روز کے بعد لوگوں نے اسے خبر کی کہ راکھ سے ایک شعلہ نکلتا ہے اور راجا رام، راجا رام کہہ کر پکارتا ہے۔ چنانچہ راجا رام وہاں پہنچا اور جب شعلہ نمودار ہوا، وہ اس سے ہم آغوش ہونے کے لیے لپکا اور بھڑک کر فنا ہو گیا۔

دو شعلے جوں ہوا اک شعلہ پیدا   دکھو کثرت میں وحدت کا تماشا

اس کے بعد مثنوی کا خاتمہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی حُسن کاری، شیرینی اور شگفتگی ہے۔ گو ایک مثنوی میں کئی داستانیں بیان کی گئی ہیں، لیکن تسلسل میں کہیں فرق نہیں آنے پایا۔ اصل قصّے میں مقامی ماحول اور معاشرت کی کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔ مثنوی کی زبان قدیم ہے اور بعض مقامات مشکوک بھی ہیں، لیکن جو اشعار صاف ہیں، لطف دے جاتے ہیں اور شاعر کی قادرالکلامی اور شیریں بیانی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

مثنوی طوطی نامہ

یہ مثنوی جعفر علی حسرت کے رشحاتِ قلم میں سے ہے۔ اشپرانگر نے اس کا ذکر اپنی فہرست میں کیا ہے۔ تعداد صفحات ۱۶۰ اور سنہ کتابت ۱۲۱۶ھ ہے۔[۲۲۷] مشہور قصے، شک سپ تتی (طوطی نامہ) سے، جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ مثنوی کسی توتا رام اور اس کی محبوبہ شکر پارہ کے عشق پر مشتمل ہے۔

آغاز:

کس نے مانگا تھا یاں کسے تھی تاب   یا الٰہی یہ عشق خانہ خراب

---

۲۲۷ اشپرانگر، ص ۶۱۰، نمبر ۶۲۷

اس کا ایک مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے میں ہے۔ کلیات حسرت نسخۂ کیمبرج میں مثنوی طوطی نامہ کے شمول کا یقین نہیں۔(۲۲۸) البتہ یہ مثنوی لکھنؤ کے نسخہ میں ہے۔(۲۲۹)

مثنوی انشا

سید انشاء اللہ خاں، انشا نے "رانی کیتکی اور کنور اودے بھان" کی کہانی کی طرح ٹھیٹھ ہندستانی زبان میں ایک منظوم کہانی بھی کہنا چاہی تھی۔ قاضی عبدالودود کا بیان ہے: "غیر مخلوط زبان کی مثنوی یا تو تمام نہ ہو سکی، یا تمام ہوئی تو اس کے کچھ اشعار اب تک نظروں سے پنہاں ہیں۔ یہ مثنوی کلیاتِ انشا کے مطبوعہ نسخوں میں نہیں ہے اور یہی حال اس کے بیشتر مخطوطات کا ہے۔ اس وقت تک کلیات کے صرف دو قلمی نسخے ملے ہیں، جن میں اس مثنوی کے اشعار پائے جاتے ہیں اور دونوں کتب خانۂ مشرقیہ پٹنہ میں ہیں:

شمار ۱۳، ۱۲۳۰ھ کا مکتوبہ ہے اور شمار ۳، ۱۲۶۱ھ فصلی کا لکھا ہوا ہے ...... شمار ۱۳ میں عنوان "مثنوی در لہجہ اردو" ہے۔(۲۳۰)

آغاز:

بنایا یہ سب جس نے ہووے بھلا　　سراہے اسے کیا کوئی جی جلا
بھلے لوگ اس کو سراہا کیے　　تو چپکے ہی چپکے کراہا کیے

اس نامکمل مثنوی میں کل ۵۱ اشعار ہیں۔ تمہید باندھنے کے بعد لکھا ہے:

مجھے نیند آتی نہ تھی ایک رات　　مرے جی نے مجھ کو سنائی یہ بات
کہانی وہ کہیے کہ ہندی کے چھٹ　　نہ رکھے کسی اور بولی کی پُٹ

۲۲۸　مکتوب قاضی عبدالودود بنام راقم الحروف

۲۲۹　ایضاً

۲۳۰　معاصر شمارہ ا، ص ۵۷

اس کے بعد ٹھیٹھ ہندستانی میں قصہ نظم کرنے کی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ دوست احباب نے انھیں سننے کے بعد کہا کہ اگر تمھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی تو سب میں تمھاری "ناک اونچی" ہو جائے گی۔ یہ بیان ۱۹ اشعار میں آیا ہے۔ قصے کا آغاز اس طرح کیا ہے:

ہوا ایک دولہا دلہن کا بیاہ   تو بڑھنے لگی دن بدن ان کی چاہ
جو چاہت ہوئی ایک کو ایک کی   جو آنے لگی لاج کو بھی ہنسی
بچھڑ جاتے تھے جو کبھی اک گھڑی   تو لگتی تھی ساون کی ایسی جھڑی
نکلتے تھے آنکھوں سے ان کی دھوئیں   اُبل اٹھیں برسات میں جوں کنویں
جو کچھ چاہیے پاس تھا ان کے سب   پر ان کو یہ لپکا پڑا تھا کڈھب
نہ ہنستے تھے جب تک وہ روتے نہ تھے   بچھڑنے کے دھڑکے سے سوتے نہ تھے
بھڑکنے لگی تلملاہٹ کی آگ   لگا ہونے آپس میں گہرا سہاگ
ملولے مسوسے بہت بڑھ چلے   لگے سوجنے سیکڑوں اڑ تلے
نیا دولھا تھا اور دلہن تھی نئی   تو اک سُبھ گھڑی کی لگن لگ گئی[۲۳۱]

کلیات انشا کے متذکرہ بالا نسخوں میں یہ مثنوی اسی شعر پر ختم ہو جاتی ہے۔ انشا نے کرداروں کے نام نہیں لیے، لیکن قصے کی اُٹھان سے ظاہر ہے کہ وہ مقامی رنگ کا کوئی قصہ بیان کرنا چاہتے تھے۔ یہ قصہ ان کا طبع زاد تھا یا کسی مقامی روایت سے ماخوذ تھا؛ اس سلسلے میں قیاس آرائی سے کام لینا غلط ہوگا۔ البتہ یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ اپنی نثری کہانی "رانی کیتکی اور کنور اودے بھان" کی طرح وہ اس مثنوی کو بھی مقامی رنگ روپ میں پیش کرنا چاہتے ہوں گے اور اسے "ہندی" یا خالص ہندستانی زبان میں بیان کرنے کے لیے انھوں نے مثنوی کے پلاٹ، کردار، مناظر اور واقعات کا جو نقشہ تیار کیا ہوگا، وہ ہندستانی مزاج اور ماحول کے مطابق ہوگا۔ لیکن انشا غالباً اپنی اس مثنوی کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔

---

۲۳۱   کلیات انشاء، شمار ۱۳ اور شمار ۷ ۳، کتب خانہ مشرقیہ، پٹنہ (بحوالہ معاصر شمارہ ایک، ص ۵۷)

مثنوی کنور و چندر کرن

مصنف، احمد علی، موتی لال ولد بہادر سنگھ کاتب نے یہ نسخہ گڑھ مکتیشر میں ۱۲۴۰ھ میں نقل کیا۔ اوراق ۹۔[۲۳۲]

مثنوی راجا چترمکٹ و رانی چندر کرن

از روشن علی، مکتوبہ ۱۸۸۰ء،

آغاز:

یہی کرتا ہوں میں دل کو تسلّی   جدھر دیکھو اودھر اس کی تجلّی

اس مثنوی کا مخطوطہ برٹش میوزیم میں روشن علی کی دوسری تین مثنویوں (قصہ لال و ہیرا، قصّہ طوطا و مینا اور قصّہ جُمجمیہ) کے ساتھ ایک مجموعے میں محفوظ ہے۔[۲۳۳]

مثنوی راجا چترمکٹ و رانی چندر کرن

از: راغب امروہوی

اس قصے سے متعلق اردو میں ایک اور مثنوی بھی لکھی گئی۔ مصنف سمن لعل متخلص بہ راغب۔ یہ امروہے کا باشندہ تھا۔ ہندستان کے اس ہردلعزیز قصے کو نظم کرکے راغب نے اسے سرہنری ایلیٹ سے معنون کیا، جسے وہ اپنا مربی کہتا ہے اور جس کی شان میں چند قصیدے اسی مثنوی میں شامل ہیں۔ ایک شعر میں اپنا تخلص یوں بیان کرتا ہے:

سمن لعل معروف ہوں در جہاں   تخلص ہے راغب مرا دوستاں

---

۲۳۲ ادارہ ادبیات، جلد دوم، نمبر ۲۵۵، ص ۴۹

۲۳۳ بلوم ہارٹ، برٹش، ص ۲۸، نمبر ۵۶

مثنوی میں چند اشعار امروہے کی تعریف میں بھی ہیں۔ سنہ اختتام ۱۸۴۷ء مخطوطہ برٹش میوزیم۔[۲۳۴]

مثنوی قصہّ گوپی چند

گوپی چند بھرتری کا یہ قصہ سب سے پہلے ہندی میں کسی شخص "ہیّا لال" نے لکھا۔[۲۳۵] ہندی کی دوسری مشہور روایتیں لکشمن سنگھ (آگرہ ۱۸۶۷ء، دہلی ۱۸۷۹ء،[۲۳۶] کلکتہ ۱۹۰۷ء،[۲۳۷] کانپور ۱۹۱۰ء)[۲۳۸] اور سہدیو (بنارس ۱۸۸۲ء)[۲۳۹] کی ہیں۔ مارواڑی زبان میں اسے موتی لال نے لکھا (آگرہ ۱۸۶۹ء)۔[۲۴۰] پنجابی زبان میں اس قصےّ کو دیوی دیال (لاہور ۱۸۷۰ء)،[۲۴۱] گنگا رام (لاہور ۱۸۷۱ء،[۲۴۲] فارسی رسم الخط میں لاہور ۱۸۷۷ء)[۲۴۳] اور ٹھاکر داس (لاہور ۱۸۸۰ء)[۲۴۴] نے نظم کیا ہے۔

انبی پرشاد، مدہوش نے ہیّا لال سے قصہّ لے کر اسے اردو مثنوی کے پیرائے میں بیان کیا۔[۲۴۵] مدہوش کی یہ مثنوی خاصی مقبول ہوئی اور بار بار

---

۲۳۴ بلوم ہارٹ، برٹش، ص ۴۴
۲۳۵ بلوم ہارٹ، برٹش، ص ۱۱۶
۲۳۶ انڈیا ہندی، ص ۶۷، نیز ہندی کتب برٹش کالم ۹۰
۲۳۷ برٹش ہندی، ص ۱۶۶
۲۳۸ ایضاً، ص ۳۶۴
۲۳۹ ہندی کتب برٹش کالم ۱۵۲
۲۴۰ انڈیا ہندی، ص ۶۷
۲۴۱ انڈیا پنجابی، ص ۱۹
۲۴۲ ایضاً، نیز پنجابی کتب برٹش کالم ۱۴
۲۴۳ انڈیا ہندی، ص ۶۹
۲۴۴ پنجابی کتب برٹش کالم ۴۰
۲۴۵ بلوم ہارٹ، برٹش کتب، ص ۱۱۶

شائع کی گئی۔ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں اس کے دو ایڈیشن محفوظ ہیں جو دہلی سے ۱۸۷۶ء اور ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئے، پہلے کے صفحات ۲۸ اور دوسرے کے ۳۲ ہیں۔[۲۴۶]

کتب خانہ انڈیا آفس لندن میں مثنوی گوپی چند از انبی پرشاد مدہوش کے مندرجہ ذیل پانچ ایڈیشن محفوظ ہیں۔

دہلی ۱۸۶۹ء، دہلی ۱۸۷۲ء، دہلی ۱۸۷۵ء، دہلی ۱۸۷۷ء، دہلی ۱۸۷۸ء[۲۴۷]

اس مثنوی کا ایک اور ایڈیشن اسٹیٹ لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ یہ ۱۸۷۱ء میں دہلی سے شائع ہوا۔

انبی پرشاد مدہوش، اس مثنوی کے علاوہ بعض دوسری کتابوں کے بھی مصنف تھے۔ ان کی تصانیف — "سیرستان انگلینڈ"، "گیان مالا" اور قصہ "سیر سری ناسکیت" بھی برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔[۲۴۸] تذکرہ آثار الشعراے ہنود میں ان کا ایک شعر درج ہے:

پیالا پی کے وحدت کا، تماشا دیکھ قدرت کا
جو اے مدہوش وصلت کا اگر کچھ بھی مزا چاہے

بشاش نے انھیں "مترجم پوتھی گوپی چند" لکھا ہے اور اس کے علاوہ حالات نہیں بتائے۔[۲۴۹]

اسی کتب خانے میں "قصہ گوپی چند بھرتری" کا ایک نثری نسخہ بھی موجود ہے۔ اس کا مصنف معلوم نہیں۔ یہ لکھنؤ سے ۱۸۷۲ء میں شائع ہوا تھا۔

---

۲۴۶ ایضاً، ص ۳۱

۲۴۷ انڈیا مطبوعات، ص ۱۶۰

۲۴۸ بلوم ہارٹ، برٹش کتب، ص ۳۱

۲۴۹ بشاش، دیبی پرشاد، تذکرہ آثار الشعراے ہنود، ص ۱۲۰

تعداد صفحات ۲۰۔[۲۵۰]

اس قصّے کی دوسری نثری روایتیں یہ ہیں:

(۱) گوپی چند اردو (نثری ڈراما) از نوشیرواں جی مہربان جی آرام، بمبئی۔[۲۵۱]

یہ ڈراما بعد میں غلام حسین عرف حسینی میاں ظریف کے نام سے بھی شائع ہوا۔[۲۵۲]

(۲) گوپی چند اُردو (ڈراما) منشی ونائک پرشاد طالب بنارسی، شاگرد راسخ دہلوی۔[۲۵۳]

(۳) مہاراجہ بھرتری (اُردو ڈراما) از محمد عبدالعزیز فائق لکھنوی[۲۵۴]

(۴) راجہ گوپی چند، مجہول المصنف، لاہور[۲۵۵]

اردو مثنوی میں اس قصّے کو انبی پرشاد مدہوش کے علاوہ دو اور شاعروں نے بھی نظم کیا ہے:

مثنوی قصہ گوپی چند اُردو، از محمد عمر خاں، صفحات ۲۸، دہلی ۱۸۷۸ء[۲۵۶]

مثنوی گوپی چند اُردو از لالہ جسونت رائے (مطبوعہ)[۲۵۷]

کتب خانہ انڈیا آفس لندن میں مدہوش کی "سیر ناسکیت اُردو منظوم" کے دو ایڈیشن (سیالکوٹ ۱۸۷۶ء اور ۱۸۷۹ء) محفوظ ہیں۔ اس مثنوی کا نام

---

۲۵۰ ایضاً، ص ۱۰۲

۲۵۱ اردو ڈراما، عشرت رحمانی ص ۲۰۴، نیز انڈیا مطبوعات ص ۱۶۳

۲۵۲ اردو ڈراما، ص ۲۲۱

۲۵۳ اردو ڈراما، ص ۲۲۲

۲۵۴ اردو ڈراما، ص ۲۴۸

۲۵۵ فہرست کتب خانہ، ص ۳۲

۲۵۶ انڈیا مطبوعات، ص ۱۶۰

۲۵۷ صولت لائبریری، رام پور

''غمزۂ دلربا'' ہے۔(۲۵۸) اس کے علاوہ انڈیا آفس میں مدہوش کی ایک اُردو مثنوی قصّہ ''توتا مینا'' بھی موجود ہے۔ یہ دہلی سے ۱۸۷۷ء اور ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی۔(۲۵۹)

قصّہ یوں ہے: دھارانگری کے راجا گوپی چند کی رانی رتن کنور نے سپنے میں اپنے خاوند کو جوگی کے لباس میں دیکھا اور بہت پریشان ہوئی۔ راجا گوپی چند نہایت وجیہ اور شکیل تھا اور اس کے پاؤں میں ایک نورانی نشان بھی تھا۔ ایک دن راجا غسل کر رہا تھا کہ اس کی ماں میناوتی کی نظر اپنے بیٹے کے خوب صورت جسم پر پڑی جسے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ سوچنے لگی کہ جوانی میں گوپی چند کا باب راجا پدم سین بھی اسی طرح حسین و جمیل تھا۔ لیکن بڑھاپے کی خزاں نے گلشن شباب کی رنگینی ختم کردی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ جب موت ہر شے کا سلسلہ منقطع کر دیتی ہے اور ظاہری حسن و جمال اس قدر عارضی ہے تو اس سے دل لگانے سے حاصل؟ اتفاقاً میناوتی کا بھائی راجہ بھرتری گورو گورکھ ناتھ کے ساتھ اپنی بہن سے ملنے دھارانگری آیا۔ وہ راج پاٹ تیاگ کر جوگی ہو چکا تھا۔ اس نے بھی دنیا کی بے ثباتی اور جسم و جمال اور مال و دولت کی ناپائیداری کی باتیں سنائیں۔ چنانچہ میناوتی نے اپنے اکلوتے بیٹے گوپی چند کو بلایا اور کہا کہ وہ بھی موہ مایا سے منہ موڑ کر جوگی بن جائے۔ کچھ دیر ماں بیٹے میں بحث و تکرار ہوتی رہی۔ گوپی چند نے اپنی سولہ رانیوں کا ذکر کیا کہ میں انھیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ مجھے در در کی ٹھوکریں کھانے اور بھیک مانگنے پر کیوں مجبور کرتی ہو۔ میرے چلے جانے سے محلات میں کہرام مچ جائے گا۔ میری سلطنت برباد ہو جائے گی۔ ماں نے بتایا کہ دنیا موہ اور مایا کا جال ہے۔ یہاں کی ہر خوشی جھوٹی اور ہر مسرت عارضی ہے۔ نجات چاہتے ہو تو جوگ اختیار کرلو۔ بالآخر گوپی چند نے شاہی لباس اُتار پھینکا اور گورکھ ناتھ کا چیلا بن گیا۔ اُسے پہلا

---

۲۵۸ انڈیا مطبوعات، ص ۱۶۴

۲۵۹ انڈیا مطبوعات، ص ۱۴۹

حکم یہ دیا گیا کہ اپنے سابقہ محل کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر بھیک مانگ آؤ۔ جو کل بادشاہ تھا، آج فقیر بن کر الکھ جگانے لگا۔ بیٹے کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی دیکھ کر ماں کی مامتا جوش میں آئی۔ جُدائی کے خیال سے وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ رانی رتن کنور بے ہوش ہو گئی۔ سب نے بہتیرا زور لگایا کہ گوپی چند کو روک لیں۔ لیکن اس نے کسی کی ایک نہ سنی اور گرو کے ساتھ شہر چھوڑ کر چلا گیا۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں، پھرتا پھراتا گوپی چند بنگال میں پہنچا۔ اس کی بہن چمپاوتی بنگال کے راجا اگر سین سے بیاہی ہوئی تھی۔ ایک دن وہ محل کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ باندی نے اُسے خیرات میں ہیرے موتی دینا چاہے۔ گوپی چند نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ فقیروں کو تو روٹی کے ٹکڑوں سے غرض ہے۔ اس ناقدری پر باندی اس سے اُلجھنے لگی۔ بات چمپاوتی تک پہنچی۔ وہ خود دروازے پر آئی۔ جوگی سے سوال و جواب ہوئے۔ بالآخر پاؤں کے نورانی نشان سے بہن نے بھائی کو پہچان لیا۔ گوپی چند نے جوگی ہونے کی سرگزشت سنائی اور خیرات لے کر اپنی راہ چل دیا۔ چمپاوتی کو بھائی کی یہ حالت دیکھ کر ایسا سخت صدمہ ہوا کہ اس کے جاتے ہی وہ غش کھا کر گری اور گرتے ہی مر گئی۔ راجا اگر سین دربار سے بھاگا بھاگا آیا اور باندی کے بتانے پر گوپی چند کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بڑی جستجو کے بعد اُس نے جوگی کو جا لیا۔ گوپی چند کو رنج ہوا کہ اس کی بدولت چمپاوتی کی جان گئی۔ چنانچہ اس نے گورکھ ناتھ کو یاد کیا اور گرو کی دُعا سے چمپاوتی زندہ ہو گئی۔ غرض خاطر مدارات کے بعد اس نے بھائی کو خوشی خوشی رخصت کیا۔ یہاں قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ اس واقعے کا اثر اگر سین اور چمپاوتی پر گہرا ہوا اور وہ دونوں بھی راج پاٹ چھوڑ کر فقیر ہو گئے۔

انبی پرشاد مدہوش کی مثنوی "قصہ گوپی چند" کا نسخہ رامپور ۱۸۷۱ء میں دہلی سے مصوّر شائع ہوا۔ یہ ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے میں ۲۱ سطریں ہیں۔ مثنوی کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتی ہے۔ مصنف نے صراحت

کردی ہے کہ پہلے یہ قصہ ناگری میں تھا۔ اُس نے اُردو میں منتقل کیا۔ شروع کے اشعار یہ ہیں:

کروں حمد معبود کیوں کر رقم — زباں میں نہ طاقت نہ تابِ قلم
عجب قدرتیں اس کی ہیں بے شمار — وہی جانتا ہے جو ہے ہوشیار
گدا کو کرے شاہ، شہ کو گدا — کسی کو نہ یارائے چون و چرا

آغازِ داستانِ سحر بیان:

پلا ساقیا ارغوانی شراب — کہ دل سے مرے دور ہو پیچ و تاب
تھا اک شہر دھارا نگر دل پسند — کہ راجا تھا واں کا سری گوپی چند
عدالت سخاوت میں مشہور تھا — پدم اس کے پا میں بھی اک نور تھا

خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے:

جو دیکھا کہ بھائی نہیں ٹھیرتا — ہوئی پھر تو ناچار اور یہ کہا
تمھیں کیا کسی کی محبت پڑی — یہی خاصیت ہے رہ جوگ کی
منگائی وہ بھوجن کھلانے اُنے — مرخص کیا بھائی کو بہن نے
ہوئے باکمال اور بن کو چلے — کمال اپنا دکھلا بہن کو چلے
گورو چیلا دونوں بہم مل چلے — وہ کامل ہو گور جس کو پورا ملے

ہوا قصہ گوپی چند اب تمام
الٰہی ہو مقبول ہر خاص و عام

اس کے بعد مدہوش کا کہا ہوا قطعہ تاریخ ہے، جس سے مثنوی کا سالِ تصنیف ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) برآمد ہوتا ہے۔ دوسرا قطعہ تاریخ عبداللہ خاں رسا کا ہے۔ اس سے بھی یہی سنہ مستنبط ہوتا ہے۔ خاتمۃ الطبع کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ انبی پرشاد مدہوش بیٹے تھے لالہ گردھاری لعل کے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ مثنوی میں قصے کے تمام واقعات بلا کم و کاست نظم کیے گئے ہیں۔ زبان و بیان کی سادگی و سلاست میں دہلوی لہجے کی کھنک ہے۔ لیکن مثنوی

کی ادبی حیثیت نکھارنے پر زیاد توجہ نہیں کی گئی۔

یہ سیدھا سادا قصہ ہندستانی مزاج کی ایک خاص کیفیت کا ترجمان ہے۔ اس میں زندگی کے مادی پہلو پر روحانی پہلو کی فوقیت ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تیاگ کا بنیادی فلسفہ یہی ہے کہ انسان زندانِ علائق ہے آزاد ہو جائے، نفسِ کلی کے عرفاں کے لیے خودی یا اہنکار کو فنا کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس قصے میں باطنی انقلاب کے بعد راجا کو بھیک مانگتے ہوئے دکھایا گیا ہے، جو تسلیمِ خودی کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گیان یوگ کے اس نظریے کی غلط تعبیر نے عوام میں بے عملی کے رجحانات پھیلانے میں مدد دی جن کا ردعمل کرم یوگ کے فلسفے میں ظاہر ہوا۔ لیکن اس کے باوجود صدیوں تک باطنیت کے یہ خیالات سادھوؤں، سنتوں اور جوگیوں کی تعلیمات کی بدولت ہندستان میں بہت مقبول رہے اور ان کی ایک جھلک اس قصّے میں بھی مل جاتی ہے۔ قصّے کا انجام اخلاقی ہے اور اس میں گرو کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ مختلف روایتوں میں گُرو کی حیثیت سے مختلف نام آئے ہیں۔ لیکن دہلوی روایتوں میں زیادہ تر گورکھ ناتھ کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس لوک قصّے سے متعلق اُردو میں دو اور مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ ایک کے مصنف لالہ جسونت رائے[۲۶۰] اور دوسری کے محمد عمر خاں[۲۶۱] ہیں، لیکن سردست ہم ان کا تفصیلی تعارف پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

مثنوی راجا رگھبیر

از ہردیو سہائے۔ یہ ایک جوگی کا قصّہ ہے، جس نے راجا رگھبیر کا سوانگ بھرا تھا۔ یہ کتاب میرٹھ سے ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔[۲۶۲]

---

۲۶۰ صولت لائبریری، رام پور

۲۶۱ انڈیا مطبوعات، ص ۱۶۰

۲۶۲ بلوم ہارٹ، برٹش کتب، ص ۱۱۱ (نشان (۱۰) ۹۰.۱۰.۱۴۱۱۹)

مثنوی تحفۂ مشتاق معروف قصہ بگّامل

از گلاب سنگھ متخلص بہ مشتاق۔ بلوم ہارٹ کا بیان ہے کہ اس مثنوی میں ایک مقبول عام کہانی کو اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ یہ مثنوی دہلی سے ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی۔ صفحات ۱۲۔ [۲۶۳]

مثنوی راجا کنور سین و رانی چتراولی

اس مثنوی کا مخطوطہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ مصنف کا نام اور سنہ تصنیف معلوم نہیں ہے۔ مثنوی کی زبان زیادہ قدیم نہیں۔ بلوم ہارٹ کا بیان ہے کہ مثنوی انیسویں صدی عیسوی میں لکھی گئی ہوگی۔

خدا ہے محمد، محمد خدا   کہے اوس بن اوس کی کوئی کیا ثنا

تمہید میں مصنف لکھتا ہے کہ اس مثنوی کا قصہ ہندستان میں بہت مقبول ہے۔ اس لیے میرے دل میں اسے نظم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ کل اوراق ۱۲۲۔ [۲۶۴]

مثنوی ہنس جواہر

ہنس جواہر کا یہ عوامی قصہ سب سے پہلے قاسم شاہ دریابادی نے بھاشا میں لکھا۔ یہ سمت ۱۷۸۸ کے لگ بھگ زندہ تھے۔[۲۶۵] اس کا مخطوطہ پٹنہ کی نمائش مخطوطاتِ اُردو میں پیش کیا گیا تھا (مملوکہ پنڈت اودے شنکر شاستری) اسے ۱۱۲۶ھ کی تصنیف بتایا گیا ہے۔ لیکن اس قصّے کے ساتویں ایڈیشن (مملوکہ معراج دھولپوری) سے جو نامی پریس لکھنؤ سے اُردو رسم الخط میں ۱۹۰۶ میں شائع

---

۲۶۳ ایضاً، ص ۱۰۷

۲۶۴ ایضاً، ص ۴۳

۲۶۵ ہندی ساہتیہ کا اتہاس، شکل، ص ۱۰۲

ہوا تھا، اس کا ۱۱۴۹ھ میں تصنیف ہونا پایا جاتا ہے۔ قصے کے تیئسویں بند سے مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو:

گیارہ سے اونچاس جو باجا   تب یہ کتھا پریم کب ساجا

پنڈت بیج ناتھ نے اسے فارسی رسم الخط میں مرتب کرکے لکھنؤ سے ۱۸۷۰ء میں شائع کیا تھا۔(۲۶۶) اس قصے کے ۱۸۹۸ء، ۱۹۰۱ء اور ۱۹۱۰ء کے ایڈیشن برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔(۲۶۷)

۱۹۰۶ء کے ایڈیشن کے سرورق پر اس قصے کے اُردو ترجمے کا اشتہار بایں الفاظ درج ہے:

"قصہ ہنس جواہر اُردو۔ اکثر صاحبان بسبب عدم واقفیت زبان بھاکا کے اس عجیب و غریب قصے کے مطالعے سے محروم رہ جاتے تھے۔ ان کے واسطے مطبع نے نظم اُردو میں ترجمہ کراکے چھاپا ہے"۔

بلوم ہارٹ نے "ہمت" کی مثنوی ہنس جواہر اُردو، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۰۰ء کا ذکر کیا ہے۔(۲۶۸) مندرجہ بالا اشتہار غالباً اسی مثنوی کا ہے۔

قصہ ہنس جواہر کا ایک منظوم ترجمہ مولوی محمد احسن وحشی نگرامی نے بھی کیا تھا۔ یہ "آہ وحشی" کے نام سے مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا۔(۲۶۹) "صدیق" میں "آہ وحشی" کے علاوہ احسن وحشی کی چھے اور مطبوعہ تصانیف کے نام بھی ملتے ہیں۔ ان میں سے پانچ ناول ہیں اور چھٹی کتاب "وفیات الاخیار" میں ہندستان کے مشاہیر صوفیاء و فقرا کی تاریخ وفات ومقام مدفن سے متعلق معلومات درج ہیں۔(۲۷۰)

---

۲۶۶ انڈیا ہندی، ص ۶۷

۲۶۷ ہندی ص ۱۵۰

۲۶۸ برٹش، ضمیمہ ص ۱۷۱

۲۶۹ فہرست مطبوعات نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۳۲ء، ص ۱۰۷، مکتوب معراج دھولپوری بنام مولف

۲۷۰ صدیق، ص ۱۵

بلوم ہارٹ نے مثنوی ہنس جواہر اردو کے مصنف کا نام "ہمّت" بتایا ہے اور مزید کسی قسم کی صراحت نہیں کی۔ کہانی عشق و محبت کے افسانے پر مبنی ہے۔ اس مثنوی کا تیسرا ایڈیشن، ۱۹۰۰ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ تعداد صفحات ۶۸۔[۲۷۱] "ہنس جواہر" نام کی ایک فارسی مثنوی بھی برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس کے مصنف جے سکھ رائے، زیرک دہلوی ہیں۔ سنہ اختتام ۱۲۵۶ھ۔ مصنف ترقیمے میں اسے "نل دمن ثانی" قرار دیتا ہے۔ اس مثنوی میں "ہنس" شہزادۂ بلخ اور چین کی شہزادی کا افسانہ عشق بیان کیا گیا ہے۔[۲۷۲]

قصہ برہ بھبھوکا و قصہ پریم لوکا

اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی نے تذکرہ گل عجائب میں فضل اللہ فضلی کے ترجمے میں لکھا ہے کہ "قصّہ برہ بھبھوکا و قصہ پریم لوکا بزبان ہندی از و یادگار است"۔[۲۷۳] تمنا نے اس کا نمونہ پیش نہیں کیا۔ غالباً یہ قصّہ بطور مثنوی ہی نظم ہوا ہوگا۔

مثنوی گلدستۂ عشق

"دکنی زبان کی اس مثنوی میں نواب چند کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ کسی شاعر منشی نے اسے فرخ سیر کے عہد میں ۱۱۲۲ھ میں لکھا اور سعادت خاں کے نام سے معنون کیا۔ آغاز: الٰہی جگت کا کرنہار توں

تعداد صفحات ۳۰۰، فی صفحہ ۱۵ بیت۔[۲۷۴]

---

۲۷۱ بلوم ہارٹ، ضمیمہ، ص ۱۷۱ (نشان (۱) ۱۴۱۱۲.d.۲۶)

۲۷۲ ریو، ص ۷۲۸

۲۷۳ تذکرہ گل عجائب، ص ۱۲۲

۲۷۴ اشپرانگر، ص ۶۳۷

مثنوی قتیلِ عشق

یہ مثنوی برٹش میوزیم، لندن میں دیوانِ بارش قلمی (اُردو) کے شروع میں درج ہے (اوراق ۲ ب سے ۴۱ الف) شاعر کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ البتہ کلام سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ نواب علی بہادر، باندہ کا ملازم تھا۔ قطعۂ تاریخ کے مطابق مثنوی ۱۲۶۶ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس میں محبوب نامی ایک سوداگر کے لڑکے اور جوہر کی بیٹی کیتکی کی داستانِ عشق بیان کی گئی ہے۔ آغاز:

مجھے اپنے کرم سے یا الٰہی
دیارِ عشق کی دے بادشاہی[۲۷۵]

مثنوی قصہ ست کنور

قصہ ست کنور کو بہار کے ایک شاعر "جگرناتھ سنگھ" نے بطور مثنوی نظم کیا۔ اس کے ایک قلمی نسخے کا ذکر مولف "مثنویاتِ راسخ" نے کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ مثنوی کے شروع میں عنوان نہیں، بلکہ "داستان بہ زبان ہندوی آمیز" لکھا ہوا ہے۔ مثنوی کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۲۱۱ فصلی میں تصنیف ہوئی۔ ترقیمہ یہ ہے:

"تمام شد ...... نسخہ قصہ ست کنور تصنیف لالہ جگر ناتھ سنگھ بہ خط خام ...... بکرماجیت ولد مچھو سنگھ ...... مالک پٹے دار موضع مخدوم پور پرگنہ آرہ سرکار شاہ آباد ...... بتاریخ پانزدہم ماہ ساون بروز جمعہ ۱۲۱۱ھ فصلی بہ عملداری کمپنی ...... تحریر یافت"۔ قصے کے بارے میں مصنف نے اس قدر صراحت کردی ہے کہ اسے انھوں نے اپنے دوستوں کی زبانی سُن کر قلم بند کیا۔ مثنوی چار سو ابیات پر مشتمل ہے۔ زبان غیر صاف اور ناہموار ہے۔[۲۷۶]

---

۲۷۵ برٹش، ص ۴۳

۲۷۶ مثنویات راسخ، ص ۴۳

مثنوی قصہ جمینی بھان

مثنوی قصہ جمینی بھان مجہول المصنف، صفحات ۴۰، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۴۸ء[۲۷۷]

مثنوی قصہ تمبولن

مثنوی قصہ تمبولن اُردو از علی خاں، صفحات ۷۷۔ گجراتی رسم الخط میں، بمبئی ۱۸۷۲ء[۲۷۸]

مثنوی غمزۂ دلربا یعنی ناسکیت اُردو منظوم

اس کے مصنف انبی پرشاد مدہوش ہیں، جن کا ذکر قصہ گوپی چند کے ضمن میں کیا جاچکا ہے۔ مثنوی غمزۂ دلربا میں جوگی ناسی کیتو کا عوامی قصہ نظم کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی ۱۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک ایڈیشن سیالکوٹ سے ۱۸۷۶ء اور دوسرا ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا۔[۲۷۹] انھوں نے یہ قصہ ہندی سے لیا اور ہندی میں چرن داس نے سنسکرت سے ترجمہ کیا، جو دہلی سے ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔[۲۸۰]

---

۲۷۷ انڈیا مطبوعات، ص ۱۶۰

۲۷۸ ایضاً، ص ۱۶۳

۲۷۹ انڈیا مطبوعات، ص ۱۶۴

۲۸۰ انڈیا ہندی ۴۵

باب سوم

نیم تاریخی قصّے

مثنویات ہیر و رانجھا

ہیر اور رانجھا کا افسانۂ عشق پنجاب کا مشہور و معروف قصہّ ہے اور اب تک خاص و عام میں مقبول ہے۔ پنجابی زبان میں اسے سب سے پہلے ''دمودر اروڑہ'' ساکن قصبہ جھنگ نے لکھا۔ اس نے یہ قصہ راجارام کھتری عرف گجرال ساکن قصبہ بھیرہ، ایک عینی شاہد سے سُنا۔ دمودر اس قصےّ کو اکبر کے زمانے کا بیان کرتا ہے۔(1) اس کے بعد اس قصےّ کو متعدد شاعروں نے اپنے اپنے طور پر بیان کیا۔ ان میں سے گورداس بھلاؔ، گوبند سنگھ، احمد، شاہ چراغ، مقبل، وارث شاہ، فضل شاہ اور مولا بخش کشتہ کی روایتیں قابل ذکر ہیں۔(2) پنجابی زبان میں ان تصانیف کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ پنجابی کے علاوہ سندھی زبان میں بھی متعدد شاعروں نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں ایک شخص حاجی احمد بخش خادم نے ہیر کا ''نمائش نامہ'' لکھا ہے۔ سید حیدر شاہ اور فقیر غلام نے ہیر رانجھا کی مکمل داستان نظم کی ہے۔ خلیفہ نبی بخش نے اس قصےّ پر مبنی ایک ''سی حرفی'' تصنیف کی ہے۔(3)

سندھی زبان میں اس قصےّ کو حیدر بخش حیدر آبادی نے بھی لکھا۔ یہ کتاب کراچی سے ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی۔(4) ہندی زبان میں بھی اس قصےّ پر مبنی دو کتابیں برٹش میوزیم لندن میں ہیں۔ ایک بنارس سے ۱۸۷۶ء میں شائع

---

۱ مولوی محمد شفیع، ا۔ک۔م، اگست ۱۹۲۷ء

۲ ایضاً

۳ ماہِ نو، کراچی، جون ۱۹۵۹ء

۴ سندھی کتب، برٹش کالم ۷

ہوئی۔[5] (مجہول المصنف) دوسری بمبئی سے ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے مصنف آنندی لال ہیں۔[6]

قصہ

رانجھا (مغربی پنجاب) کے ایک گاؤں ہزارہ کا زمیندار جاٹ تھا۔ ہیر قریب کے ایک قصبے جھنگ سیال کے سردار چوچک خاں کی بیٹی تھی اور حسن و جمال میں اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی۔ رانجھے نے ایک رات خواب میں ہیر کو دیکھا اور صبر و قرار کھو بیٹھا۔ اس دوران رانجھا کے باپ کا انتقال ہوا اور بھائیوں میں جائداد کی تقسیم کے سلسلے میں جھگڑے پیدا ہوگئے۔ رانجھا ان سے تنگ آکے پانچ پیروں کی زیارت کے لیے ملتان کو چل دیا۔ پانچ پیر اسے راستے میں مل گئے اور انھوں نے رانجھے کو ہیر کا پتا دیا۔ جھنگ کے قریب پہنچتے ہی تائید غیبی سے رانجھے کی ملاقات ہیر سے ہوگئی اور نگاہیں ملتے ہی دونوں ایک دوسرے کا کلمہ پڑھنے لگے۔ رانجھا سوائے گلہ بانی اور بنسری بجانے کے اور کچھ جانتا نہیں تھا۔ ہیر اسے اپنے باپ کے پاس لے گئی اور گلہ بانی کی خدمت سپرد کرائی۔ دن رات کے قرب کی وجہ سے محبت کی پینگیں بڑھنے لگیں۔ ہیر کے والدین کو خبر ہوئی تو انھوں نے ہیر پر پابندی عائد کرنا چاہی، لیکن ہیر راتوں کو چھپ چھپ کر رانجھے سے ملنے لگی۔ تنگ آکر ہیر کے والدین نے اسے گھر میں نظر بند کردیا۔ رانجھے کی معمولی حیثیت کے باعث اس سے ہیر کی شادی سیالوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ انھوں نے اسے رنگ پورہ کے رئیس سیدا سے منسوب کردیا۔ ہیر نے انکار کیا اور نکاح کے وقت قاضی سے بھی بحثی۔ لیکن پیش نہ گئی اور مکر و حیلہ سے نکاح ہوگیا۔ ہیر کو جہیز میں دوسرے ساز و سامان کے ساتھ بھینسوں کا ایک گلہ بھی ملا۔ لیکن بھینسیں رانجھے سے اتنی مانوس تھیں کہ اس

---

۵ ہندی کتب، برٹش کالم ۶۷

۶ ایضاً، برٹش کالم ۱۵۸

کے بغیر انھوں نے قدم نہیں اٹھایا۔ مجبوراً رانجھے کو بھی بطور گلہ بان ہیر کے ساتھ بھیجنا پڑا۔ یہاں ہیر نے اپنے شوہر سیدا سے التفات نہ برتا اور چھپ چھپ کے رانجھے سے ملنے لگی۔ جب چہ میگوئیاں بڑھیں تو رانجھا رنگ پورہ سے نکالا گیا۔ ادھر جب ہیر رانجھے کے فراق میں گھلنے لگی تو رانجھا جوگی کی وضع میں رنگ پورہ لوٹ آیا۔ ہیر نے اپنی ایک ہم راز سہیلی سے مدد لی اور موقع پاکر رانجھے کے ساتھ رنگ پورہ سے بھاگ نکلی۔ دونوں راہ میں پکڑے گئے۔ معاملہ قاضی کے پیش ہوا اور قانون کی رو سے ہیر سیدا کے حوالے کر دی گئی۔ اس پر ہیر اور رانجھا نے مل کر بددعا کی جس سے شہر میں آگ لگ گئی۔ بات حاکم شہر تک پہنچی اور اس نے رانجھا کے حق میں فیصلہ کیا۔ اس کے بعد بقول دمودر ہیر اور رانجھا دونوں دوش بدوش کسی نامعلوم سمت روانہ ہوگئے۔ مقبل کے ہاں بھی قصہ یہیں ختم ہوجاتا ہے۔ لیکن دمودر کے بعد کے بعض شاعر مثلاً آرام اور وارث شاہ کے ہاں قصّے کا انجام قدرے مختلف ہے۔ آرام کی روایت کے مطابق ہیر اور رانجھا قاضی کے فیصلے کے بعد جھنگ آئے۔ رانجھا شادی کی تیاری کے لیے اپنے وطن ہزارے گیا۔ ادھر ہیر سخت بیمار ہوئی اور مر گئی۔ وارث شاہ نے المیہ کی کیفیت شدید تر کرنے کے لیے اتنی بات اور بڑھا دی ہے کہ رانجھے کی غیر موجودگی میں ہیر کے والدین نے اُسے زہر دے دیا۔ ہیر کے انتقال کی خبر سنتے ہی رانجھے کا کلیجہ شق ہوا اور گرتے ہی مر گیا۔(۷)

تاریخی حیثیت

اس قصّے کی اصلیت کے بارے میں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کا بیان ہے:
"یہ ہندستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے کے کسی واقعے پر مبنی ہے"۔
موصوف کا خیال ہے کہ رانجھا کی روایت کا تعلق کرشن سے ہے۔ رانجھا کی ونجھلی یا الغوزہ کرشن کی بنسری ہے جس کے فوق فطرت کرشمے اور کارنامے

---

۷ پنجابی ادب کی تاریخ، عبدالغفور قریشی، لاہور، ۱۹۵۶ء، ص ۲۹۳

ہندستانی لوک کتھاؤں کا جزو لاینفک بن چکے ہیں۔ پانچ پیر، پانچ پانڈو ہیں۔ ہندو مسلم اختلاط کے بعد اس واقعے کا اوّلین افسانہ لکھنے والوں میں پیر پرستی عام ہو گی۔ انھوں نے حسن اتفاق کو ہر بار پیروں کی تائید غیبی پر محمول کیا"۔[۸]

ڈاکٹر موصوف کا یہ بیان محلِ نظر ہے۔ کیونکہ ہندوؤں میں پانچ پانڈوؤں کی پرستش کا کوئی خاطر خواہ ثبوت نہیں ملتا۔ مسلمانوں میں بھی پانچ پیر سے عقیدت کا رواج ہندو مسلم سابقہ سے بہت بعد کی چیز ہے۔ دمودر کے پانچ پیر نہ تو شیعی فرقے کے پنج تن[۹] ہیں اور نہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی و خواجہ اجمیری جیسے اہل تصوف کے مشائخ خمسہ۔[۱۰] بلکہ یہ پانچ ملتانی پیر ہیں[۱۱] جن کا رسوخ اکبر کے زمانے میں انتہائی عروج پر تھا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ دمودر نے ہندو ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ رانجھا کو کرشن کی طرح بنسی ہاتھ میں لیے کار فرما دکھایا اور اس کے متبعین نے ذاتی اعتقاد کی بنا پر قصے کو کرامت پرستیوں کا مرکب بنا دیا۔ اس کارِ خیر میں ہندو مسلمان دونوں شریک رہے ہوں گے۔ کیونکہ "پانچ پیروں کا احترام دونوں کا مشترکہ عقیدہ تھا"۔[۱۲]

ڈاکٹر محمد باقر نے حال ہی میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہیر اور رانجھا کا واقعہ عہد اکبری سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ پنجابی زبان

---

۸ موہن سنگھ یوانہ، اورینٹل کالج میگزین، ۱۹۳، ص ۹۴

۹ حضرت محمد، بی بی فاطمہ، حضرت علی، امام حسن اور امام حسین

۱۰ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، خواجہ نظام الدین اولیا، نصیر الدین ابوالخیر اور سلطان محمود ناصر الدین

۱۱ بہاء الدین زکریا ملتانی، شاہ رقعاے عالم حضرت لکھنوی، شاہ شمس تبریز ملتانی، شیخ جلال الدین مخدوم اوچی اور بابا فرید الدین گنج شکر، حوالہ ماسبق

۱۲ Encyclopaedia of Religion and Ethics جلد ۹، ص ۶۰۰
پنج پیر کے دروازے فیروز پور اور ملتان میں موجود ہیں۔ ان کا ذکر سکھوں کی مذہبی نظموں میں بھی ملتا ہے۔ حوالہ ماسبق

میں دمودر نے اپنے قصّے کو (راجا رام کھتری) ایک عینی شاہد سے سن کر لکھا۔ دمودر نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ چوچک خاں سیال (والد ہیر) اکبر کے زمانے میں ہو گزرا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کی تصدیق میں باقی کولابی کی سند لاتے ہیں۔ باقی کولاب صوبہ ختلان (افغانستان) کا شاعر تھا۔ اس کی فارسی مثنوی ہیر رانجھا کا واحد نسخہ نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہے۔ باقی چونکہ ۱۵۷۹ء میں بعہد اکبر، معصوم خاں کابلی کی بغاوت کے زمانے میں مارا جاتا ہے، یقیناً ہیر رانجھے کا واقعہ جو اس نے نظم کیا، اس کے انتقال (۱۵۷۹ء) سے پہلے رونما ہوچکا تھا اور اس کی شہرت دور دراز علاقوں تک پہنچ گئی تھی"۔[۱۳]

ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ ہیر کا مقبرہ اس وقت جھنگ سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر واقع ہے اور مرجع خلائق ہے۔ مقبرہ کی عمارت خاصی قدیم ہے اور آثار قدیمہ کے ماہرین نے تصدیق کی ہے کہ اس کی دیواروں کے طاقچوں اور مقبرے کا طرزِ تعمیر سولہویں صدی کے مزارات سے ملتا جلتا ہے۔[۱۴]

ہیر رانجھا کا قصہ انگریزی میں بھی شائع ہوچکا ہے۔ اسے سردار عبدالقادر آفندی نے میر قمرالدین منت دہلوی کی فارسی مثنوی سے ترجمہ کیا۔[۱۵] ہندی ہیر رانجھا منظوم کا ایک مجہول المصنف نسخہ انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے۔ یہ دہلی سے ۱۸۷۴ء میں شائع ہوا تھا۔[۱۶] ہریانی زبان میں قصہ ہیر رانجھا کو پنڈت موجی رام و شیوچند نے گیتوں اور دوہوں میں لکھا۔[۱۷]

ہیر رانجھا کے فارسی اور اُردو نسخوں کی تفصیل یہ ہے:

---

۱۳ ماہ نو کراچی، دسمبر ۱۹۵۸ء

۱۴ ایضاً

۱۵ پنجابی قصے فارسی زبان میں، ص ۲۶۵

۱۶ انڈیا ہندی، ص ۶۸

۱۷ مطبوعہ شمبھودیال دینا ناتھ، دریبہ کلاں دہلی

فارسی نسخے

نظم:

۱۔ مثنوی باقی کولابی (بعہد "عالم پناہ اکبر شاہ"[۱۸]) باقی کا سنہ انتقال ۱۵۷۹ء ہے۔[۱۹] چنانچہ یہ مثنوی اکبر کی تخت نشینی ۱۵۵۶ء اور ۱۵۷۹ء کے مابین لکھی گئی ہو گی۔

۲۔ افسانۂ دلپذیر، سعید سعیدی ۶۸۔۱۰۳۷ھ[۲۰]

۳۔ عشقیہ پنجاب یا قصۂ ہیر و ماہی۔ میتا پسر حکیم درویش چنابی (ساکن کیلاش یا گڈھ کیلاش ضلع گجرانوالہ) یہ مثنوی ۱۱۱۰ھ میں لکھی گئی۔[۲۱]

۴۔ مثنوی ناز و نیاز از شاہ فقیر اللہ آفریں لاہوری۔ المتوفی ۱۱۵۴ھ اس مثنوی کا سنہ اختتام ۱۱۴۳ھ[۲۲] نہیں بلکہ ۱۱۴۳ھ میں میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ہندستان سے سندھ جاتے ہوئے جب پہلی دفعہ آفریں سے ملاقات کی تو اس وقت آفریں ہیر رانجھا نظم کر رہے تھے۔[۲۳]

۵۔ داستان ہیر و رانجھا۔ از نواب احمد یا خاں گورگانی یکتا (المتوفی ۱۱۴۷ھ) مولوی محمد باقر نے اسے ۱۳۲۷ھ میں لاہور سے شائع کیا ہے۔[۲۴]

---

۱۸ مولوی محمد شفیع، ا۔ک۔م، اگست ۱۹۲۷ء

۱۹ بدایونی، منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۱۹۴

۲۰ ماہ نو، جون 1959، ص ۳۰

۲۱ قاضی فضل حق، ا۔ک۔م۔ نومبر ۱۹۲۸ء

۲۲ ریو، ۱۰۷، ایتھے ۱۷۲۴ اور ۳۰۳۷ نیز اشپرانگر، ص ۳۱۷

۲۳ سرو آزاد، ص ۳۰۵

۲۴ مولوی محمد شفیع، ا۔ک۔م۔ اگست ۱۹۲۷ء

۶۔ مثنوی ہیر و رانجھا، میر قمرالدین منت، سالِ تصنیف ۱۱۹۵ھ۔(۲۵)

ایتھے نے فہرست انڈیا آفس میں اس مثنوی کی تاریخ تصنیف ۱۱۹۵ھ بتائی ہے اور مادۂ تاریخ ''قصّہ عشق ہیر و رانجھن'' دیا ہے۔(۲۶) مولوی محمد شفیع نے لکھا ہے کہ اگر ''ہیر'' اور ''رانجھن'' کے درمیان واؤ ہے تو تاریخ ۱۱۹۶ھ ہوئی۔(۲۷) یہ بیان غلط ہے۔ واؤ کے شمول ہی سے ۱۱۹۵ھ برآمد ہوتے ہیں البتہ انھوں نے قلمی نسخے سے جو تاریخ نقل کی ہے، وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے:

سال تاریخ ایں کتاب شگرف — خواست منت ز عقل باتدبیر
خردش از سر بدیعہ بگفت — ''قصہ عشق ہیر رانجھن'' گیر
۲ + ۱۱۸۹ = ۱۱۹۱ھ

اس قطعے میں اگر ہیر اور رانجھن کے درمیان واؤ پڑھیں تو سنہ تصنیف ۱۱۹۷ھ برآمد ہوگا۔

۷۔ مثنوی ''گلشن راز عشق و وفا'' منشی سندر داس آرام۔ سالِ تصنیف ۱۱۷۱ھ۔ یہ شخص پنجابی زبان کے مشہور شاعر وارث شاہ کا معاصر تھا اور اس نے اپنی مثنوی ''ہیر وارث'' سے ۹ برس پہلے مکمل کی۔(۲۸)

۸۔ مثنوی لائق۔ خاتمے پر اسے میر خسرو کی تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ ''مکتوبہ سمت یکہزار و نو صد و چہار''(۲۹)

---

۲۵ ایتھے ۱۷۲۴، منت نے اپنی مثنوی ''ممتاز الدولہ جانسن'' کے نام معنون کی ہے۔ رچرڈ جانسن انگریزی اور فارسی لغات کے مولف تھے۔ انھیں نے منت کو گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کی خدمت میں پیش کیا اور ملک الشعراء کا خطاب دلوایا تھا

۲۶ نمبر ۱۷۲۴، ص ۹۳۵

۲۷ پنجابی قصے فارسی میں، ص ۱۷۰، پاورقی

۲۸ مولوی محمد شفیع، ا۔ک۔م۔ اگست ۱۹۲۷ء

۲۹ ایضاً

قاضی فضل حق کا بیان ہے کہ ''مصنف کا نام جو کاتب نے خاتمے پر ''میر خسرو'' لکھا ہے، یقیناً غلط ہے اور دراصل یہ کتاب لائق کی تصنیف ہے۔[۳۰] ''لائق کا صحیح نام معلوم نہیں۔ ممکن ہے یہ محمد مراد لائق ہی ہو جو مثنوی دستور ہمت (کامروپ و کام لتا) کا مصنف ہے اور جس کا ذکر شمع انجمن میں ملتا ہے۔[۳۱] اشپرانگر نے تذکرہ محمد یوسف کے حوالے سے لکھا ہے کہ لائق ہمت خاں کے بیٹے خان جہاں کا تخلص تھا۔ وہ آگے چل کر یہ بھی لکھتا ہے کہ لائق محمد عاشق کا تخلص تھا، جو ہمت خاں کے ملازمین میں سے تھا۔[۳۲]

۹۔ مثنوی عظیم الدین ٹھٹھوی ۱۲۱۴ھ

۱۰۔ مثنوی ضیاء الدین ضیا ۱۲۱۵ھ

۱۱۔ مثنوی آزاد ۲۶۔۱۲۱۶ھ

۱۲۔ مثنوی نواب ولی محمد خاں ۲۷۔۱۲۲۶ھ[۳۳]

۱۳۔ طویل قطعہ فقیر قادر بخش بیدل ۱۲۹۳ھ

نمبر شمار ۹ سے ۱۲ تک کی چار مثنویوں اور فقیر قادر بخش بیدل کے طویل قطعے کی تحقیق کا سہرا سید حسام الدین راشدی مرتب تذکرہ مقالات الشعرا مولفہ میر علی شیر قانع ٹھٹھوی کے سر ہے۔ راشدی صاحب نے ان منظومات کی نشان دہی ترجمہ احمد یار خاں یکتا کے حواشی میں کی ہے۔[۳۴]

۱۴۔ مثنوی فدائی یا ساقی (ناقص نسخہ) کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی،

---

۳۰ پنجابی قصے فارسی زبان میں، ص ۱۰۰/۱۰۱

۳۱ شمع انجمن، ص ۴۱۱

۳۲ اشپرانگر، ص ۴۷۵

۳۳ نمبر شمار ۹ سے ۱۲ تک کی چار مثنویاں سندھی ادبی بورڈ نے حفیظ ہوشیارپوری سے مرتب کرا کے ''مثنویات ہیر و رانجھا'' کے نام سے کراچی سے حال ہی میں شائع کر دی ہیں

۳۴ تذکرہ مقالات الشعراء، ص ۸۸۲

بنگال۔ مکتوبہ ۱۲۴۸ھ[۳۵]

۱۵۔ نگاریں نامہ از کنھیا لال ہندی۔ یہ مثنوی وکٹوریہ پریس، لاہور سے ۱۲۹۹ھ میں شائع ہوچکی ہے۔

نگاریں نامہ کا سنہ اختتام "پر درد نظم ہیر و رانجھا" یعنی ۱۸۸۱ء ہے۔[۳۶]

نثر:

۱۔ گورداس کھتری (قوم کوہلی) ساکن قصبہ سنکھترہ ۲۱۔۱۱۱۲ھ۔ یہ قصہ پنجابی زبان کی اولین روایت "ہیر دمودر" پر مبنی ہے۔[۳۷]

۲۔ منسارام خوشابی ۱۱۵۷ھ[۳۸]

۳۔ سراج المحبت از عبرتی عظیم آبادی ۱۲۵۲ھ[۳۹]

4۔ محبت نامہ (نثر مسجع) از منشی شیوک رام عطارد ٹھٹھوی ۹۔۱۱۸۵ھ[۴۰]

اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ یونیورسٹی لائبریری، علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ اس میں مصنف کا نام سیوک رام دیا گیا ہے۔ (شیوک رام نہیں) کتاب کا نام بھی محبت نامہ نہیں بلکہ ہیر نامہ لکھا ہے۔ اس نسخے کے کاتب حسام الدین نے ترقیمے میں دعویٰ کیا ہے کہ موجودہ نسخہ اس نے نسخۂ مصنف مکتوبہ ۱۲۴۱ھ سے نقل کیا ہے۔[۴۱]

---

۳۵ ایشیاٹک نمبر ۹۱۸

۳۶ پنجابی قصے زبان فارسی میں، ص ۱۸۹

۳۷ مولوی محمد شفیع، ا۔ک۔م۔ اگست ۱۹۲۷ء

۳۸ ریو، ۱۷۷۰ نیز کرزن نمبر ۱۱۸

۳۹ قاضی فضل حق، اردو، ۱۹۳۰ء، ص ۱۸۷

۴۰ بحوالہ ماہ نو، جون ۱۹۵۹

۴۱ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری، فارسیہ اخبار ۳/ ۸۲۔ مکتوب ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو بنام مؤلف

۵۔ داستان نثر از علی بیگ ۱۲۳۰ھ (۴۲)

اردو نسخے

نثر:

۱۔ ہیر رانجھا از کھیم نرائن رند دہلوی برادر بینی نرائن جہاں۔ (۴۳)

۲۔ ہیر رانجھا از مقبول احمد خلف قدرت احمد فاروقی گوپاموی۔ ۱۸۴۸ء دتاسی نے لکھا ہے کہ یہ مخلوط فارسی اردو نظم و نثر میں ہے۔ دتاسی نے اس کا فرانسیسی ترجمہ ریویوی اورینٹ اے دی الجیریا (ستمبر ۱۸۵۷ء) میں شائع کیا۔ (۴۴) اصل کے دیگر ایڈیشن: ہندو پریس دہلی ۱۸۷۴ء (۴۵) دہلی ۱۸۷۶ء (۴۶)

۳۔ "ہیر رانجھا اردو نثر" نسخہ برٹش میوزیم۔ اس کے ترقیمے میں لکھا ہے کہ یہ کہانی غلام سرورالدین سرشتہ دار نے رہتک کے گوسائیوں سے سن کر قلم بند کی۔ مکتوبہ رہتک ۲/ جنوری ۱۸۵۰ء (۴۷)

۴۔ ہیر رانجھا از ایم۔ اسلم، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۰ء۔

۵۔ ہیر رانجھا اُردو (ڈراما) از حافظ محمد عبداللہ، رئیس فتح پور، مہتمم لائٹ آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی، آگرہ (۴۸)

۶۔ ہیر رانجھا اُردو (منظوم ڈراما) از رونق بنارسی ۱۸۸۰ء (۴۹)

---

۴۲ بحوالہ ماہ نو، جون ۱۹۵۹ء

۴۳ ایضے ۱۷۲۷ء

۴۴ دتاسی، خطبات ص ۱۵۶

۴۵ اردو ۱۹۲۰ء، ص ۲۱۷

۴۶ بلوم ہارٹ، برٹش کتب ص ۱۹۵،

۴۷ بلوم ہارٹ، ص ۵۹ نمبر ۱۰۲

۴۸ اردو ڈراما عشرت رحمانی، ص ۲۲۲

۴۹ ایضاً، ص ۲۲۸

۷۔ معشوقۂ پنجاب (قصہ ہیر رانجھا نثر اُردو) از چودھری افضل حق [۵۰]

۸۔ ہیر رانجھا (اُردو نثر) از ایم۔ایم۔وائی خادم۔ مطبوعہ نرائن دت سہگل لاہور، سنہ ؟ [۵۱]

نظم:

۱۔ ہیر رانجھا (قلمی) از نجیب الدین نجیب۔ اوراق ۳۹۔ مخطوطۂ انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ۔ سنہ کتابت درج نہیں۔[۵۲] اس مثنوی کا ایک نسخہ کتب خانہ رضائیہ رام پور میں بھی ہے۔ اوراق ۳۸۔ مکتوبہ ۱۲۳۹ء[۵۳]

۲۔ ہیر رانجھا (قلمی) مول چند متخلص بہ منشی، دہلوی۔ سنہ تصنیف ۱۸۱۳ء سنہ کتابت ۱۸۲۳ء اوراق ۹۲، کتب خانہ رضائیہ رام پور[۵۴]

۳۔ "قصۂ ہیر و رانجھا" از مولوی کرم الٰہی بھوپالی۔ یہ پنجاب پریس سیالکوٹ سے ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔ تعداد صفحات ۲۴۴۔[۵۵]

۴۔ "آبلۂ حرارت عشق" یا "ارمغان گدا"۔ از صوفی عبدالغفور، قیس۔ یہ ترجمہ ۱۹۰۹ء میں اسٹیم پریس آگرہ[۵۶] سے اور ۱۹۱۱ء میں کانپور سے شائع ہوا۔[۵۷] تعداد صفحات ۲۷۲

---

۵۰ صدیق، ص ۳۳

۵۱ فہرست کتب خانہ، ص ۳۵

۵۲ انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، نشان ۱۰۲/۶۵۷

۵۳ کتب خانہ رضائیہ، رام پور، نشان ۵۶۰ ج

۵۴ کتب خانہ رضائیہ، رام پور، نشان ۵۷۰، برائے نسخ دیگر، لٹن لائبریری، علی گڑھ، ذخیرہ سر سلیمان ۱۰۹

۵۵ مخزونہ لٹن لائبریری، علی گڑھ

۵۶ ایضاً

۵۷ بحوالہ اردو، ۱۹۳۰ء، ص ۷۲۱

۵۔ ہیر رانجھا از رفیق خاور، ادارۂ مطبوعات پاکستان، کراچی۔

۶۔ مثنوی ہیر و رانجھا اُردو، مصنفہ میر فضل علی۔ قلمی نسخہ پٹنہ یونیورسٹی۔ اردو نمائش پٹنہ، منعقدہ ۱۹۵۹ء میں پیش کی گئی۔

مندرجہ بالا قدیم مثنویوں میں سے کرم الٰہی اور قیس کے ترجمے پنجاب میں اور نجیب اور منشی کے ترجمے پنجاب سے باہر لکھے گئے۔ ان کے مصنفوں نے اپنے ماٰخذ کے بارے میں کوئی صراحت نہیں کی۔ قرینہ یہ ہے کہ پنجابی مصنفوں کے سامنے یا تو پنجاب کی عوامی روایت ہوگی یا دمودر، مقبل اور وارث شاہ کی پنجابی منظومات ہوں گی۔ نجیب اور منشی کے ترجمے چونکہ پنجاب سے باہر لکھے گئے اس لیے ممکن ہے ان کا ماٰخذ پنجابی روایتیں نہ ہوں۔ یہ اس زمانے کی تصنیف ہیں جب فارسی ادبی زبان کی حیثیت سے سارے ہندستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ گمان غالب ہے کہ ان نسخوں کے مصنفوں نے فارسی مثنویوں سے استفادہ کیا ہوگا۔ مول چند منشی کی اردو مثنوی اور سندر داس آرام کی فارسی مثنوی میں گہری مطابقت پائی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہیر رانجھا کا قصہّ زبان زدِ خاص و عام رہا ہے اور اتنی بار لکھا گیا ہے کہ مختلف نسخوں میں باہمی مشابہت تلاش کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ قصےّ کی جزئیات میں ہر مصنف نے اپنی طبیعت کا زور دکھایا ہے اور اسے اپنے اپنے انداز سے بیان کیا ہے۔ متاخرین شاعروں نے تو اپنے زمانے کے تہذیبی رجحانات کے زیرِ اثر ہیر کے کردار کو تصوف کے رنگ میں ایسا گہرا رنگا کہ عشق و محبت کا ایک سیدھا سادہ قصہّ سلوک و معرفت کا صحیفہ بن گیا۔

مثنوی ہیر رانجھا، منشی

مول چند منشی، شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد تھے۔[۵۸] انھوں نے ۱۲۲۵ھ میں شمشیر خانی کا ترجمہ قصہّ خسروانِ عجم یا شاہنامہ اردو کے نام سے

۵۸ مجموعۂ نغز، ص ۲۲۲

کیا۔[۵۹] اس میں ۹ ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔ برٹش میوزیم میں اس مثنوی کے چھے مطبوعہ ایڈیشن محفوظ ہیں۔[۶۰] ہیر و رانجھا کے علاوہ ان کی ایک اور مثنوی سام نامہ (۱۲۲۷ھ) بھی ہنوز زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔

منشی کی مثنوی ہیر و رانجھا کے دو مخطوطے دستیاب ہوئے ہیں۔ علی گڑھ کا نسخہ[۶۱] نہ صرف اول و آخر سے ناقص ہے بلکہ بے حد بے ترتیب ہے اور کسی جلد ساز کی کور ذوقی کا شکار ہو گیا ہے۔ دوسرا نسخہ رامپور کا ہے[۶۲] — یہ ناقص الاوّل ہے۔ مثنوی کا آغاز "مناجات بدرگاہ مجیب الدعوات" سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد چند اشعار "نعت جناب رسالت پناہ محمد رسول اللہؐ" میں ہیں۔ اس زمانے کے مخلوط تہذیبی اور ادبی ماحول کے پیش نظر ایک ہندو مصنف کا نعتِ رسولؐ لکھنا باعث حیرت نہیں۔ نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تمنائے دل ہے یہ صبح و مسا — کہ اس آستانے پہ ہوں جبہ سا
کہ ہے خاک کو جس کی جوں مہر تاب — نہیں اس کے روکش بلند آفتاب
سرِ سروراں سید المرسلیں — درخشندہ خورشید ایمان و دیں
محمدؐ کہ ہے ختمِ پیغمبراں — جناب اس کی ہے قبلہ گاہ جہاں
محمدؐ نہیں کوئی جس کا عدیل — جناب اس کی ہے مہبطِ جبرئیل

اس کے بعد محمد اکبر شاہ ثانی اور ممتاز محل بیگم کی مدح ہے، جس میں شاعر نے صراحت کردی ہے کہ اس نے یہ قصہ ممتاز محل بیگم کی فرمائش پر نظم کیا۔ قصے کا آغاز ہندستان کی تعریف سے ہوتا ہے:

تماشا ہے اقلیم ہندوستاں — بہ خوبی و لطف انتخابِ جہاں

---

۵۹ دتاسی، خطبات، ص ۱۷۴

۶۰ بلوم ہارٹ، برٹش کتب، ص ۱۸۲

۶۱ لٹن لائبریری، ذخیرہ سر سلیمان نمبر ۱۰۹

۶۲ کتب خانہ رضائیہ، رام پور، نشان ۵۷۰

سراپا لطافت سراپا بہار بہارِ چمن ہووے جس پر نثار
عجب سر زمیں ہے مسرت فزا نہایت ہے دلچسپ اور دل کشا
جسے دیکھیے سو طرح دار ہے پری چہرہ ہے ماہ رخسار ہے

منشی اور سندر داس آرام کے فارسی قصے میں گہری مماثلت ہے۔ غالباً منشی کے پیشِ نظر آرام کا قصہ رہا ہوگا۔ گو اس سلسلے میں منشی نے کوئی صراحت نہیں کی۔ لیکن قصے کے انجام سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ آرام اپنا قصہ ہیر رانجھے کی موت پر ختم کرتا ہے اور اس کے بعد ایک حاجی کی روایت نقل کرتا ہے۔ یہ حاجی پنجاب سے حج کے لیے گیا تھا۔ واپسی میں جہاز غرق ہوگیا اور یہ ایک تختے کے سہارے کنارے پر آلگا۔ یہاں ایک لق و دق صحرا میں جب بھوک پیاس سے اس کی جان لبوں پر آگئی تو ہیر اور رانجھا اس کی مدد کو آئے اور چشم زدن میں اسے پنجاب میں پہنچا دیا۔ شاعر ہیر اور رانجھا کو ولایت کا درجہ عطا کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ اس طرح کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیر رانجھا ابھی تک زندہ ہیں۔ آرام کے سوا دمودر، مقبل اور وارث کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ مول چند منشی البتہ اپنی اردو مثنوی کا خاتمہ اسی روایت پر کرتا ہے:

وہ دونوں بہ صورت ذی حیات بیاباں میں پھرتے ہیں دن اور رات
بحکمِ خداوند شام و پگاہ بتاتے ہیں بھولے ہوؤں کو وہ راہ
نظر آوے جو کوئی گم کردہ راہ تو آکر وہیں ہم بحکمِ الٰہ
طرح خضر کے اس کے ہوں رہنما کریں دامِ رنج و الم سے رہا

اس سے شبہ ہوتا ہے کہ آرام کی نظم منشی کے سامنے تھی، کیونکہ ہیر رانجھا کی یہ صحرانوردی اور گم کردہ راہوں کی رہنمائی آرام کے علاوہ اور کسی نے نہیں بیان کی۔

فارسی شاعروں کی طرح منشی نے بھی مثنوی میں جابجا غزلیں شامل کردی ہیں۔ اور ابواب کے طویل عنوان قائم کیے ہیں۔ سرخیاں فارسی نثر میں

ہیں۔ یوں مثنوی کی زبان سادہ، اور اشعار رواں ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

جو بھینسوں کو لے کر بوقتِ سحر — سوے دشت چلتا وہ خستہ جگر
تو یہ شوق سے دیکھتی تھی اودھر — وہ دل دار جب تک کہ آتا نظر
نظر سے نہاں جب کہ ہو جائے تھا — تو جی ہیر کا سخت گھبرائے تھا
وہیں باندھ کر دل میں اس کا خیال — یہ کہتی تھی وہ بادلِ پُر ملال
کہ افسوس بیٹھوں میں ایوان میں — پھرے تو خراب اس بیابان میں
مرے ہم نشیں ہوویں انساں یہاں — تجھے وحشیوں سے ہو صحبت وہاں
ستاتا ہے ہر لحظہ تیرا فراق — جدائی تری مجھ پہ ہے سخت شاق (۶۳)

مثنوی ہیر رانجھا، نجیب

نجیب الدین نجیب نے اپنی مثنوی میں ہیر کے والد کا نام چوچک کے بجائے جھوجھک لکھا ہے۔ نجیب کے قصّے میں ایک اور اختلاف یہ ہے کہ عشق کی ابتدا رانجھے کے خواب سے نہیں بلکہ ہیر کے خواب سے ہوتی ہے۔ ہیر خواب میں رانجھے کو بنسری بجاتا دیکھتی ہے اور دل دے بیٹھتی ہے۔ پھر ہیر اور رانجھے کی پہلی ملاقات حُسنِ اتفاق کا نتیجہ نہیں بلکہ ہیر قاصد بھیج کر رانجھے کو بلواتی ہے۔ مزید یہ کہ ہیر کا ڈولا جب سسرال پہنچتا ہے، تو ہیر لباسِ عروسی کی جگہ جوگن کی کفنی میں دکھائی دیتی ہے۔ ہیر کا شوہر اسے بدشگونی سمجھ کر ہیر سے بازپرس کرتا ہے، تو وہ کہتی ہے:

سنبھل ہوش کر اے سگِ بے ادب — نہ دے اپنے تئیں اس طرح تاب و تب
یہ ناحق کی دل سے ہوس دُور کر — پرائی امانت پہ بس دل نہ دھر
نہ کر طمع دل میں بجق کریم — نہیں تیرے قابل یہ دُرِ یتیم!

ہیر ایک خط میں رانجھے کو لکھتی ہے:

---

۶۳ نسخہ کتب خانہ رضائیہ، حوالہ ماسبق

سنی جو تری بانسری کی صدا ہوا جب ہی سے دل مرا مبتلا
نہیں تیری فرقت سے کچھ دل میں تاب ہوا دل مرا جل کے مثلِ کباب
تجھے اپنی اس بانسری کی قسم تجھے اپنی اس دلبری کی قسم
شتابی سے تشریف یاں لائیے اس عاجز پہ اشفاق فرمائیے
جو کل چلتے صاحب تو اچھے چلو جو واں کھاؤ یاں آکے پانی پیو

نجیب کے ہاں قصہ راحت انجام ہے۔ نجیب، آرام اور وارث شاہ کی طرح قصے کو ہیر اور رانجھا کی موت سے المیہ کا رنگ نہیں دیتا بلکہ اسے دامودر اور مقبل کی روایات کے مطابق قاضی کے فیصلے پر ختم کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ہیر رانجھا دونوں کسی نامعلوم سمت چل دیے اور غائب ہو گئے۔

رہے ڈھونڈتے ان کو پیر و جواں نہ پایا کسو نے بھی ان کا نشاں
میاں رکھے ہم کو بھی در خوف و بیم خدا ان کے انجام کا ہے علیم
غرض سب کا یہ ہے یہاں سے گئے یہاں سے گئے، اس جہاں سے گئے[۶۴]

اس شعر پر مثنوی کا خاتمہ ہے۔ شاعر کئی جگہ اپنا تخلص نجیب استعمال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مخطوطے سے مصنف کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکی۔

مثنوی ہیر رانجھا، کرم الٰہی

کرم الٰہی کی یہ مثنوی ہیر وارث شاہ سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے۔ رانجھا والد کی وفات کے بعد جب وطن سے جانے لگتا ہے تو اس کی بھاوجیں اسے روکتی ہیں۔ اس کا ذکر سوائے وارث شاہ کے اور کسی نے نہیں کیا۔ کرم الٰہی اس کا تتبع کرتا ہے۔ لڈن ملاح سے رانجھے کی ملاقات اور سوال و جواب، نیز ہیر اور

---

۶۴ نسخہ انجمن ترقی اردو، حوالہ ماسبق

قاضی کا مباحثہ بھی وارث شاہ سے ماخوذ ہیں۔ وارث شاہ نے قصے کو زیادہ المیہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ انجام کار ہیر کو زہر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا باپ رانجھے کو خط میں لکھتا ہے کہ ہیر کا انتقال ہیضے سے ہوا۔ رانجھا گریہ کناں ہیر کی قبر پر آتا ہے اور:

به قدرت خداوند ربُ القدیر   نکلا وہیں ہاتھ بدر منیر (کذا)
لیا چوم رانجھن بصد آرزو   پکڑا وہیں ہاتھ آں ماہرو (کذا)

اور اس طرح شاخِ شکستہ اپنی اصل کے ساتھ پیوند ہو گئی۔

اس مثنوی کا پایہ ادبی حیثیت سے بہت پست ہے۔ زبان اکثر غلط اور بیان ژولیدہ ہے۔ لیکن شاعر چونکہ وارث شاہ کا متبع ہے، اس لیے کہیں کہیں موثر اشعار بھی اس کے قلم سے نکل گئے ہیں۔ مثلاً رانجھا ہزارے جاکر شادی کی تیاری میں مصروف ہے۔ ادھر ہیر کے والدین اسے زہر دے دیتے ہیں اور وہ موت کی گھڑیاں گن رہی ہے۔ اس کا نقشہ یوں کھینچتا ہے:

کرے یاد رانجھن کو ہوکر نڈھال   مرے یار تجھ کو نہ آیا خیال
مرے دل کے پارے مرے نورِ جاں   چلی ہیر تیری مٹا سب نشاں
ذرا دیکھ لے رنگ رخسار کا   میں پایا نہیں جلوہ دیدار کا
مری زلفیں بکھری سیہ دوش پر   تو کیوں چھوڑ مجھ کو گیا بے خبر
ذرا دیکھ لے میری آنکھوں کے تار   جوں ساون مہینے میں ابرِ بہار

اور سہیلیوں سے کہتی ہے:

مرے رانجھے کو بتانی خبر   ترے غم میں گزری ہے وہ سیم بر
تجھے یاد کرتی رہی صبح و شام   ترے عشق میں چھوڑی دنیا تمام

ماں سے یوں خطاب کرتی ہے:

مرا جوڑا اوّل تھا رانجھن کے ساتھ   تو کی خود نمائی دیا اور ہاتھ

مرا دل رُبا انتظاری کرے | بیاہ کی وہ گھر میں تیاری کرے
مرا اب بیاہ موت کے ساتھ ہے | مرا رانجھنا ہی مرا ناتھ ہے[۶۵]

مثنوی آبلۂ حرارتِ عشق

عبدالغفور، قیس کی مثنوی کسی فارسی ترجمے پر مبنی ہے، جس کے نام کی صراحت مصنف نے نہیں کی:

قدیمی زبان اس کی تھی فارسی | اور پنجابی میں لکھ گئے ہیں کئی
مگر اس کا اردو ہوا ہی نہ تھا | مفصل تو ایسا لکھا ہی نہ تھا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالغفور قیس کو ہیر رانجھا کے کسی اردو نسخے کا علم نہیں تھا۔ اسے یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس نے قصے کو پوری تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کا قصہ اپنی تفصیل میں کم و بیش وارث شاہ سے مشابہ ہے۔ اس سے خیال گزرتا ہے کہ یہ قصہ جس فارسی مثنوی پر مبنی ہے وہ وارث شاہ کے بعد لکھی گئی ہوگی۔ قیس کی مثنوی کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پورا قصہ ایک روحانی تمثیل (Allegory) کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ رانجھا جسم ہے اور ہیر روح۔ محویت عشقِ حقیقی ہے اور پنج پیر مرشد کی ذات ہیں۔ شاعر نے پانچ پیروں کے تصور سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ غرض ساری مثنوی میں فوق فطرت واقعات کی ایک پراسرار فضا قائم ہوگئی ہے۔ جیسا کہ بیان ہوچکا ہے، پانچ پیروں کا یہ تصور کوئی جامد اور محدود تصور نہیں۔ ہیر رانجھے کا قصہ نظم کرنے والے ہر شاعر نے ذاتی اعتقاد کی بنا پر ان پانچ پیروں میں جس کو چاہا، شامل کرلیا۔ قیس کے ہاں ان کی تفصیل یہ ہے:

تو رکھ یاد ان اولیاؤں کے نام | تھے اوّل تو خضر علیہ السلام
دوم تھے شکر گنج بابا فرید | کہ ہو ان پہ رحمت خدا کی مزید

---

۶۵ مثنوی ہیر و رانجھا، کرم الٰہی بھوپالوی، پنجاب پریس سیالکوٹ، ۱۹۰۵ء

سوم تھے زکریا وہ ملتان کے　　خدا ان سے راضی رہے پے بہ پے
چہارم بخاری تھے سید جلال　　کہ ہو ان پر راحم وہ ایزد جلال
قلندر تھے پنجم وہ شہباز لال　　کہ رحمت کرے ان پہ بس ذوالجلال

ادبی اعتبار سے یہ مثنوی کرم الٰہی کی مثنوی سے بہتر ہے۔ شاعر حسنِ بیان سے عاری نہیں۔ اشعار ہموار اور رواں ہیں۔ رانجھے کی بنسری کی تعریف سنیے:

پڑے اس میں چاندی کے چھلے کئی　　حقیقت میں انگلی تھی وہ ہیر کی
پڑی اس میں بلّور کی چوڑیاں　　گویا ہیر کی تھی کلائی عیاں
گولائی میں تھے اس کی موتی جڑے　　گویا ہیرے پہنے کھڑی دو لڑے
سُریلی تھی آواز اور اچپلی　　گویا ہیر بولے تھی اس میں چھپی
نہ تھی بانسری ہیر ثانی تھی وہ　　ہزارے کی یوں تو نشانی تھی وہ
وہ جس وقت ہوتا تھا نغمہ سرا　　تو غیرت میں آتی تھی اندر سبھا

بعض قلمی تصویریں بھی خوب ہیں:

اُدھر اُس کی نظروں میں جنگل سیاہ　　اِدھر اس کی آنکھوں میں کاجل سیاہ
غرض کرکے سنگار و ابرن لگا　　وہ دم بھر میں پہنچی اسی بن میں جا
کہ جس بن میں اس کا کنہیا سا یار　　گوالن کا اپنی کرے انتظار
رہی دس قدم جب کہ رانجھے سے ہیر　　لچکتی لچکتی چلی وہ شریر
دکھا چلبلاپن وہ انداز کا　　چلی اس کی جانب بہ ناز دادا (٦٦)

مثنویات سسّی پنّوں

سسّی پنّوں کے قصّے کو شمالی مغربی ہندستان میں وہی اہمیت حاصل ہے، جو ڈھولا مارُو کو راجستھان میں یا مادھونل اور کام کنڈلا کو بہار میں۔ سندھ، کچھ،

٦٦　مثنوی آبلہ حرارت عشق، عبدالغفور قیس، آگرہ، ١٩٠٩ء

بلوچستان اور پنجاب میں یہ قصہ بچے بچے کی زبان پر ہے۔ سندھی عوام میں تو سسّی اور پنوں کو اولیا کا مرتبہ حاصل ہے۔ لیکن سندھ کی نسبت پنجاب میں اسے جو حُسن قبول ملا، بیان سے باہر ہے۔ پنجاب میں بعض مقامات پر لوہری کے دن اب بھی سسّی پنوں کا سوانگ رچایا جاتا ہے اور عوام ہاشم کی پنجابی سسّی گاتے ہیں۔

سسّی پنوں کا قصہ سندھی،(۶۷) بلوچی،(۶۸) کچھی اور پنجابی زبانوں میں بار بار لکھا گیا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ نسخے پنجابی میں ملتے ہیں۔ ہرنام سنگھ شان مرتب سسّی ہاشم نے ایسی پچاس سے زائد تصانیف کے نام پیش کیے ہیں۔(۶۹) ان میں سے زیادہ اہم روایتیں سندر داس آرام (۱۱۷۱ھ)، حافظ برخوردار (۱۱۷۶ھ)، سدارام اور ہاشم (المتوفی ۱۸۴۰ء) کی ہیں۔

سی پنوں کا یہ قصہ انگریزی میں بھی منتقل ہوچکا ہے۔ لفٹنٹ برٹن اور مٹر لوسٹن نے اسے پنجابی روایتوں سے ترجمہ کیا ہے۔(۷۰) سندھی روایت کا انگریزی ترجمہ F. J. Goldsmid نے کیا، جو ۱۸۶۳ء میں لندن سے مع اصل متن شائع ہوا۔(۷۱)

اصل قصے کی روایتیں سندھی، بلوچی اور پنجابی زبان میں باہم مختلف ہیں۔ حتیٰ کہ سوائے سی پنوں کے دوسرے تمام کرداروں کے نام بھی تبدیل

---

۶۷ سی پنوں سندھی منظوم از اخوند عبدالرحیم وکوڑامل چندن مل کراچی، ۱۸۷۴ء
انڈیا: سندھی ص ۷
سی پنوں سندھی، مجہول المصنف مع انگریزی ترجمہ از F. G. Goldsmid لندن ۱۸۶۳ء، سندھی کتب برٹش کالم ۱۳

۶۸ سی پنوں، بلوچی، منظوم، از نبی بخش، بمبئی، ۱۸۷۶ء، انڈیا سندھی ص ۷

۶۹ سی ہاشم (پنجابی) پروفیسر ہرنام سنگھ شان، انبالہ ۱۹۵۶ء، مقدمہ

۷۰ سی پنوں، مطبوعہ لاہور، ۱۹۰۴ء، ص ۱۰

۷۱ انڈیا: سندھی، ص ۷

ہوگئے ہیں۔ لیکن سندھی یا بلوچی روایتوں کی نسبت اردو قصے کے پنجابی سے متاثر ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔ اس لیے ہم پنجابی روایت کے بیان پر اکتفا کریں گے۔ پنجابی میں سسی پنوں کا قدیم ترین نسخہ سندر داس آرام کا ہے، لیکن جو اہمیت ہاشم کی سسی کو حاصل ہے اور کسی کو نہیں۔ بعد کے اکثر و بیشتر ترجمے ہاشم ہی کو بنیاد بنا کر لکھے گئے ہیں۔ ہاشم کے قصے کا خلاصہ یہ ہے:

قصہ

بھن بھور کے بادشاہ کے گھر بڑی منتوں مرادوں سے سسّی نام کی ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ نجومیوں نے پیشین گوئی کی کہ یہ جوان ہو کر کسی کے عشق میں گرفتار ہوگی اور شاہی خاندان کے ننگ و ناموس کو بٹا لگائے گی۔ اس بدنامی سے بچنے کے لیے والدین نے اسے ایک صندوق میں بند کر کے اور کچھ ہیرے جواہرات ساتھ رکھ کے دریا میں بہا دیا۔ یہ صندوق اتا نامی ایک لاولد دھوبی کے ہاتھ لگا، جس نے سسّی کو بڑے لاڈ پیار سے پالا۔ جوان ہو کر سسّی حسن و جمال میں یگانۂ آفاق ثابت ہوئی اور اس کے لیے دُور دُور سے پیغام آنے لگے۔ سسی نے سب کو اس بنا پر ٹھکرا دیا کہ وہ شاہی نسل سے ہے۔ دھوبیوں کی برادری میں اس بات پر جھگڑا ہوا۔ شدہ شدہ بات بادشاہ تک پہنچی۔ بادشاہ نے بیٹی کو پہچان لیا اور اس کے رہنے کو دریا کے کنارے ایک محل بنوا دیا۔ یہیں سسی نے ایک سوداگر کے پاس کیچ کے شہزادے پنوں کی تصویر دیکھی اور اس پر شیدا ہوگئی۔ اگلے سال کیچ کے سوداگروں کا ایک قافلہ سسی کے باغ میں اترا۔ سسی نے ان کے ذریعے پنوں کو کیچ سے بلوا بھیجا۔ پنوں کے خویش و اقربا مانع آئے، لیکن اس نے ان کی ایک نہ سنی اور سسی کے پاس چلا آیا۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں شیر و شکر ہوگئے۔ پنوں یہیں رہ پڑا۔ اس پر اس کے والدین جز بز ہوئے۔ آخر پنوں کے بھائی اسے لینے کے لیے بھن بھور آئے۔ سسی نے بہت خاطر مدارات کی، لیکن انھوں نے ایک رات دھوکے سے پنوں کو مدہوش کرلیا اور

آدھی رات کو کیچ روانہ ہوگئے۔ آنکھ کھلتے ہیں سسی کو خبر ہوئی، تو وہ دیوانہ وار قافلے کے پیچھے دوڑی اور پنوں کی اونٹنی کے نشان پہچانتی کیچ کی راہ پڑ گئی۔ دوپہر تک ریگ زار کی گرمی اور دھوپ کی تپش نے سسی کو نیم جاں کر دیا۔ پاؤں فگار ہوگئے اور پیاس سے زبان سوکھ کے کانٹا ہوگئی۔ مدد کے لیے سسی نے ایک گڈریے کو پکارا، جو قریب ہی بکریاں لیے جارہا تھا۔ لق و دق صحرا میں ایک برہنہ پا اور کھلے سر عورت کو پاگلوں کی طرح بھاگتا دیکھ کر وہ اسے کوئی جن بھوت سمجھا اور ڈر کے مارے بھاگ گیا۔ اس بے سر و سامانی کے عالم میں غم سے ہلکان اور پیاس سے پریشان سسی نے وہیں تڑپ تڑپ کے جان دے دی۔ ادھر جب پنوں کو ہوش آیا تو اس نے بھائیوں کو بُرا بھلا کہہ کے اونٹنی کی مہار بھن بھور کی طرف موڑ دی۔ عین راہ میں ایک قبر نظر آئی۔ اس گڈریے نے بتایا کہ ایک دیوانی عورت نے پنوں پنوں پکارتے ہوئے یہاں جان دے دی ہے۔ سسی کا عشق بے اثر نہ تھا۔ پنوں ایک آہ کے ساتھ قبر پر گرا اور جاں بحق تسلیم ہوا۔ (۷۲)

تاریخی حیثیت

اس قصّے کے جائے وقوع اور زمانے کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ پنجابی لوک گیتوں اور ڈھولوں میں سسی کے باپ کو راجا کہا گیا ہے۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اس کا سلسلہ راجپوت بھائیوں سے ملاتے ہیں، جو زیادہ صحیح نہیں۔ سر رچرڈ ٹمپل جنھوں نے پنجابی لوک قصوں کے بارے میں تحقیق کی تھی لکھتے ہیں: ”سسی پنوں کا قصہ دراصل سندھ اور بلوچستان سے تعلق رکھتا ہے اور عجب نہیں کہ سندھ کی تاریخ کے ابتدائی زمانے کا واقعہ ہو۔ بھنور یا بھنور (یعنی بہ واؤ مجہول یا معروف) کے کھنڈر اس سڑک کے کنارے پر واقع ہیں، جو کراچی سے کھاڑا کو گئی ہے۔ غالباً اس شہر کا محلِ وقوع دریائے سندھ کے ایک قدیم

۷۲ سسی ہاشم (پنجابی) حوالہ ماسبق

دہانے پر تھا"۔[۷۳]

قاضی فضل حق نے ۱۹۳۰ء میں اس قصّے کے مآخذ سے بحث کرتے ہوئے جو روایت بیان کی ہے، اس میں اس شہر کا نام بھن پور بتایا گیا ہے، جو علاقہ سندھ میں واقع تھا۔[۷۴] لیکن جدید ترین تحقیق کی رو سے یہ مقدمہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ پروفیسر ہرنام سنگھ شان جنھوں نے برسوں کی محنت اور عرق ریزی کے بعد حال ہی میں سسی ہاشم[۷۵] کو مرتب کیا ہے۔ اس قصّے کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سسی پنوں کے قصّے کا محلِ وقوع علاقہ کچھ میں ہے۔ گو اس قصّے کو سو فیصدی امرِ واقعہ کی منزلت دینے کے لیے وہ بھی تیار نہیں۔ قصّے میں جس طرح کے رسم و رواج اور طور طریقوں کا ذکر آیا ہے وہ قدیم کچھی معاشرت کا پتا دیتے ہیں۔ سندھ اور پنجاب کی روایتوں میں بعد کو بہت رنگ آمیزی ہوگئی۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہّ کچھ سے نکل کر سندھ کے نچلے علاقے سے ہوتا ہوا، مکران بلوچستان اور پھر وہاں سے پنجاب پہنچا۔ کیچ کا شہر اب بھی ریاست قلات (بلوچستان) میں موجود ہے۔

اس قصّے کا صحیح زمانہ بھی معلوم نہیں۔ بعض محققین اسے زمانۂ اسلام سے پہلے کا بتاتے ہیں۔ سسی، سنسکرت ششی (چاند) اور پنوں پورن سے لسانی مشابہت رکھتا ہے۔ اس قصّے کے ہندی الاصل ہونے کے بارے میں ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں اظہارِ محبت کی ابتدا عورت کی طرف سے ہوتی ہے جو خالص ہندی انداز ہے۔

ہتو رام مصنف تاریخ بلوچستان کا بیان ہے کہ سسی کی قبر علاقہ لس بیلہ میں شاہ بلاول اور اوتھل کے درمیانی ریگ زار میں ابتک موجود ہے۔ تیجا سنگھ لکھتے ہیں کہ یہ قبر کیچ اور لڑکانے کے درمیان مارو تھل میں واقع ہے۔ یہاں

---

۷۳ اورینٹل کالج میگزین ۱۹۲۷ء، ص ۱۱۵

۷۴ اردو ۱۹۳۰ء، ص ۱۹

۷۵ حوالہ ماسبق

لوگ زیارت کو آتے ہیں۔ ہر سال میلہ لگتا ہے اور مہندی کے بوٹے کے قریب وہ چشمہ اب تک موجود ہے، جہاں پیاسی سسی نے مرتے وقت پانی پینا چاہا تھا۔(۷۶)

فارسی نسخے

ا۔ سسی پنو۔ از سید علی، ٹھٹھ کے ایک صاحب تقدس بزرگ نے قبل ۱۰۵۳ھ میں سندھی زبان سے ترجمہ کیا۔(۷۷)

۲۔ زیبا و نگار از حاجی محمد رضا رضائیہ۔ ۱۰۵۳ھ(۷۸)

۳۔ سسی و پنو، از جسونت رائے منشی، ۱۱۴۰ھ(۷۹)

جسونت رائے منشی کی "سسی و پنو" کا ذکر ایتھے کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ یہاں ایتھے سے غلطی ہوئی ہے۔ یہ مثنوی جسونت رائے، منشی کی نہیں بلکہ اندرجیت منشی کی ہے، جس کا ذکر فارسی نسخوں کے تحت نیچے نمبر ۴ پر کیا گیا ہے۔

۴۔ نامۂ عشق، از اندرجیت، منشی ۱۱۴۰ھ(۸۰)

۵۔ دستور عشق یا گلستان رنگیں از جیونت پرکاش ۱۱۴۳ھ(۸۱)

اشپرانگر نے دستورِ عشق کے مصنف کا نام لالہ سنت پرکاش لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ اشپرانگر نے طبع کلکتہ ۱۸۱۲ء کا ذکر کیا ہے، لیکن وہ اسے دیکھنے کے مدعی نہیں۔(۸۲) ڈاکٹر محمد باقر کا بیان ہے کہ مصنف کا صحیح نام لالہ جوت پرکاش ہے اور مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۱۳۶ھ ہے۔(۸۳)

---

۷۶ سسی ہاشم (پنجابی) حوالہ ماسبق

۷۷ قاضی فضل حق، اردو ۱۹۳۰ء، ص ۲۳ے

۷۸ اشپرانگر نمبر ۲ ۷ ۴، ص ۵۴۴، نیز اسٹوارٹ، ص ۷۳

۷۹ ایتھے نمبر ۲۴۵۲

۸۰ ہرنام سنگھ شان، مقدمہ سسی ہاشم، نیز اشپرانگر، ص ۵۰۸

۸۱ نورالہدیٰ محمد عمر، اردو ۱۹۲۹ء، ص ۶۴ے، نیز اشپرانگر، ص ۴۵۲

۸۲ اشپرانگر، ص ۴۵۲

۸۳ پنجابی قصے فارسی زبان میں، ص ۳

۶۔ شہید ناز، از قاضی مرتضیٰ خاں سورتی (بعہد محمد شاہ)[۸۴]

۷۔ حسن و ناز، از میر محمد بھکری[۸۵]

۸۔ تحفۃ الکرام، از مخدومی ۱۲۵۶ھ[۸۶]

۹۔ وقائع پنوں از محمد حسین حسین (المتوفی قبل ۱۲۵۱ھ) اور شہباز خاں سیالکوٹی[۸۷]

۱۰۔ سسی و پنوں از فرخ بخش مکتوبہ ۱۲۵۸ھ[۸۸]

۱۱۔ مہر و ماہ از پیر محمد اودھی، مطبوعہ ۱۲۹۵ھ[۸۹]

۱۲۔ محمد افضل سرخوش دہلوی، صاحب کلمات الشعرا (ولادت ۱۰۵۰ھ) شاگرد میر معز فطرت (وفات ۱۱۲۶ھ) نے بھی قصہ ''سسی و پنو'' کو نظم کیا تھا۔ اس کا نام ''مثنوی حسن و عشق'' ہے۔ آغاز:

الٰہی شور شے در دم فزوں کن
نمکدا نے بداغم سرنگوں کن[۹۰]

اردو نسخے

۱۔ مثنوی اسرارِ محبت، از نواب محبت خاں محبت شاگرد جرات، سنہ اختتام ۱۱۹۷ھ۔[۹۱] یہ مثنوی حسرت موہانی نے اردوے معلےٰ پریس، علی گڑھ

۸۴ بحوالہ اردو، ۱۹۲۹ء، ص ۶۴۷

۸۵ ایضاً

۸۶ ایضاً

۸۷ ڈاکٹر محمد باقر، ا۔ک۔م۔ نومبر ۱۹۴۳ء

۸۸ ا۔ک۔م۔ فروری ۱۹۴۴ء

۸۹ بحوالہ نثری داستانیں، ص ۶۰۳

۹۰ تذکرہ گل رعنا، قلمی، ورق ۲۴۹ الف

۹۱ باڈلین میں یہ مثنوی مخطوطہ دیوان محبت میں شامل ہے۔ ورق ۱۵۱ تا ۱۷۷، نمبر ۲۳۳۲ نیز اشپرنگر، ص ۶۴۲، سالار جنگ ص ۲۹۱، نمبر ۸۷۲

سے شائع کی تھی۔

۲۔ مثنوی سسی پنوں، از کیسرا سنگھ جہانگیر[۹۲]

۳۔ مثنوی سسی پنوں از سالک[۹۳]

۴۔ مثنوی نالہ مہجور از لال سنگھ میر منشی ریزیڈنٹ کشمیر[۹۴]

۵۔ سسی پنوں (نثر) از مقبول احمد خلف قدرت احمد فاروقی گوپاموی، ۱۲۶۵ھ[۹۵]

۶۔ امجد علی قلق نے اپنی مثنوی مہر و مشتری (سال تصنیف ۱۸۶۰ء) میں لکھا ہے کہ اس نے سعدالدین شفق رئیس کالپی کی فرمائش پر سسی پنوں کا قصہ نظم کرنا شروع کیا تھا، لیکن موصوف کے انتقال سے طبیعت مکدر ہو گئی اور قصہ نامکمل رہ گیا۔[۹۶]

۷۔ قصہ سسی پنوں (نثر) عبدالحلیم شرر نے اسے مخدومی کی فارسی "تحفۃ الکرام" سے اخذ کر کے ستمبر ۱۸۹۸ء کے دلگداز میں شائع کیا۔

۸۔ سسی پنوں (نثر) نیاز فتح پوری نے فارسی "حسن و ناز" (میر محمد بھکری) اور "شہیدِ ناز" (قاضی مرتضےٰ سورتی) کی بنا پر اس قصے کو جولائی ۱۹۴۹ء

---

۹۲ بحوالہ مقدمہ سسی پنوں (پنجابی)

۹۳ ایضاً

۹۴ ایضاً

۹۵ دتاسی، خطبات، ص ۱۵۶

۹۶ امجد علی قلق کے اشعار یہ ہیں:

سسی پنوں کا فسانہ خوب ہے — نظم ہی میں اس کا لانا خوب ہے
بارے جب تھوڑا سا اس کو لکھا — موردِ تحسیں ہوا ان کو دکھا
لیکن ان کی جب کہ رحلت ہو گئی — اس سے افسردہ طبیعت ہو گئی

(مثنوی مہر و مشتری ۱۲۷۷ء، ص ۸)

کے نگار میں شائع کیا۔(۹۷)

۹۔ گارساں دتاسی کا بیان ہے "دیوی دیال نے سسی پنوں کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے" (۱۸۷۰ء(۹۸)) اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ دیوی دیال کا یہ نسخہ اُردو میں تھا یا ہندی میں۔

۱۰۔ مثنوی نسیم سحر (سسی و پنوں) مصنفہ جیالال خستہ دہلوی، ۱۸۷۶ء(۹۹)

۱۱۔ سسی و پنوں (اُردو نثر) یہ کتاب رام تہ مل و مولوی علی محمد تاجران کتب نے نولکشور پرنٹنگ ورکس سے چھپوا کر ۱۹۰۴ء میں لاہور سے شائع کی۔ مصنف کا نام درج نہیں۔ کل صفحات ۱۶۔ تمہید میں صراحت کردی گئی ہے کہ یہ قصہ تحفۃ الکرام سے نقل کر کے بیان کیا جاتا ہے۔

قصّے کی مقبولیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"پنجاب میں جو قصّے بچے بچے کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں، انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ ہولیوں یا دسہرے میں جو سوانگ نکالے جاتے ہیں، ان میں ضرور سسی پنوں کا سوانگ بھی نکلا کرتا ہے۔ بھانڈ لوگ تماشوں میں بھی ان کے سوانگ سے دل لبھاتے ہیں۔ شہروں کے لوگ جب کبھی کاروبار سے فرصت پاتے ہیں، سسی پنوں کے گیت سُن کر یا گا کر اپنا دل بہلاتے ہیں۔ دیہات کے کاشتکار ہوں یا چرواہے، وہ بھی کام کرتے وقت اپنے دل کے ولولے انھیں کے گیت گا کر ظاہر کرتے ہیں"۔(۱۰۰)

---

۹۷ نیاز فتح پوری نے لکھا ہے کہ اس قصّے کو انگریزی میں لفٹننٹ برٹن اور مسز لوسٹن نے منتقل کیا تھا (نگار جولائی ۱۹۴۹ء، ص ۳۹)

۹۸ مقالات دتاسی، ص ۷۵

۹۹ مثنوی نسیم سحر، مطبوعہ دہلی ۱۸۸۴ء

۱۰۰ سسی پنوں مطبوعہ لاہور، ۱۹۰۴ء، ص ۲

مثنوی اسرارِ محبت

اردو منظوم نسخوں میں سے محبت خاں محبت کی مثنوی "اسرارِ محبت" (۱۱۹۷ھ) بلند ادبی مرتبہ رکھتی ہے۔ مثنوی اسرارِ محبت کا جو نسخہ جناب مسعود حسن رضوی ادیب کے کتب خانے میں ہے، وہ "مطبع بیت السلطنت، لکھنؤ" کا چھپا ہوا ہے۔[۱۰۱] اس میں سنہ طبع درج نہیں، لیکن یہ مثنوی غالباً اواسط ماۃ ۱۳ میں طبع ہوئی تھی۔ اشپرانگر نے بھی اس مثنوی کے مطبوعہ نسخے ہی کا ذکر کیا ہے جو لکھنؤ سے ۲۰ صفحات پر شائع ہوا۔ لیکن اشپرانگر نے سنہ طبع نہیں بتایا۔[۱۰۲] لکھنؤ ہی کا ایک مطبوعہ نسخہ کتب خانہ انڈیا آفس لندن میں بھی ہے۔ بلوم ہارٹ کا قیاس ہے کہ یہ ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا ہوگا۔[۱۰۳] جناب مسعود حسن رضوی ادیب کے کتب خانے[۱۰۴] کے علاوہ اس مثنوی کے مزید نسخے کتب خانہ سالار جنگ میں[۱۰۵] کتب خانہ رضائیہ میں[۱۰۶] اور باڈلین لائبریری میں[۱۰۷] محفوظ ہیں۔ اشپرانگر نے بھی اس کے ایک نسخے کا ذکر کیا ہے۔[۱۰۸] حسرت موہانی نے اس مثنوی کو قاضی محمد صادق خاں اختر کی مثنوی "سراپا سوز" اور آغا علی شمس کی "طلعت الشمس" کے ساتھ "مجموعہ مثنویات" کے نام سے شائع کیا تھا۔

نواب محبت خاں، حافظ الملک نواب رحمت خاں والیِ بریلی کے فرزند تھے۔ وہ جنگ روہیلہ کے بعد الہٰ آباد میں قید رہے۔ آصف الدولہ کے زمانے

---

۱۰۱ رسالہ اردو، جولائی ۱۹۳۱ء

۱۰۲ اشپرانگر، ص ۶۴۲

۱۰۳ انڈیا مطبوعات، ص ۱۵۳

۱۰۴ اردو، ۱۹۳۱، ص ۴۵۹

۱۰۵ سالار جنگ، ص ۶۹۱

۱۰۶ کتب خانہ رضائیہ رام پور، نشان نظم ۵۲۸

۱۰۷ باڈلین نمبر ۲۳۳۲

۱۰۸ اشپرانگر، ص ۶۴۲

میں رہا ہو کر لکھنؤ آئے اور زندگی فراغت سے بسر ہونے لگی۔

پہلے میر درد سے تلمذ تھا۔ بعد میں جرأت کو بزمرۂ شعراء ملازم رکھا اور انھیں سے اصلاح لینے لگے۔ نساخ انھیں جعفر علی حسرت کا بھی شاگرد بتاتے ہیں۔ ۱۲۲۲ھ میں انتقال کیا۔(۱۰۹) مثنوی اسرارِ محبت ان کے دیوان نسخہ باڈلین میں شامل ہے۔(۱۱۰)

عبدالغفور نساخ نے نواب محبت خاں محبت کو حسرت کے علاوہ درد کا بھی شاگرد بتایا ہے(۱۱۱) لیکن قاضی عبدالودود صاحب کی رائے ہے کہ "محبت کا تلمذِ درد مشکوک ہے۔ پہلے حسرت کے شاگرد تھے، بعد میں جرأت سے بھی اصلاح لی"۔(۱۱۲)

محبت خاں محبت نے اس قصّے کو مسٹر جانسن کی فرمائش سے نظم کیا تھا، جس کا ذکر انھوں نے مثنوی کے ابتدائی اشعار میں بالتفصیل کیا ہے۔

مثنوی کا آغاز محبت کی تعریف و توصیف اور "اسرار عشق" اور "تاثیرِ عشق" کے بیان سے ہوتا ہے۔ سسی پنوں کے قصّے سے محبت کو کیسی رغبت تھی، اس کا پتا ذیل کے اشعار سے چلتا ہے:

عجب قصہ عجائب ہے کہانی	کہ سن کر ہو دل فولاد پانی
سمجھتا ہی نہ ہووے جو دمِ سرد	جگر سے وہ بھی کھینچے آہ پُردرد
عزیزو کیا کروں اس کا بیاں ہائے	کہ مرجانے کی ہے یہ داستاں ہائے

محبت نے سسی کی پیدائش، اس کے دریا میں بہائے جانے اور دھوبی کے گھر جوان ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ بلکہ قصّے کی ابتدا ہی سسی کی جوانی

۱۰۹ سخن شعراء، ص ۴۱۶

۱۱۰ باڈلین نمبر، ۲۳۳۲

۱۱۱ سخن شعراء، ص ۴۱۶

۱۱۲ مکتوب قاضی عبدالودود بنام مولف

۱۱۳ گلزار ابراہیم، ص ۲۳

دیوانی کے ذکر سے کی ہے۔ وہ اسے "جنگ سیال" کا باشندہ بتاتا ہے۔ جہاں گھر گھر حسن و عشق کا چرچا تھا۔ مقامی روایت کے مطابق جھنگ سیال دراصل ہیر کا وطن تھا، سسی کا نہیں۔ لیکن محبت سسی کو ہیر کی بھتیجی قرار دے کر ایک نئی روایت قائم کرتا ہے۔ سسی پری تمثال اور حسن و جمال میں بے مثال تھی۔ شاعر نے اس پیکرِ وفا کا سراپا یوں بیان کیا ہے:

سراپا کیا لکھوں اس شمع رو کا — کہ تھی وہ حسن کا شعلہ سراپا
عیاں یوں موے سر تھے عنبر آلود — کہ جیسے شمع کے شعلے پہ ہو دود
گندھی چوٹی نظر اس طرح آوے — کہ جیوں مارِ سیہ لہریں دکھاوے
بہت سے تھا دلوں کا اس میں مسکن — اچنبھا ہے کہ اک سانپ اور کئی من

محبت نے سراپا کے رسمی انداز کو برقرار رکھا ہے اور جسم کے ہر حصے کی تعریف کی ہے:

پریشاں رخ پہ یوں زلفیں تھیں یکسر — رگِ ابر سیہ جیسے ہو مہ پر
وہ دنداں آب دار اس سیم بر کے — کہ سوراخ ان سے ہو دل میں گھر کے
اور اس کی نتھ کا یہ پیارا ہے حلقہ — کہ گویا حسن نے مارا ہے حلقہ
نہیں گردن کی کچھ تعریف ہوتی — وہ ہے گویا صراحی دار موتی
یہ ساعد پہ نزاکت تھی نمودار — رگِ گل کی بھی نسبت جس پہ ہو بار
یہ گرمی اس کے تھی ہر اک سخن میں — کہ آتش سی لگاوے جان و تن میں

سسی کے باغ میں سوداگروں کا قافلہ اترتا ہے۔ محبت کے ہاں سسی کے عشق کی ابتدا قافلے والوں کے پاس پنوں کی تصویر دیکھنے سے نہیں، بلکہ خود پنوں کے دیکھنے سے ہوتی ہے، جو سوداگروں کے ہمراہ سسی کے باغ میں وارد ہوا تھا۔ پنوں جیسے خوبرو جوان کو دیکھتے ہی سسی ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہے۔

یکایک وہ ہوئی یوں محوِ دیدار — کہ جنبش ہوگئی مژگاں کو دشوار

وہ گلشن کا تماشا سب بھلایا　　فلک نے اور ہی اک گل کھلایا
دل اس گل رو کا بر میں یوں پکارا　　ہمیں تو بے کلی نے مفت مارا

آخر:

لگی دونوں طرف سے خوب ہی لاگ　　دلوں کے بیچ بھڑکی عشق کی آگ

محبت نے آغاز ہی میں سسی پنوں کی براہِ راست ملاقات کرا کے اصل قصّے کے کئی واقعات حذف کر دیے ہیں۔ سسی حیلے بہانے سے رات کو عزیزوں کی آنکھ بچا کر گھر سے نکلتی ہے اور پنوں کے پاس آتی ہے۔ نصف شب تک دونوں راز و نیاز کی باتوں میں مشغول رہتے ہیں:

انھیں دیکھے تھا یوں حیران ہو ماہ　　زمیں پہ کس طرح نکلے تھے دو ماہ
کبھی تو سو مزے ہوتے تھے باہم　　کبھی کچھ سوچ کر روتے تھے باہم

آخر نیند کا غلبہ ہوا اور کیف و نشاط کے اس عالم میں دونوں بے خبر سو گئے۔ پنوں کے قبیلے والوں نے اس عشق کو مصیبت خیال کیا اور بدنامی کے ڈر سے وہ پنوں کو سسی کے پہلو سے سوتے میں اُٹھا، راتوں رات وہاں سے چل دیے۔ ہاشم کے ہاں پنوں کے رفیق کوچ کرنے سے پہلے اسے شراب پلا کر مدہوش کر دیتے ہیں۔ لیکن محبت کی مثنوی میں اس کا کوئی ذکر نہیں، غرض:

رہی سوتی یہاں غافل یہ مجبور　　ہزار افسوس پہنچا قافلہ دُور
ہوئی جب خوابِ غفلت سے وہ بیدار　　بیاں اس وقت کا ہے سخت دشوار
نہ دیکھا اس نے جو بر میں وہ دلبر　　عجب صورت سی تھی حیران دششدر
یہی رہ رہ کے آتا تھا پریکھا　　کہ تھا یہ واقعی یا خواب دیکھا
ہوا خونِ جگر آنکھوں سے جاری　　لگا دل بر میں کرنے بے قراری
نظر کر پیش و پس ایدھر اُدھر کو　　لگی رونے وہ دھر زانو پہ سر کو

دل کی بے چینی نے زیادہ سوچنے کی مہلت ہی نہ دی اور وہ ایسے ہی روتی پیٹتی سر دھنتی اس سمت چل دی جدھر قافلہ گیا تھا:

برہنہ پا اور عریاں سر چلی تھی ‏ قیامت اس کے دل کو بے کلی تھی
یہ غم نے شکل کر دکھلائی اس کی ‏ ملائی خاک میں رعنائی اس کی
کیا تھا اس سے طاقت نے کنارا ‏ گریباں صبر کا تھا پارہ پارہ
لگی جب وہ زمیں پہ پاؤں دھرنے ‏ قدم بوسی لگے خار اس کے کرنے
چلی وہ نقشِ پائے کارواں پر ‏ غزل یہ عاشقانہ تھی زباں پر

غزل کے چند اشعار:

بس اپنا کچھ نہیں اب آہ چلتا ‏ کہ دل کو لے گیا اک راہ چلتا
سمجھنا بوجھنا تھی راہ کی بات ‏ کہ مجھ کو بھی لیے ہمراہ چلتا
رکھا اب ناتوانی نے مجھے توڑ ‏ نہیں زور اس پہ کچھ واللہ چلتا

ماں باپ کو علم ہوا تو سسی کو صحرا سے واپس گھر لائے اور سمجھانے بجھانے لگے۔ باہمی مشورے سے طے پایا کہ پنوں کے پاس قاصد بھیجا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سسی کے دربدر آوارہ پھرنے سے پنوں اس سے منحرف ہو جائے۔ سسی نے ان باتوں میں آکر کئی روز صبر کیا لیکن وحشت کا یہ عالم تھا:

کبھی سر پیٹ لینا گاہ رونا ‏ کبھی بیزار آپ اپنے سے ہونا
کبھی رو رو کے آہیں سرد بھرنا ‏ کبھی کچھ ذکر دل ہی دل میں کرنا
کبھی حیران ہو اک سمت تکنا ‏ کبھی بیٹھے کچھ آپ ہی آپ بکنا
پری کو اک دوانا سا بنایا ‏ محبت نے عجب عالم دکھایا
کبھی جاتے جو دیکھے تھی کسی کو ‏ تو اس کو گھیر کر کہتی تھی رو رو
وہ بلوچوں کا جو اک کارواں ہے ‏ کہ جس میں ایک پنوں نوجواں ہے
جگر پر داغ میرے دے گیا وہ ‏ متاعِ صبر و طاقت لے گیا وہ

پڑی پھرتی ہوں میں ناشاد اس بن	کروں ہوں جیوں جرس فریاد اس بن
گیا وہ چھوڑ یوں مجھ ناتواں کو	کہ جیسے نقشِ پائے کارواں کو
کبھی دیکھا تو مجھ کو بھی بتادو	پہنچ جاؤں میں کچھ ایسا پتا دو

سسی کے گھر واپس لائے جانے کا واقعہ محبت کی جدت طرازی ہے۔ کسی دوسرے قصہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ غرض ماں باپ کے سمجھانے بجھانے کا کچھ اثر نہ ہوا۔ سسی کی تو ہڈی ہڈی آتشِ عشق میں جل بل رہی تھی۔ وہ ایک دن موقع پا کے گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ ناگاہ راہ میں ایک اجنبی نے خبر دی کہ :

دیارِ سندھ میں ہے جلوہ گر وہ	ملا چاہے جو تو جائے ادھر کو

اتنا معلوم ہونا تھا کہ پاکوباں اور سرگرداں سسی نے سندھ کی راہ لی۔ ملاقات کی ایک موہوم امید کے سہارے سسی نے ریگ زار کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے، میلوں کی مسافت طے کر ڈالی۔ آخر پنوں کے شہر میں پہنچ کر سسی نے اس کے پاس اپنی انگوٹھی بطور نشانی بھیجی۔ لیکن قاصد پنوں کی شادی کی خبر لایا جو اس روز قبیلے کی ایک حسین عورت سے ہونے والی تھی، یہ خبر سنتے ہی سسی دھک سے رہ گئی اور گرتے ہی مر گئی۔ پنوں کو پتا چلا تو وہ دوڑا آیا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ آخر پنوں بھی روتا تڑپتا سسی کی لاش سے لپٹ کے قربان ہو گیا :

محبت، ہے محبت کا یہ اسلوب	کہ طالب اس کا بچتا ہے نہ مطلوب
محبت ہے بڑی یہ ایک آفت	محبت نے کیا لاکھوں کو غارت

مثنوی کا خاتمہ تاریخِ تصنیف پر یوں ہوا ہے :

کہی تاریخ اس کی یہ بہ صنعت	"عجب قصہ ہے اسرارِ محبت"[۱۱۴]

۷ ۹ ۱ ۱ ھ

۱۱۴ نسخہ مطبوعہ حسرت موہانی، حوالہ ماسبق

سسی کے پنوں کے شہر پہنچنے، انگوٹھی بھجوانے اور اس کی شادی کی خبر سن کر ہلاک ہونے کا ذکر کسی قصہ نگار نے نہیں کیا۔ یہ محبت کی اختراع ہے، بلکہ اس پر مستزاد یہ کہ پنوں کی ہم قوم منگیتر بھی ان دونوں شہیدانِ محبت پر نثار ہو جاتی ہے۔ اصل قصہ صرف یہ ہے کہ سسی پنوں تک پہنچ ہی نہیں پائی تھی اور راہ ہی میں تپش اور لو کے اثر سے تڑپ تڑپ کے پیاسی مر گئی۔

مثنوی میں کل ۵۹۱ اشعار ہیں۔ ظاہر ہے کہ محبت نے اصل پلاٹ کو بہت مختصر کر دیا ہے۔ کئی واقعات حذف کیے ہیں اور کچھ اپنی طرف سے بڑھا بھی دیے ہیں۔ لیکن لطف یہ ہے کہ قصے کی دلچسپی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ محبت کی مثنوی اپنی ادبی اور فنی خوبیوں کی وجہ سے اردو مثنویوں میں اونچا درجہ رکھتی ہے۔ اندازِ بیان اور لب و لہجے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی نغزگو اور قادرالکلام شاعر کی تصنیف ہے۔ سسی کے حالات کو اس سہولت اور سوز سے بیان کیا گیا ہے کہ دل پر چوٹ لگتی ہے۔ تشبیہیں حسین ہیں اور مصرعے سادہ و بے ساختہ ہیں۔ بقول مجنوں گورکھپوری "فنی اعتبار سے یہ مثنوی کامل العیار ہے"۔[115]

مثنوی نسیم سحر، مصنفہ پنڈت جیالال خستہ دہلوی

یہ مثنوی مطبع افتخار دہلی سے ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ صفحات کی کل تعداد ۲۳ ہے اور ہر صفحے میں ۲۲ ابیات ہیں۔ مثنوی کا سال تصنیف ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء ہے، جیسا کہ مصنف کے قطعہ تاریخ سے ظاہر ہے:

جبکہ یہ داستاں تمام ہوئی ‌ ‌ ‌ دلِ ناشاد باغ باغ ہوا
سالِ تاریخ کا ہوا جو فکر ‌ ‌ ‌ ہاتفی نے کہا فراغ ہوا

۱۲۹۳ھ

جیالال خستہ دفتر میونسپل کمیٹی دہلی میں ملازم تھے۔ خمخانۂ جاوید کی تصنیف کے وقت ان کی عمر ۴۰ برس سے زیادہ تھی۔ شعر کا پاکیزہ اور ستھرا مذاق

۱۱۵ مجنوں گورکھپوری، تنقیدی حاشیے، ص ۲۰۸

رکھتے تھے۔[116]

شاعر نے قصے کے بارے میں اپنے ماخذ کا پتا نہیں دیا۔ البتہ اتنی صراحت کردی ہے کہ اس نے یہ مثنوی اپنے ایک دوست میر صادق علی کی فرمایش پر لکھی:

خصوصاً جو ہیں میر صادق علی   خبردار سرّ خفی و جلی
لکھا جن کے کہنے سے قصہّ تمام   رہیں تیری رحمت سے خرسم مدام

مثنوی کی ابتدا اس زمانے کے دستور کے مطابق بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور حمد خدائے کریم سے کی ہے۔ ایک پنڈت، پیغمبر اسلام اور خلفائے راشدین کی شان میں کس خضوع و خشوع سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے، ان اشعار میں ملاحظہ فرمایئے:

لکھوں پہلے حمدِ خدائے کریم   کہ ہے نام اس کا غفور الرحیم
ہوا عشق کا بھی اسی سے ظہور   کیا یعنی پیدا محمد کا نور
وہ ساقیِ کوثر رسولِ امیں   بنا جن کی خاطر زمان و زمیں
امام رسل ختم پیغمبراں   محبّ خدا سرورِ دوجہاں
ہیں اصحاب اس کے جو والا گہر   عروجِ فضیلت کے شمس و قمر
ابوبکر صدیقِ عالی خطاب   سپہر کرامت کا اک آفتاب
دوئم عمر عادل مبارک شیم   لے نوشیرواں جن کے جھک کے قدم
سوئم حضرت عثمانِ عالی وقار   چہارم علی سرورِ نامدار
ثنا میں کروں ان کی جو کچھ رقم   وہ بے شک ہے کم بلکہ کم سے بھی کم

قصّے کا آغاز شہر بھن بھور اور شاہ بھن بھور کے بیان سے ہوا ہے۔ محبت خاں محبت کی بہ نسبت خستہ دہلوی کی یہ مثنوی سسی ہاشم کی اصل روایت

۱۱۶   خمخانۂ جاوید، جلد سوم، ص ۱۹

سے قریب تر ہے۔ گو اس میں بعض اختلافات ہیں، لیکن نظر بظواہر یہ خستہ دہلوی کی اختراع نہیں۔ غالباً اس نے سسی پنوں کے قصے کو جس طرح دہلی میں سُنا، ویسے نظم کر دیا۔

بھن بھور کے بادشاہ کا لاولد ہونا، منتوں مرادوں سے سسی کا پیدا ہونا، منجموں کا پیشین گوئی کرنا کہ شہزادی فتنۂ عشق کا شکار ہو کر ننگ و ناموس کو بٹا لگائے گی اور اس کے عشق کا افسانہ سُن کر لوگ لیلیٰ و مجنوں کو بھول جائیں گے۔ بادشاہ کا بیٹی کو صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دینا، صندوق کا اتا دھوبی کے ہاتھ لگنا اور سسی کا دھوبی کے گھر جوان ہونا، دریا کے کنارے بادشاہ کے بنوائے ہوئے محل میں رہنا، وغیرہ قصے کی مستند روایت کے عین مطابق ہے۔ خستہ دہلوی نے ان واقعات کو مفصّل بیان کیا ہے اور تقریباً نصف مثنوی انھیں پر ختم ہو گئی ہے۔ اس کے بعد کا قصہ کسی حد تک مختلف ہے۔

ہاشم کی روایت کے مطابق سسی نے کیچ کے سوداگروں کے پاس پنوں کی تصویر دیکھی اور اس پر فریفتہ ہو گئی۔ خستہ دہلوی کے ہاں "کیچم" کے دو سوداگر تجارت کی غرض سے بھن بھور سے گزرتے ہیں۔ سسی انھیں محل میں بلوا کر پوچھتی ہے کہ کیا کیچم میں پنوں نامی کوئی نوجوان رہتا ہے۔ نجومیوں کے کہنے کے مطابق قسامِ ازل سے اس کا رشتہ پنوں سے مقرر ہو چکا ہے۔ سوداگر جواب دیتے ہیں کہ پنوں انھیں کا بھائی ہے۔ اس پر سسی سوداگروں سے کہتی ہے کہ اگر جان بخشی چاہتے ہو تو کیچم سے اپنے بھائی کو بھن بھور لے آؤ۔ ان میں سے ایک سوداگر وہیں رہتا ہے اور دوسرا پنوں کو لانے کے لیے "کیچم" پہنچتا ہے۔ ان کی ماں یہ ماجرا سُن کر پنوں سے کہتی ہے:

گوارا نہیں تیری فرقت مجھے	جو دوں واں کے جانے کی رخصت تجھے
نجاوے اگر واں تو اے نورِ جاں	رہے بھائی تیرا بقید گراں
عجب سخت مشکل ہوئی آ کے پیش	اِدھر زخم نیزہ ادھر زخمِ نیش

ولے جس طرح ہو سکے اے جواں رہا کر کے بھائی کو لا تو یہاں

پنوں بھن بھور پہنچتا ہے اور سسّی اسے دیکھتے ہیں مست و بیخود ہو جاتی ہے:

درِ باغ پر جاکے دیکھا جو نہیں[117] تو آیا نظر وہ جوانِ حسیں
اسی دم ہوئی جان و دل سے نثار نہ کچھ ہوش اس کو رہا زینہار
نظر سے نظر جو ملی یک بیک رہی مثلِ وحشی اُسی جا ٹھٹھک

یہی حالت پنوں کی بھی ہوئی۔ چند روز باہم راز و نیاز رہا۔ اس کے بعد دونوں نے نکاح کی ٹھانی۔ اتا دھوبی سے اجازت طلب کی گئی۔ اس نے پنوں کو فنِ گازری میں آزمایا اور اس کے بعد اسے اپنی دامادی میں قبول کرلیا۔ بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی اور دونوں خوشی خوشی دریا کے کنارے محل میں رہنے لگے۔ یہ واقعات اصل قصّے سے مختلف ہیں۔ ہاشم کے ہاں نکاح کی نوبت ہی نہیں آتی۔

پنوں کے بھائی جب وطن لوٹے تو ان کی ماں نے یہ سرگزشت سُن کر سر پیٹ لیا:

ہوئی ایسی کیا مجھ سے صادر خطا ہوا پون[118] میرا جو مجھ سے جُدا
لگی کہنے بیٹوں سے جاؤ شتاب وہ سسّی ہے کون ایسی خانہ خراب
کسی طرح پھندے سے اس کے چھڑا یہاں لاؤ پنوں کو بہر خدا

دونوں بھائیوں نے عورتوں کا لباس زیبِ تن کیا اور خنیاگری کے بہانے بھن بھور میں وارد ہوئے۔ سسّی نے ان کی شہرت سُنی تو انھیں محل میں طلب کیا۔ رقص و سرود کی محفل گرم ہوئی اور رات گئے تک میناد ساغر کا

---

۱۱۷ کذا غالباً جو ہیں

۱۱۸ پنوں

دَور رہا۔ پنوں کے بھائی اسی موقع کی تاک میں تھے۔ انھوں نے سسّی اور پنوں دونوں کو بے سدھ پایا تو پنوں کو مدہوشی کے عالم میں اپنے ساتھ لیے راتوں رات بھن بھور کے علاقے سے باہر نکل گئے۔ پنوں کو شراب پلا کر مدہوش کرنے کا واقعہ ہاشم کے ہاں بھی ملتا ہے۔ لیکن پنوں کے بھائیوں کا عورتوں کی وضع میں بھن بھور آنا اصل روایت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

صبح سویرے سسّی کی آنکھ کھلی تو پنوں کو قریب نہ پاکر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ محل میں کہرام مچ گیا۔

وہ القصہ مینا وساغر کو توڑ　　چلی حال میں اپنے ان سب کو چھوڑ
شکایت کبھی چرخِ دوار کی　　کبھی یاد اس ماہ رخسار کی
کبھی دے یہ بادِ صبا کو پیام　　کہ اے پیکِ مشتاق نیکو خرام
مرے گل کی تو جا کے کر جستجو　　کسی طرح لادے مجھے اس کی بو

اس کے بعد کے قصے سے خستہ دہلوی نے پورا انصاف نہیں کیا اور اسے نہایت مختصر طور پر ایک آدھ صفحے میں ختم کر دیا ہے۔

یہ جاتی تھی کرتی ہوئی شورِ غم　　فغاں زیرِ لب دمبدم چشم نم
ہوئی تشنگی سے جو مجبور سخت　　ہوئی دل میں غمگین و رنجور سخت
پڑے پانو میں اس کے چھالے تمام　　نہ چلنے کی طاقت نہ تابِ قیام
وہ ریگِ بیاباں وہ جنگل کی دھوپ　　کہ دیکھے سے کالا ہو آہو کا روپ
کہاں وہ کفِ پائے رنگیں نگار　　کہاں اس قدر جنگلِ خار دار
ہوئی مضطرب غم سے وہ مہ لقا　　گری ہو کے بیہوش غش آگیا
کہاں وہ خواصیں کہاں روے یار　　کہاں بزمِ رنگیں کہاں وہ بہار
اکیلی پڑی تھی نہ تھا کوئی پاس　　ضعیف و نحیف و پریشاں اُداس
ذرا ہوش آیا تو کی ایک آہ　　کہ جس سے ہوا رنگِ صحرا سیاہ

زباں پر تھا نام صنم بار بار   تاسف سے روتی تھی وہ زار زار
اٹھا سر کو پتھر پہ پٹکا وہیں   ہوا سارا زخمی سرِ نازنیں
مرخص ہوئی اس کی پھر تن سے جاں   الم سے ہوا تیرہ سارا جہاں (۱۱۹)

اس کے بعد چرواہے کا سسّی کو دفن کرنا، پنوں کا کیچ سے پلٹ کر آنا، قبر دیکھ کر ٹھٹھکنا، چرواہے سے ماجرا سننا، قبر کا شق ہونا، پنوں کا اس میں سما جانا وغیرہ واقعات وہی ہیں، جنھیں پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ البتہ سسّی کا پتھروں سے سر مار مار کر مرنے کا واقعہ قدرے بدلا ہوا ہے۔ ہاشم کے ہاں سسّی پیاس کے مارے تڑپ تڑپ کے جان دیتی ہے۔

مثنوی کے آخری اشعار دعائیہ ہیں۔ اس کے بعد مصنف اور اس کے احباب کے کہے ہوئے دس قطعاتِ تاریخ ہیں۔

یہ مثنوی ادبی اعتبار سے محبت خاں محبت کی مثنوی کو نہیں پہنچتی۔ خستہ دہلوی کو بے جا رنگ آمیزی اور قصے کی نوک پلک سنوارنے کا مطلق خیال نہیں، اس نے واقعات پر نظر رکھی ہے اور انھیں سیدھے سادے طور پر نظم کردیا ہے۔ تاہم وہ شیوابیان نہ سہی، صاحب زبان ضرور ہے۔ دہلوی لب و لہجہ، صاف سلیس الفاظ اور بے تکلف بول چال کا سا انداز مثنوی میں تاثیر پیدا کرتا ہے۔

مثنویات پدماوت

پدماوت ہندی ادب کا وہ شاہکار ہے، جسے بقائے دوام اور شہرتِ عام نصیب ہوئی۔ اسے ملک محمد جائسی نے بعہدِ شیر شاہ ۱۵۴۰ء (۹۴۷ھ) میں اودھی زبان میں تصنیف کیا۔

ملک محمد ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ہندی مورّخین انھیں جائس کا باشندہ بتاتے ہیں۔ پدماوت کے علاوہ انھوں نے دو اور تصانیف اکھراوٹ اور آخری کلام بھی لکھیں۔ پدماوت کی زبان اودھی ہے۔ لیکن فی الاصل یہ

۱۱۹   مثنوی نسیم سحر از جیالال خستہ، دہلی ۱۸۸۴ء، ص ۱۹

کتاب فارسی رسم الخط میں لکھی گئی اور اس کے تمام تر قدیم نسخے فارسی رسم الخط ہی میں لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ ملک محمد جائسی کا سنہ وفات ۹۴۹ھ بتایا جاتا ہے۔[۱۲۰]

قصہ

پدماوت کی کہانی کے دو حصے ہیں۔ پہلا تخیلی اور دوسرا نیم تاریخی۔ پہلے حصے میں سنہل دیپ[۱۲۱] کے راجا گندھرو سین کی حسین بیٹی پدماوتی جوان ہونے کے بعد دل گرفتہ رہنے لگی۔ یہ ایک توتے کو جس کا نام ہیرامن تھا، بہت عزیز رکھتی تھی۔ توتا شہزادی کا دل بہلانے کے لیے اسے عشق و محبت کے سنہرے خواب دکھانے لگا۔ راجا گندھرو سین نے توتے کو ہلاک کرنا چاہا لیکن وہ بچ نکلا اور ایک برہمن کے ہاتھ پڑا جس نے اسے چتوڑ کے راجا رتن سین کے پاس بیچ دیا۔ راجا نے اس سے پدماوتی کے حسن و جمال کا احوال سُنا اور پدماوتی کا نادیدہ عاشق ہوگیا۔ غرض پدماوتی کو حاصل کرنے کے لیے رتن سین جوگی کے بھیس میں سنہل دیپ پہنچا۔ یہاں توتے کے ذریعے راز و نیاز کے مراحل کے طے ہوئے۔ اور بڑے رگڑوں جھگڑوں کے بعد شادی ہو گئی۔ واپسی پر رتن سین اور پدمنی کا جہاز طوفان میں گھر کر راہ بھٹک گیا۔ طرح طرح کے مصائب و آلام سے مقابلے کے بعد دونوں چتوڑ پہنچے۔ پہلی رانی ناگمتی اور پدماوتی دونوں راجا کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگیں۔

اس کے بعد کا حصہ نیم تاریخی رنگ کا ہے۔ سلطان علاء الدین نے چتوڑ سے نکالے ہوئے راگھو نامی ایک برہمن سے پدمنی کے حسن و جمال کا تذکرہ سُنا اور اس کے حصول کے لیے بیتاب ہوگیا۔ چتوڑ پر چڑھائی کی گئی۔ لیکن آٹھ برس کے بعد بھی قلعہ فتح نہ ہوا۔ بالآخر علاء الدین نے صلح کرلی۔ رتن سین نے

---

۱۲۰ ہندی ساہتیہ کا اتہاس، رام چندر شکل، ص ۹۲ تا ۹۸

۱۲۱ بعض روایتوں کے مطابق سنہل دیپ سے مراد لنکا ہے، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک محمد جائسی نے جزائر دیو کو سنہل دیپ کہا ہے۔ یہ جزیرے لنکا سے جانبِ غرب واقع ہیں۔

سلطان کی مسلسل کئی روز تک دعوت کی۔ ایک دن اتفاقاً محل کے قریب ایک آئینے میں علاء الدین نے پدماوتی کا عکس دیکھ لیا جس کے بعد سلطان کی تمنا و بیقراری کئی گنا بڑھ گئی۔ جب کوئی تدبیر کارگر ہوتی نظر نہ آئی تو علاء الدین نے دھوکے سے رتن سین کو گرفتار کرلیا اور دہلی میں لاکر قید کردیا۔

راجپوت سرداروں نے راجا رتن سین کو رہا کرانے کے لیے چال چلی۔ چند جانباز سپاہی پالکیوں میں چھپ کر دہلی پہنچے۔ مشہور کیا گیا کہ پدمنی علاء الدین کے حرم میں داخل ہونے کے لیے آئی ہے۔ چنانچہ اسے راجا رتن سین سے آخری بار ملنے کی اجازت دی گئی۔ پالکیوں میں چھپے ہوئے راجپوت عین موقعے پر تلواریں سونت کر باہر نکل آئے اور انھوں نے قلعے کے سپاہیوں کو مارا گرایا۔ اس طرح راجا علاء الدین کی قید سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔

چتوڑ پہنچتے ہی رتن سین کا مقابلہ اپنے پڑوسی راجا دیو پال سے ہوگیا۔ جس نے رتن سین کی غیر موجودگی میں پدماوتی کو ورغلانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ دونوں میں سخت معرکہ ہوا۔ دیوپال مارا گیا اور رتن سین کے بھی مہلک زخم آئے۔ اسی اثنا میں علاء الدین بھی ایک جمعیت کثیر لیے رتن سین کے تعاقب میں چتوڑ پہنچا۔ مگر پدمنی اس کے وہاں پہنچنے سے کچھ ہی پہلے رتن سین کی لاش کے ساتھ ستی ہوچکی تھی۔[۱۲۲]

تاریخی اصلیت

ملک محمد جائسی نے ۹۴۷ھ میں اس قصّے کو اودھی زبان میں لکھا۔ جائسی کی پدماوت اس قدر مقبول و معروف ہوئی کہ لوگ اس قصّے میں بیان شدہ تمام باتوں کو تاریخی واقعات سمجھنے لگے۔ چنانچہ بعد میں آنے والے بعض

---

۱۲۲ ملک محمد جائسی، پدماوت، مشمولہ جائسی گرنتھاولی (ہندی) مرتبہ ماتا پرشاد گپت، ہندستانی اکیڈمی، الہ آباد ۱۹۵۲ء

مورخوں نے بھی پدماوت کی اصلیت تسلیم کرلی اور اس واقعہ کو سلطان علاء الدین خلجی سے منسوب کردیا۔ حالانکہ اس کے حقیقی ہونے میں کئی شبہات ہیں۔

سلطان علاء الدین خلجی سے اس واقعے کا کوئی تعلق نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ علاء الدین کی کسی معاصر تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ تاریخ محمدی[۱۲۳] اور تاریخ مبارک شاہی[۱۲۴] میں پدمنی کا کوئی تذکرہ نہیں۔ برنی نے بھی اپنی تصانیف میں اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔[۱۲۵] خواجہ نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں اور مولانا عصامی دہلوی[۱۲۶] نے شاہنامہ موسوم بہ فتوح سلاطین میں چتوڑ کی فتح کا ذکر تو کیا ہے، لیکن پدمنی کے وجود کو اس کا سبب قرار نہیں دیا۔ امیر خسرو نے خزائن الفتوح میں چتوڑ کی فتح کو مفصل بیان کیا ہے لیکن وہ بھی اس واقعے کا ذکر جائسی کی طرح نہیں کرتے۔[۱۲۷] امیر خسرو فتح چتوڑ کے عینی شاہد تھے۔ لیکن ان کے ہاں پدمنی کا کہیں ذکر نہیں۔ اگر جنگ کی تہہ میں واقعی پدمنی کی کشش کارفرما ہوتی تو امیر خسرو جیسا بے ریا شاعر اسے ضرور بیان کرتا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعے کے بیان کرنے میں سلطان کی توہین اور خفت تھی۔ اس لیے ہم عصر مورخین نے اسے خلاف مصلحت قرار دے کر بیان ہی نہ کیا، لیکن تاریخ فیروز شاہی، عہد علاء الدین خلجی کے بہت عرصے بعد فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں لکھی گئی۔ اس میں علاء الدین خلجی کے جملہ نقائص اور عیوب پوست کندہ بیان کردیے ہیں۔ اگر پدمنی والا واقعہ سچ ہوتا تو اسے صاف صاف لکھ دینے میں

---

۱۲۳ تاریخ مبارک شاہی، یحیٰی بن احمد بن عبد اللہ لسہر ندی، مرتبہ محمد ہدایت حسین، کلکتہ ۱۹۳۱ء ص ۷۷

۱۲۴ تاریخ سلاطین خلجی، ص ۱۲۹

۱۲۵ طبقات اکبری، خواجہ نظام الدین احمد، مرتبہ بی۔ڈے۔ جلد اوّل، کلکتہ ۱۹۲۷ء، ص ۱۵۷

۱۲۶ فتوح السلاطین، مولانا عصامی، مرتبہ ڈاکٹر مہدی حسین ۱۹۳۸ء، آگرہ، ص ۲۲۹

۱۲۷ خزائن الفتوح، امیر خسرو، مرتبہ محمد حبیب، ص ۴۹ (انگریزی)

تاریخ فیروز شاہی کے مصنف کو کیا تامّل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس حقیقت میں شک و شبہ کی گنجایش نہیں کہ پدماوت کے قصّے کا کوئی تعلق علاء الدین خلجی سے نہیں۔ اس کے ثبوت میں چند دلائل اور بھی ہیں :

(الف) جائسی کا بیان ہے کہ علاء الدین اور رتن سین میں متواتر آٹھ سال تک جنگ ہوتی رہی۔ اس کے برعکس خزائن الفتوح اور تاریخ فیروز شاہی متفق ہیں کہ علاء الدین خلجی نے چتوڑ کو ایک ہی حملے میں فتح کر لیا۔(۱۲۸)

(ب) جائسی نے رتن سین کو چوہان بتایا ہے، جبکہ علاء الدین خلجی کے زمانے میں چتوڑ میں ششودھیا خاندان کی حکومت تھی۔(۱۲۹)

(ج) اس زمانے میں لنکا کا راجا پراکرما بھو چہارم تھا۔ لیکن جائسی لنکا کے معاصر بادشاہ کا نام گووردھن بتاتا ہے۔(۱۳۰)

(د) کھمان راسا کی لوک روایت میں علاء الدین خلجی کے ہم عصر چتوڑ کے راجا کا نام رتن سین نہیں، بلکہ 'لکھم سی' اور اس کے چچا کا نام "بھیم سی" آیا ہے۔(۱۳۱)

ان تمام تاریخی شواہد کی روشنی میں پدمنی کے واقعے کو سلطان علاء الدین خلجی سے منسوب کرنا غلط ثابت ہوتا ہے۔ لیکن یہ مسئلہ مزید دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ فارسی کی ایک مشہور و معتبر تاریخ میں پدمنی کا واقعہ علاء الدین خلجی کے ضمن میں اسی طرح بیان کیا ہے، جیسے اسے جائسی نے لکھا ہے۔ یہ تاریخ فرشتہ ہے، اس سلسلے میں فرشتہ کے الفاظ غور طلب ہیں:

"در خلالِ ایں احوال راجہ رتن سین راجۂ قلعۂ چتوڑ کہ تا آنوقت در

---

۱۲۸ خزائن، ص ۴۹

۱۲۹ تاریخ سلاطین خلجی، ص ۱۳۹

۱۳۰ ایضاً

۱۳۱ افسانہ پدمنی، محمد احتشام الدین دہلوی، ص ۱۴۶

حبس بود، بروش غیر مقرر، نجات یافت و شرح آں چنیں ست کہ پس از مدتے کہ راجہ در قید بود، بسمع پادشاہ رسانیدند، کہ درمیان زنانِ راجہ چتوڑ زنے ست، پدمنی نام، سہی قد، سیہ چشم، ماہ سیما و بجمیع صفاتِ محبوبی متصف۔ پادشاہ بوے پیغام داد کہ خلاصی تو، منحصر در احضارِ آں جمیلہ است۔ رائے قبول نمودہ۔ کسان بطلب اہل و عیال خود، کہ بکوہستاناتِ محکم پناہ بردہ بودند، فرستاد تاازاں میاں مقصود پادشاہ را حاصل نماید، اما راجپوتان خویش راجہ، ازاں پیغام دلگیر گشتہ، سرزنش بسیار کردند، ...... دختر رائے کہ بفہم و عقل مشہور خویش و قبیلہ خود بود،...... گفت، تدبیرے بخاطرم رسیدہ، کہ ہم پدر زندہ ماند و ہم بے ناموسی نرسد۔ و آں اینست کہ پالکی بسیار پراز مردمانِ کار، باجماعتے از پیادہ وسوار روانۂ دہلی کنید و آوازہ افکنید کہ حسب الحکم پادشاہ، زنان راجہ متوجہ حضورند و چوں بحوالیِ شہر رسند، وقت شب بہ معمورہ درآمدہ، راہِ حبس خانۂ راجہ را پیش گیرندو بعد ازانکہ نزدیک آں رسند، جملہ راجپوتاں، تیغہا علم کردہ، بدرونِ وثاق درآیند، وسرِ سرکشانے، کہ قدم ممانعت پیش گزارند، جدا کردہ پدرم بر اسپ باد رفتار سوار سازند و برق ساں راہِ ملکِ خود پیش گیرند۔ اہل رائے آں رائے را پسندیدہ بداں عمل نمودند، و جماعتے از فدائیاں در پالکیہا نشستہ روانۂ دہلی شدند۔ وقتیکہ پاسے از شب گزشتہ بود، بہ شہر درآمدند و آوازہ انداختند، کہ پدمنی را با سائر متعلقانِ رائے آوردیم۔ چوں بوثاق نزدیک شدند، یک بار راجپوتان شمشیر ہا کشیدہ از پالکیہا بیرون آمدہ دویدند، و بہ قتلِ محافظاں اقدام نمودہ، زنجیرِ رائے بشکستندو اُو را سوار کردہ ہم چو مرغے کہ از قفس بجہد از شہر بیروں شدند، و بہ جماعتے از راجپوتان کہ مولود بودند، پیوستہ راہ ولایت خود پیش گرفتند۔ و دراثنائے راہ سوارانِ پادشاہ کہ تعاقب کردہ بودند، در چند موضع بایشاں رسیدہ تلاشہا کردند، و جمعے کثیر از راجپوتان بقتل آوردند۔ لیکن رائے بہر عنوان کہ توانست، افتاں و خیزاں بمشقت بسیار خود رابکوہستانیکہ اہل و عیال اور درانجا بودند، رسانیدو

بیمنِ دولتِ تدبیرِ دُخترِ خوب سیرت از چنگ عقوبتِ پادشاہ نجات یافتہ"۔[۱۳۲]

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ پدمنی کے حصول اور راجا کی رہائی کے بارے میں فرشتہ کا بیان جائسی سے بہت ملتا جلتا ہے لیکن متعدد مستند اور معاصر تاریخوں کی خاموشی کے پیشِ نظر فرشتہ کے بیان کو صحیح تسلیم کرلینا تاریخی احتیاط کے خلاف ہے۔ علاء الدین خلجی نے ۷۰۳ھ میں چتوڑ فتح کیا۔ اس کے ۲۴۴ برس بعد یعنی ۹۴۷ھ میں جائسی نے پدماوت اور ۳۱۲ برس بعد یعنی ۱۰۱۵ھ میں فرشتہ نے اپنی تاریخ لکھی۔ حیرت ہے کہ تین سو برس تک کسی دوسرے مؤرخ یا مصنف نے اس واقعے کا کوئی ذکر نہ کیا۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ اس واقعے سے متعلق خود فرشتہ کا ماخذ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جائسی کی مثنوی تصنیف ہوتے ہی بہت مقبول و معروف ہوئی اور ہر خاص و عام کی زبان پر اس کی کہانی چڑھ گئی، چونکہ اس میں شجاعت، حسن، دلیری اور مردانگی کے عناصر کی فراوانی تھی، راجپوتوں نے اسے اپنی قومی تاریخ کا واقعہ سمجھا اور عام طور پر اسے سلطان علاء الدین خلجی سے منسوب کیا جانے لگا۔ فرشتہ کے زمانے میں یہ کہانی امر واقعہ سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ اس نے بھی اسے صحیح تسلیم کیا اور اپنی تاریخ میں اسے سلطان علاء الدین خلجی کے حالات میں درج کردیا۔ جیمس ٹاڈ نے بھی پدمنی کے واقعے کا ذکر کھمان راسو کو بنیاد بنا کر کیا ہے۔[۱۳۳] کھمان راسو راجپوتوں کا قومی گاتھا ہے۔ گمان غالب ہے کہ خود کھمان راسو میں پدمنی کا ذکر جائسی کی پدماوت کی شہرت کے بعد کیا جانے لگا۔ جائسی کی مثنوی شیر شاہ سوری کے زمانے میں مکمل ہوئی تھی، جبکہ کھمان راسو اکبر اعظم کے آخری زمانے میں مدوّن ہوا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر فرشتہ، جائسی کے روایتی قصّے سے متاثر ہوکر اسے اپنی تاریخ میں لکھ گیا ہے اور کھمان راسو میں بھی پدمنی کے

---

۱۳۲ تاریخ فرشتہ (جلد اوّل) مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ ۱۸۷۴ء، ص ۱۱۵

۱۳۳ Annals and Antiquities of Rajasthan, Tod (James) ۱۹۱۴ء، جلد اوّل، ص ۲۱۳

حوالے جائسی کی مثنوی کا نتیجہ ہیں تو کیا جائسی کی کہانی کا واقعاتی حصہ محض اس کے تخیل کی پرواز ہے یا اس کا کوئی تعلق اپنے زمانے کے محاربات سے بھی ہے۔

جائسی کے زمانے کی سیاست کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پدمنی جیسی حسین عورت کے لیے کسی بادشاہ کا جنگ پر آمادہ ہونا کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ اس بات کی قطعی تردید ہو جانے کے بعد کہ علاء الدین خلجی کے حملۂ چتوڑ میں کسی ایسی چیز کو دخل نہیں تھا، گمان گزرتا ہے کہ پدمنی کے لیے چتوڑ پر حملہ کرنے والا علاء الدین خلجی نہیں بلکہ کوئی دوسرا خلجی حکمراں ہو اور اس کے نام میں جائسی اور جائسی سے متاثر دوسرے راویوں کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ محمد احتشام الدین[۱۳۴] کا یہ خیال صحیح ہے کہ پدماوت کے قصے میں کوئی صداقت ہے تو یہ واقعہ سلطان غیاث الدین خلجی سے متعلق ہو سکتا ہے۔ غیاث الدین خلجی (علاء الدین کے دو سو برس بعد) ملک مالوہ میں گزرا ہے۔ اس کے حدود سلطنت چتوڑ کی ریاست سے ملے ہوئے تھے اور اکثر باہم لڑائی رہتی تھی۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ سلطان کے دربار میں کوئی نامشروع بات نہیں ہونے پاتی تھی۔ لیکن اسے خوبصورت عورتوں کا بے حد شوق تھا۔ ہزارہا حسین عورتیں اس کی خدمت میں حاضر رہتیں۔ پھر بھی سلطان کو حسرت تھی کہ جیسے حُسن اور صورت کو اس کا جی چاہتا تھا، وہ میسر نہیں۔ آخر اس کے ایک مصاحب نے اپنی کوششوں سے سلطان کی یہ خواہش پوری کی۔

اس میلان کے سلطان سے بعید نہیں کہ اس نے حسین ترین عورت (پدمنی) کی جستجو میں چتوڑ پر دھاوا بول دیا ہو۔ ساتھ ہی وہ شرع کا بھی بہت پابند تھا اور شرع کی رو سے چونکہ غیر کی زوجہ پر نظر ڈالنا حرام ہے، اس لیے شرع کی گرفت سے بچنے کے لیے غیاث الدین خلجی نے چتوڑ کی حسین ترین رانی کو جس کا نام اس کے حسن کے سبب سے پدمنی یا پدماوت رہا ہو، آئینے میں دیکھنے کی ترکیب نکالی ہو اور اس کی حسن پرستی کا یہ واقعہ عوام کی زبان پر چڑھ کر

---

۱۳۴ افسانہ پدمنی، محمد احتشام الدین، دہلی ۱۹۳۹ء، ص ۱۳۱

دور و نزدیک مشہور ہو گیا ہو۔

غیاث الدین خلجی سلطان مالوہ اور خاندان چتوڑ کے مابین جنگ کی تصدیق اکلنگاجی کے ایک ہندی کتبے سے بھی ہوتی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ۱۴۸۸ء میں مانڈو کے سلطان غیاث الدین خلجی نے "بادل گورا" سے شکست کھائی۔ یہ "بادل گورا" نامی راجپوت سردار وہی ہے جس کا ذکر مثنوی پدماوت میں جائسی نے بار بار کیا ہے۔ پدمنی کے واقعے کو غیاث الدین خلجی سے منسوب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ رتن سین نام کا کوئی راجا علاء الدین خلجی کے زمانے میں چتوڑ کا حکمراں نہیں تھا۔ لیکن راناسانگا کا فرزند رتن سین تقریباً غیاث الدین خلجی ہی کے زمانے میں چتوڑ کا راجا ہو گزرا ہے اور اغلب ہے کہ اسی رتن سین سے غیاث الدین خلجی کے معرکے رہے ہوں۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ غیاث الدین خلجی ہی کی حسن پرستی کے واقعے پر جائسی نے اپنی مثنوی کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ واقعہ جائسی کے اپنے زمانے سے قریب تھا اور اس سے جائسی کا متاثر ہونا بعید از قیاس نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قصّے کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے جائسی نے اپنے زمانے کے دوسرے تاریخی واقعات سے بھی اثر لیا ہو۔ مثلاً ڈولیوں اور پالکیوں میں مسلح سپاہیوں کا جانا اور گوہر مقصود حاصل کرنا خود جائسی کی زندگی کا واقعہ ہے۔ شیر شاہ نے بنگالہ کی مہم کو جاتے ہوئے اپنے اہل و عیال اور خزانے کو رہتاس کے راجا کے پاس چھوڑنے کی اجازت چاہی تھی۔ لیکن دراصل پالکیوں میں سپاہی بھیج کر قلعہ فتح کر لیا تھا۔ قصۂ پدماوت کی تیسری اہم کڑی یعنی جوہر کی رسم بھی غیر تاریخی بات نہیں۔ خود جائسی کے زمانے میں جب ۹۳۸ھ میں سلطان بہادر گجراتی نے رائے سین کے راجا سلہدی پر فوج کشی کی تو اس کی یگانۂ روزگار رانی درگاوتی اور سینکڑوں دوسری رانیوں نے آگ میں کود کر جوہر کرایا۔ عین ممکن ہے کہ جائسی نے اپنے زمانے کے ان واقعات کو آب و تاب دے کر ایک مربوط مثنوی کے پیکر میں ڈھال دیا ہو۔

بہر حال جائسی کی پدماوت اس قدر مقبول و معروف ہوئی کہ اس کا قصہ مختلف زبانوں میں ترجمہ و تلخیص کے ذریعے پھیل گیا۔

اس کا اوّلین انگریزی ترجمہ جی۔اے گریرسن اور سدھاکر دویدی نے مل کر کیا تھا جو کلکتہ سے ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔(۱۳۵) انگریزی کا ایک اور ترجمہ فیض آباد کے انگریز کمشنر اے۔سی۔شیرف نے ۱۹۴۰ء میں کیا۔(۱۳۶) پشتو زبان میں پدماوت کو ابراہیم نے منتقل کیا۔(۱۳۷) پشتو زبان کا دوسرا ترجمہ ملا گل احمد پچاغی کا ہے۔ یہ "قصہ شہزادہ رت و پدمن افغانی" کے نام سے دہلی سے ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا۔(۱۳۸) بنگالی میں اس قصے کا ترجمہ اراکان کے وزیر مگن ٹھاکر نے کسی شخص "الواج لو" سے ۱۶۵۹ء میں کرایا۔(۱۳۹)

فارسی اور اردو میں بھی پدماوت سے متعلق کئی نسخے ملتے ہیں۔ چونکہ بعض اردو مثنوی نگاروں نے قصہ اصل اودھی سے نہیں، بلکہ فارسی مثنویوں سے اخذ کیا ہے، اس لیے فارسی نسخوں کے نام سامنے رکھنا بھی ضروری ہیں۔

فارسی نسخے

۱۔ فارسی میں پدماوت کو سب سے پہلے عبدالشکور بزمی نے بعدِ جہانگیر ۱۶۱۸ء (۱۰۲۸ھ) میں لکھا۔ یہ مثنوی انڈیا آفس لندن میں موجود ہے۔(۱۴۰) (رت پدم)

۲۔ عاقل خاں رازی نے ۱۶۵۸ء (۱۰۶۹ھ) میں "شمع و پروانہ" کے

---

۱۳۵ ہندی، ص ۱۸۳

۱۳۶ ڈاکٹر گیان چند جین، رسالہ اردو، اگست ۱۹۵۰ء

۱۳۷ ایتھے ۱۵۸۲

۱۳۸ پشتو کتب برٹش کالم ۲۰

۱۳۹ ہندی ساہتیہ کا اتہاس، رام چندر شکل، ص ۹۲

۱۴۰ ایتھے نمبر ۱۵۸۳ نیز اشپرانگر ص ۱۲۷۶، آصفیہ ج ۲، ص ۱۴۷۸

نام سے یہی قصہ پھر لکھا۔ اس کا مخطوطہ برٹش میوزیم لندن اور انڈیا آفس میں محفوظ ہے۔(١٤١)

٣۔ مثنوی ''حسن و عشق'' از حسام الدین، ١٦٦٠ء (١٠٧١ھ) نسخہ برلن ص ٩٢٩۔(١٤٢)

٤۔ مثنوی پدماوت، از حسن غازانہ نسخہ برلن نمبر ٩١١، ص۔(١٤٣)

٥۔ لچھمی رام متوطن ابراہیم آباد نے عاقل خاں رازی کی مثنوی ''شمع و پروانہ'' کو فارسی نثر میں ''فرح بخش'' کے نام سے منتقل کیا۔ نسخہ برٹش میوزیم، مکتوبہ ١٢١٧ھ (١٤٤)

٦۔ ''فرح بخش'' کا فارسی خلاصہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے کیا۔ اس کا مخطوطہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔(١٤٥)

٧۔ ''قصصِ پدماوت'' کے نام سے حسین غزنوی نے فرخ سیر کے زمانے میں لکھا۔(١٤٦)

٨۔ رائے گوبند منشی نے پدماوت کو فارسی میں لکھ کر ''تحفۃ القلوب'' نام رکھا۔ تصنیف ١٦٥٢ء۔ اس کا ایک ناقص مخطوطہ ہارڈنگ لائبریری، دہلی میں محفوظ ہے۔(١٤٧)

٩۔ دکھنی شاعر سید محمد عشرتی نے جائسی کی پدماوت کو فارسی میں ملخص کیا۔ اس کا سنہ تصنیف ''گلے ختمی'' ١٦٩٨ء (١١١٠ھ) ہے۔(١٤٨)

---

١٤١ ایتھے ١٦٣٤ اور ١٦٣٥، نیز اشپرانگر، ص ٥٤٣، سالار جنگ ٦١٧ فارسی نظم

١٤٢ یورپ میں دکنی مخطوطات، ص ١١٧

١٤٣ ایضاً

١٤٤ ریو، برٹش، نمبر اڈیشنل ٨٩١٨، ص ٦٨٧

١٤٥ ایضاً، نمبر ١٩٤١

١٤٦ اسٹوارٹ (فارسی منظومات) ص ٤٣

١٤٧ ہارڈنگ لائبریری، دہلی۔ فارسی مخطوطات، نمبر ٣٨

١٤٨ شمس اللہ قادری، اردوے قدیم، ص ٩٨

۱۰۔ مثنوی بوستانِ سخن (قلمی) امامی، سنہ تصنیف ۱۲۲۹ھ، تعداد اشعار ۳۲۹۳ نسخہ نیشنل میوزیم نئی دہلی۔[۱۴۹]

۱۱۔ ہنگامۂ عشق (قلمی) منشی آنند رام مخلص نے پدماوت کا قصہ ۱۱۵۲ھ میں فارسی نثر میں قلم بند کیا۔ مخلص نے اس قصے کے فقط پہلے حصے کو لیا ہے اور جنگوں وغیرہ کے نیم تاریخی واقعات حذف کردیے ہیں۔ ان کے ہاں قصے کی روایت بھی جائسی سے قدرے مختلف ہے۔ مرکزی کرداروں کے نام بھی تبدیل کردیے گئے ہیں۔ مثلاً ہیروئن کا نام چندر پربھا اور ہیرو کا کنور سندر سین بتایا گیا ہے۔ یہ قصہ دونوں کی شادی پر ختم ہو جاتا ہے۔ مخلص نے ۱۱۵۵ھ میں اس قصے پر نظر ثانی کی۔ اس کا مخطوطہ نذیریہ لائبریری دہلی میں محفوظ ہے۔[۱۵۰]

۱۲۔ "قصہ پدمنی وغیرہ" قلمی (مثنوی فارسی) مجہول المصنف۔ نسخہ کتب خانہ ٹیپو سلطان[۱۵۱]

۱۳۔ قصہ رتن و پدم قلمی (مثنوی فارسی) مجہول المصنف، نسخہ کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد، دکن[۱۵۲]

اردو نسخے

۱۔ اردو نثر میں پدماوت کو سب سے پہلے مرزا عنایت علی بیگ عنایت لکھنوی نے لکھا۔ اس کا نام "پدماوت بھاکا مترجم" ہے۔ یہ ترجمہ مطبع اعظمی کانپور سے ۱۸۹۸ء (۱۳۱۶ھ) میں طبع ہوا۔ جائسی کی مثنوی کا متن اردو رسم الخط میں درج کیا گیا اور اس کے نیچے اشعار کا اردو ترجمہ ساتھ ساتھ دے دیا ہے۔[۱۵۳]

---

۱۴۹ نیشنل میوزیم، نئی دہلی۔ ذخیرہ ٹونک ۳۰۸۵

۱۵۰ نذیریہ لائبریری، دہلی۔ فارسی مخطوطات نمبر ۱۴۷

۱۵۱ اسٹوارٹ فارسی منظومات، ص ۴۷

۱۵۲ آصفیہ، جلد ۲، ص ۱۴۸۴، نمبر ۳۹

۱۵۳ پدماوت بھاکا مترجم، عنایت علی بیگ، عنایت لکھنوی، مطبع اعظمی کان پور، ۱۸۹۸ء

۲۔ "پدماوت بھاکا مترجم" از احمد علی رسا۔ ہندی متن اردو رسم الخط میں، مع اردو ترجمہ و اردو حواشی، کانپور، ۱۸۹۹ء، صفحات ۲۳۶ (۱۵۴)

۳۔ "پدماوت" (یعنی ایک سچی داستان) از سالگ رام۔ ساکن کپور تھلہ، لاہور، ۱۸۹۸ء صفحات ۱۷۲ (۱۵۵)

۴۔ پدماوت بھاکا مترجم از پنڈت بھگوتی پرساد پانڈے انوج، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ص ۳۳۶ (۱۵۶)

۵۔ میر عبدالجلیل بلگرامی نے ملی جلی "بھاکا اور اُردو" زبان میں پدماوت لکھی۔ اس کا ذکر ضیاء الدین خاں نے پدماوت کے فارسی خلاصے میں کیا ہے۔ (۱۵۷)

۶۔ پدومات اردو (منظوم ڈراما) از نوشیرواں جی مہربان جی آرام، بمبئی (۱۵۸)

۷۔ محبت کی پتلی یعنی رانی پدماوتی (اردو نثر) از محمد اکبر علی خاں، افسوں شاہجہانپوری۔ اس میں پدمنی اور رتن سین کے عشق کا قصہ ناول کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ (۱۵۹)

۸۔ مثنوی پدم سماج اُردو (قصہ پدماوت) از بہاری لال بیدل، صفحات ۱۳۰، مطبوعہ بجنور، ۱۸۸۵ء (۱۶۰)

۹۔ پدماوت، بزبان ہریانہ (گیتوں اور دوہوں میں) از پنڈت سروپ چند دسوڑ کھیڑی۔ اردو رسم الخط میں یہ کتاب شمبھو دیال دینا ناتھ نے دریبہ کلاں

---

۱۵۴ بلوم ہارٹ برٹش ضمیمہ، ص ۲۶۲

۱۵۵ بلوم ہارٹ برٹش ضمیمہ، ص ۴۲۲

۱۵۶ کتب خانہ دانش گاہ دہلی

۱۵۷ ریو ۱۰۳۶ب

۱۵۸ اردو ڈراما، عشرت رحمانی، ص ۲۰۴

۱۵۹ ابوالعلائی پریس، آگرہ، کل صفحات ۱۱۲

۱۶۰ انڈیا مطبوعات

دہلی سے اواخر انیسویں صدی میں شائع کی۔

۱۰۔ ہیرا من توتا پدماوت نار، بزبان ہریانہ (گیتوں اور دوہوں میں) مصنفہ سی ایچ حکم چند۔ یہ کتاب بھی اردو رسم الخط میں دہلی سے شائع ہوئی۔

اردو نظم

اردو نظم میں پدماوت کی چھ روایتوں کا علم ہوا ہے۔ ان میں سے تین دکھنی شاعروں اور تین شمالی ہند کے شاعروں سے منسوب ہیں:

۱۔ قصۂ پدماوت۔ غلام علی دکھنی (قلمی) نسخہ انڈیا آفس،[۱۶۱] اوراق ۲۱، سنہ تصنیف ۱۶۸۰ء (۱۰۹۱ھ) یہ نسخہ مکمل نہیں ہے۔

۲۔ رتن پدم۔ سید محمد فیاض "ولی" ویلوری۔ یہ مثنوی بہ قول اشپرانگر شاہان اودھ کے کتب خانے میں تھی۔ تعداد ابیات تقریباً چار ہزار، صفحات چار سو۔[۱۶۲]

۳۔ دیپک پتنگ۔ سید محمد خاں عشرتی۔ مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد، صفحات ۲۱۶۔ سنہ تصنیف ۱۶۹۵ء (۱۱۰۷ھ) سنہ کتابت ۱۱۸۹ھ[۱۶۳]

۴۔ مثنوی شمع و پروانہ۔ ضیاء الدین عبرت و میر غلام علی عشرت۔ سنہ تصنیف ۱۷۹۶ء (۱۲۱۱ھ)[۱۶۴]

۵۔ پدماوت۔ محمد قاسم علی بریلوی، سنہ تصنیف ۱۸۶۹ء، ص ۸۴[۱۶۵]

۶۔ سانگیت پدماوت، از سکھ داس خلف نرائن داس، چندوسی، ۱۸۹۰ء صفحات ۱۰۸۔[۱۶۶] یہ مقامی روایتوں پر مشتمل ایک نظم ہے جس میں جگہ جگہ

---

۱۶۱ بلوم ہارٹ انڈیا نمبر ۷۳/۳

۱۶۲ اشپرانگر نمبر ۷۲۰

۱۶۳ سالار جنگ، ص ۶۱۹

۱۶۴ مخطوطہ پدماوت، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، نشان ۷۵/۶۳۰

۱۶۵ پدماوت، محمد قاسم علی بریلوی، مطبع نول کشور، ۱۸۷۳ء، کان پور

۱۶۶ بلوم ہارٹ برٹش ضمیمہ، ص ۴۴۳

دوہے بھی آگئے ہیں۔ غالبًا یہ گانے کے لیے لکھی گئی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔

۷۔ مثنوی "بت خانہ خلیل" از خلیل حسن خلیل لکھنوی۔ یہ ملک محمد جائسی کی پدماوت کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ خلیل بڑے بھائی جلیل کے۔ امیر مینائی سے شرف تلمذ تھا۔ راجا بلرام پور کے ملازم ہوئے اور تادم حیات انھیں سے وابستہ رہے۔ ریاست ہی کی طرف سے ان کی تصانیف "مرقع بلرام پور" اور "پنجہ نگارین" زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ "پنجہ نگارین" ان کی پانچ مثنویوں کے مجموعے کا نام ہے، جن میں سے ایک پدماوت کا یہی اردو ترجمہ مثنوی "بت خانہ خلیل" ہے۔(۱۶۷)

مثنوی پدماوت، غلام علی دکھنی

اس مثنوی کا واحد نسخہ انڈیا آفس میں محفوظ ہے۔(۱۶۸) یہ ناقص الآخر ہے اور اس نامکمل نسخے کے سوائے اس مثنوی کا کوئی اور نسخہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔

غلام علی کے بارے میں تذکرے خاموش ہیں۔ مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام علی بلند پایہ شاعر تو نہیں تھا، تاہم اس نے اپنی مثنوی کو دلچسپ بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ یہ مثنوی سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے زمانے میں نظم کی گئی۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۶۸۰ء (۱۰۹۱ھ) ہے۔

مثنوی کی ابتدا حسبِ رواج حمد و نعت و منقبت سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد بادشاہ کی مدح ہے اور عشق کی تعریف سے قصّے کا آغاز ہوتا ہے۔ غلام علی نے اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا۔ نصیر الدین ہاشمی نے "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں اس مثنوی کا مفصل ذکر کیا ہے۔ عبدالشکور بزمی کی فارسی مثنوی

---

۱۶۷ ادبی دنیا، ستمبر ۱۹۳۹ء اور جولائی ۱۹۴۶ء

۱۶۸ بلوم ہارٹ انڈیا نمبر ۷۳/۳

سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ غلام علی کا قصہ بزمی سے ماخوذ ہے۔ یہ مثنوی ناقص الآخر ہے، شادی کے بعد جب راجا رتن سین پدمنی کو ساتھ لیے چتوڑ واپس روانہ ہوتا ہے تو راہ میں ان کا جہاز طوفان میں گھر کر پاش پاش ہوجاتا ہے اور یہ لوگ ایک راکشس کے نرغے میں پھنس جاتے ہیں۔ اس کے بعد مثنوی کے اوراق غائب ہیں۔ خاتمہ ان اشعار پر ہے:

میں راکشس، توں انسان میرا خوراک　　لے آیا ہوں یاں تج کوں کرنے ہلاک
دیوانا ہے توں جو منج لب آیا　　میری بات سن سات توں آیا

غلام علی کا اسلوب بیان سادہ اور آسان ہے۔ گولکنڈہ کی مثنویوں میں یہ مثنوی تاریخی مقام رکھتی ہے۔[۱۶۹]

مثنوی رتن پدم، ولی ویلوری

پدماوت کا دوسرا منظوم ترجمہ ولی ویلوری کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ بظاہر یہ مثنوی نایاب ہے اور اس کا کوئی مخطوطہ اس وقت یورپ یا ہندستان میں نہیں۔ اس کا ذکر صرف اشپرانگر[۱۷۰] اور اسٹوارٹ[۱۷۱] نے اپنی اپنی فہرستوں میں کیا ہے۔ "قصہ پدماوت دکھنی" سے متعلق اسٹوارٹ نے مصنف کے نام کی صراحت نہیں کی اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ یہ قصہ نثر میں لکھا گیا یا مثنوی میں تھا۔[۱۷۲]

ولی ویلوری کا پورام نام سید ولی فیاض اور ولی تخلص تھا۔[۱۷۳] وہ ویلور علاقہ مدراس (موجودہ ٹمل ناڈو) کا باشندہ تھا اور عالمگیر کے زمانے میں تھا۔ وفات

۱۶۹　یورپ میں دکھنی مخطوطات ۱۹۳۲ء، ص ۱۱۷ تا ۱۴۰

۱۷۰　اشپرانگر، ص ۶۴۱، نمبر ۲۰۷

۱۷۱　فہرست کتب خانہ ٹیپو سلطان، اسٹوارٹ، ص ۱۸۰

۱۷۲　اسٹوارٹ، ہندی و دکھنی مخطوطات، ص ۱۸۰، نمبر ۱۱

۱۷۳　شمس اللہ قادری، اردوے قدیم ۱۹۲۵ء، ص ۱۰۰

قبل ۱۱۵۰ھ۔[۱۷۴] رتن پدم کے علاوہ ولی نے دو اور مثنویاں روضۃ الشہدا اور دعاے فاطمہ بھی لکھیں۔[۱۷۵]

ولی ویلوری نے مثنوی پدماوت کے شروع میں اپنے حالات بیان کیے ہیں۔ پہلے یہ سات گڑھ میں حراست خاں کی رفاقت میں رہا، اس کے بعد کڑپہ چلا آیا اور یہاں کے صوبہ دار نواب عبدالمجید خاں کا ملازم ہوگیا، جس نے اسے سدھوٹ میں تعینات کردیا۔ قصہّ رتن و پدم بمقام سدھوٹ ہی لکھا گیا۔ اشپرانگر نے اس مثنوی کا نام صرف "رتن" بتایا ہے[۱۷۶] جو غلط ہے۔

مثنوی کا پہلا شعر ہے:

خدایا تو ہے پاک پروردگار نرنکار داتار و اچھے اپار

تخلص:

ولی تیرے کرم کی ہے مجھے آس نہ کر اس آس سوں ہرگز تو نراس

اشپرانگر کا بیان ہے کہ یہ مثنوی ذخیرۂ توپ خانہ میں تھی، کل صفحات چار سو اور ہر صفحے پر گیارہ ابیات تھے۔[۱۷۷]

مثنوی دیپک پتنگ، عشرتی

عشرتی کی اس مثنوی کے نسخے جنوبی ہند کے کتب خانوں میں عام پائے جاتے ہیں۔ اردوے قدیم اور اردو شہ پارے میں اس مثنوی کا ذکر ملتا ہے۔ اس مثنوی کا ایک مستند نسخہ، عشرتی کے پوتے، زین العابدین کے ہاتھ کا لکھا ہوا کتب

---

۱۷۴ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو (بار سوم) ص ۲۲۸

۱۷۵ شمس اللہ قادری، اردوے قدیم، ص ۱۰۲

۱۷۶ اشپرانگر، ص ۶۴۱

۱۷۷ اشپرانگر، ص ۶۲۰

خانہ سالار جنگ حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ اس کا سنہ کتابت ۱۱۸۹ھ ہے۔ یہ مثنوی ۱۶۹۵ء (۱۱۰۷ھ) میں تصنیف ہوئی۔[۱۷۸]

عشرتی کا پورا نام سید محمد اور والد کا نام سید یوسف حسینی تھا۔ حیدر آباد کے رہنے والے تھے۔ اورنگ زیب کے عہد میں گزرے ہیں۔[۱۷۹] مولفِ "دکن میں اردو" نے دیپک پتنگ کے علاوہ ان کی دو اور مثنویوں؛ چت لگن اور نیہ درپن کا بھی ذکر کیا ہے۔[۱۸۰] عشرتی نے جائسی کی پدومات کو فارسی میں ملخص بھی کیا تھا، جس کا ذکر فارسی نسخوں کے ذیل میں اوپر کیا جاچکا ہے۔

مثنوی دیپک پتنگ حمد و نعت و منقبت سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد عشرتی نے اپنے دوست خواجہ علی کا تذکرہ کیا ہے، جس کے بعد سے قصے کا آغاز ہے۔ عشرتی نے پدماوت کا جو قصہ بیان کیا ہے، وہ عام قصوں سے قدرے مختلف ہے۔ یہاں عشق کی ابتدا پدماوتی کی طرف سے ہوتی ہے اور وہ رتن کی تلاش میں مصیبتیں جھیلتی ہے۔ آخر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرتی ہے۔ مثنوی کا آخری ورق نہیں ہے۔

آغاز

الٰہی توں سرجیا زمین ہور زماں　　دیپایا سورج جوت سوں آسماں
فلک کوں بنایا توں گردش کے چال　　سیہ تس میں لایا چندر کا ہلال

خاتمہ

بھنود میں یوں دیکھا سو وہ سب نیں　　سٹیا بھیگی خشک روٹی کیتس[۱۸۱]

۱۷۸　سالار جنگ، ص ۶۱۹

۱۷۹　اردوے قدیم، ص ۹۸

۱۸۰　دکن میں اردو، ص ۲۳۲، یہ غلط ہے کہ نیہ درپن ہنر کی تصنیف ہے

۱۸۱　سالار جنگ، ص ۶۱۹

مثنوی شمع و پروانہ

پدماوت کا یہ چوتھا منظوم ترجمہ دو مصنفوں کا مرہون منت ہے۔ ضیاء الدین عبرت نے رامپور کے سپہ سالار نبو خاں کی فرمایش پر اسے نظم کرنا شروع کیا تھا۔ ضیاء الدین خاں عبرت، محبت خاں محبت بن حافظ رحمت خاں، والیِ روہیلکھنڈ کے شاگرد تھے۔ قصہ ابھی ایک تہائی کے قریب ہی نظم ہوا تھا کہ عبرت نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اسے عبرت کے انتقال کے تقریباً سات آٹھ برس بعد غلام علی عشرت بریلوی نے قدرت اللہ شوق کی فرمائش پر ۱۲۱۱ھ میں پورا کیا۔(۱۸۲) عشرت میر معظم علی کے بیٹے تھے۔ مشورۂ سخن مرزا علی لطف سے تھا اور بریلی کے رہنے والے تھے۔(۱۸۳)

اس مثنوی کے قلمی نسخے عام طور پر دستیاب ہوتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ کا نسخہ ناقص الآخر ہے۔ اس کا مکمل نسخہ لٹن لائبریری کے ذخیرہ سر شاہ سلیمان میں موجود ہے۔(۱۸۴) یہ مثنوی پہلے پہل لکھنؤ سے ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد سے اس کے کئی ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔

مثنوی کی ابتدا ضیاء الدین عبرت نے حسب دستور، حمد، نعت، مناجات اور پیر طریقت کی تعریف سے کی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے چند اشعار اپنے استاد محبت خاں محبت کی مدح میں لکھے ہیں۔ آگے کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ عبرت جب ایک ہندو راجا رانی کا قصہ لکھنے لگے تو بعض احباب نے اعتراض کیا۔ عبرت انھیں جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ عشق آزاد ہے گا کفر و دیں سے　　نہیں کچھ کام اسے شک و یقیں سے
نہیں کچھ مانتا عشقِ ستم گار　　کہ کیا تسبیح ہے اور کیا ہے زنّار

۱۸۲　مثنوی شمع و پروانہ (قلمی) انجمن ترقی اردو علی گڑھ، نشان ۷۵/۶۳۰
۱۸۳　گلشن بے خار، ص ۱۳۵
۱۸۴　مثنوی شمع و پروانہ (قلمی) ذخیرہ سر شاہ سلیمان، علی گڑھ، ۵۰/۱۰۸

جہاں میں عشق کا جو رسم و دیں ہے معافِ حضرتِ شرعِ متیں ہے
کرے گا اعتراض اس میں جو بے جا جنابِ عشق کا مردود ہو گا(۱۸۵)

اس کے بعد ضیاء الدین عبرت معترضین کو لاجواب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرا وطن ہندستان ہے اور مجھے وطن سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہیں۔ جو بات اپنے وطن میں ہے، وہ دوسرے ملکوں میں کہاں؟ پھر کیوں اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسروں کے قصّے دوہراؤں؟ وطن کی روایتوں اور قصّوں سے منھ موڑنا وطنیّت کے تقاضے کے خلاف ہے:

ولیکن قصہ کہتا ہوں وطن کا کہ ہوں میں عندلیت اپنے چمن کا
سوادِ ہند کو اے مونس جاں! بناؤں سُرمۂ چشمِ صفا ہاں
کروں ہندوستاں کا عشق مرقوم مچے جس سے عرب کے ملک میں دھوم
ہے شعلہ عشقِ ہندی کا شرر ریز کہ ہے گا آفتاب اس کا بہت تیز
کہ سوزِ عشق ہندی تیز تر ہے عرب کے عشق سے خونریز تر ہے(۱۸۶)

مثنوی کے آغاز میں عبرت نے صراحت کر دی ہے کہ اس نے اپنی مثنوی کا قصہ عاقل خاں رازی کی پدماوت سے لیا ہے:

رقم جو ہے یہ مضموں شعلہ بنیاد مری روشن طبیعت کا ہے ایجاد
مگر مضمونِ عاقل خانِ رازی کہ اس نے داستاں یہ فارسی کی(۱۸۷)

عبرت نے قصّے کے عنوانات اشعار میں لکھے ہیں، یہ اشعار باہم مربوط ہیں۔ اگر انھیں ایک جگہ جوڑا جائے تو یہ مل کر قصیدہ بن جاتے ہیں۔ یہ قصیدہ ایک طرح سے خلاصہ ہے جس میں قصّے کا عطر پیش کر دیا گیا ہے۔

---

۱۸۵ مثنوی شمع و پروانہ (قلمی) ذخیرہ سر شاہ سلیمان، علی گڑھ

۱۸۶ ایضاً

۱۸۷ ایضاً

عبرت کا انداز بیان سادہ اور دل نشیں ہے۔ اشعار رواں دواں اور مترنم ہیں۔ قصہ کی دلچسپی ہر قدم پر قائم رہتی ہے۔ عبرت نے قصّے کو راجا رتن سین کے جوگی بن کر سنگل دیپ جانے اور توتے کی زبانی پدماوت کو پیغام بھجوانے تک نظم کیا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ اس حصّے سے نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رتن سین ایک راجا میں نے پایا ترى خاطر ہوں جوگی کر کے لایا
وہ شہزادہ ہے اب تیرا بھکاری ترے بن زندگی ہے اس کو بھاری
وہ اپنی سی نہایت کرچکا ہے تو کر آگے جو کچھ تیری رضا ہے
وہاں بیکس کی ناحق جان جاوے یہاں ناحق تو ہتیاری کہاوے
جو توتے سے سنی حیرت کی گفتار ہوئی وہ نازنیں اک نقشِ دیوار
جوانی کا جو عالم تھا پدم کا سرایت کرگیا قصہ یہ غم کا
لیا دل کا وہیں تھام اس نے مینا کہ راز عشق ہو جاوے نہ افشا
کہا توتے تری خاطر ہے منظور مرے اس راز کو رکھیو تو مستور
صنم کے پوجنے کے دن ہیں نزدیک کروں گی جاکے روشن جانِ تاریک
جو یوں جاؤں سمجھ اے نیک فرجام کہہ و مہتر میں ہو جاؤں گی بدنام(۱۸۸)

اس کے آگے کا قصہ غلام علی عشرت نے نظم کیا ہے اور پیوند اس خوبی سے لگایا ہے کہ معلوم نہیں ہوتا۔ پہلے حصّے کا زور قلم اور لطف بیان دوسرے حصے میں بھی قائم رکھا گیا ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ دو مصنفوں کی وجہ سے مثنوی کی روانی، دلچسپی اور صفائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خاتمے کے اشعار یہ ہیں:

غرض یہ فتح پاکر حسب دل خواہ علاء الدین نے لی چتوڑ کی راہ
نواحِ شہر میں داخل ہوا جب سنا یک بارگی وہ ماجرا سب

۱۸۸ ایضاً، ورق ۱۷

کہوں کیا میں کہ شہ یہ ماجرا سُن　　زبس تصویر آسا رہ گیا سُن
غرض خاک پدم سر پر اُڑا کے　　بصد افسوس و غم آنسو بہا کے
کیے اپنے پہ بس سر در گریباں　　چلا دہلی کی جانب زاروگریاں
سُنی تم نے عزیزو یہ کہانی　　کہ ہے اللہ باقی کلِّ فانی[۱۸۹]

مثنوی پدماوت، قاسم

محمد قاسم علی بریلوی کی پدماوت منظوم ۱۸۶۹ء میں تصنیف ہوئی اور ۱۸۷۳ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

محمد قاسم علی کا سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد قاسم علی ابن مولوی محمد قائم علی بن شیر علی بن مہر علی بن مولوی علی صادق۔[۱۹۰] یہ بدایوں کے باشندے تھے لیکن مثنوی کی تصنیف کے وقت بریلی کے محلّہ گڑھیا میں مقیم تھے۔[۱۹۱]

محمد قاسم علی عبرت اور عشرت کی مثنوی پدماوت سے باخبر تھے۔ چونکہ دونوں نے قصہ اصل اودھی زبان کے بجائے عاقل خاں رازی کی فارسی مثنوی سے اخذ کیا تھا۔ محمد قاسم علی ان کے بارے میں صحیح کہتے ہیں کہ یہ دونوں بھاکا کے مزاج داں نہیں تھے اور انھوں نے جائسی کی مثنوی کو تمام و کمال اُردو کا قالب نہیں پہنایا:

مذاقِ بھاکا لیکن تھا نہ پایا　　یہ شاہد گود میں ان کی نہ آیا
ولے تاہم لکھا ہے کر کرامت　　کہ قصہ لے لیا اکثر سلامت

عبرت و عشرت کی مثنوی ترجمہ در ترجمہ ہے۔ اس کے برعکس قاسم نے براہِ راست جائسی سے ترجمہ کیا ہے اور اپنی مثنوی میں یہ التزام رکھا ہے کہ

۱۸۹　ایضاً

۱۹۰　مثنوی پدماوت، قاسم علی بریلوی، مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۷۳ء

۱۹۱　ایضاً

جائسی کی پدماوت کا ترجمہ "بیت بہ بیت اور دہرہ بدہرہ دیسی اُردو زبان کیا جائے۔[۱۹۲] اس میں شک نہیں کہ محمد قاسم علی نے شعر کے مقابلے میں شعر اور بند کے مقابلے میں بند لکھا ہے اور معنی کے اعتبار سے یہ اُردو مثنوی جائسی کی اودھی مثنوی کا لفظی ترجمہ ہے۔ لیکن ترجمے کی پابندی اور قیود کے باعث مثنوی میں اصل اور نقل کا فرق پیدا ہوگیا ہے۔ قاسم کی مثنوی میں تسلسل تو ہے لیکن جوش، روانی اور بے ساختگی نہیں۔ ہر جگہ آورد کا رنگ غالب ہے۔ کہیں کہیں اُردو مترادفات یا صحیح قافیہ ہاتھ نہ آنے کی وجہ سے اودھی الفاظ برقرار رکھے ہیں جن سے نظم میں غرابت اور اشکال پیدا ہوگئے ہیں۔ محمد قاسم علی نے ہر منظر اور ہر واقعہ میں جائسی کی پیروی کی ہے۔ چنانچہ مثنوی بے حد طویل ہوگئی ہے۔ پدماوت سے متعلق اردو کی پانچوں مثنویوں میں یہ طویل ترین ہے۔ جائسی کی سی قادرالکلامی، زور تخییل، لطفِ بیان اور جدتِ ادا محمد قاسم علی کے پاس کہاں۔ ترجمہ بے رنگ اور پھیکا سیٹھا ہوکے رہ گیا ہے۔ طوالت و غرابت ہی کی وجہ سے یہ مثنوی قبولیت کے درجے کو نہ پہنچی اور اس کے دوبارہ چھپنے کی نوبت نہ آئی۔

اس مثنوی کے ہر بند کے آخر میں ٹیپ کے طور پر بھاشا کا ایک دوہا ہے جو قاسم ہی کی تصنیف ہے۔ اس سے قصّے کی مختلف کڑیوں میں باہم گر ربط قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔

مثنویِ قاسم کی خوبی یہ ہے کہ جائسی کے زورِ طبیعت نے مضامین و مناظر میں تفصیل و جزئیات کے جو دفتر پیش کیے ہیں، ان کی جھلک یہاں دیکھی جاسکتی ہے۔ ناگمتی کی وفاشعوری، پدمنی کا بے مثال حسن و جمال، راجا کا جوگی بن کے مارا مارا پھرنا، سنہل دیپ کے رسم و رواج، جنگلات کا سکوت، بسنت کی رنگینی، سردی کی بے مہری، پپیہے کی پکاریں، ہاتھیوں کی قطاریں، موروں کا رقص، گھوڑوں کی پوجا، ہندی عورت کا برہ ورنن، ساجن سے خیالی مکالمے وغیرہ

---

۱۹۲ ایضاً

ترجمے میں بھی لطف دے جاتے ہیں۔ قاسم نے پدمنی کے سراپا کا بھی عین ترجمہ کیا ہے۔ یہ پندرہ صفحوں کو محیط ہے۔ بارہ ماسہ کو بھی پوری طرح نظم کیا ہے اور یہ آٹھ صفحوں میں بیان ہوا ہے۔ راجہ رتن سین کے فراق میں رانی ناگمتی کی حالت ملاحظہ ہو:

کہکتی ہوں طرح کوئل کے رو رو   بنیں آنسو ہیں گھنگچی خوں ہو ہو
ہوا کالا مرا منہ آنکھ ہیں لال   برہ کا گرم دکھ ٹھنڈا کرو حال
مری ہر بوند میں جانو کہ ہے جی   پکارے گوشہ گوشہ کرکے پی پی
اسی دکھ برگ ڈھاکہ کا جلے ہے   سحر خورشید پُر خوں ہو چلے ہے
اسی لوہو سے کندرو لال ہووے   شجر سوکھیں گھوں شق بال ہووے
جہاں دیکھوں وہ سب ہو سرخ ہیہات   رتن جس جا، کہے جا کون اب بات[193]

راجا کے بخیر و عافیت گھر واپس آنے پر رانی اپنے شوہر کی آرتی اتارتے ہوئے کہتی ہے:

یہ جوبن اور تن من ہو نچھاور   تصدق جان، پیارے میری تم پر
تمھاری راہ میں آنکھیں بچھاؤں   قدم رکھو میں اپنا سر جھکاؤں
مرا دل آپ ہی کا یہ مکاں ہے   تمھاری راہ آنکھوں کے میاں ہے
بدن ہوں میں اور اس کی جان تم ہو   میں کارندہ، میاں، پر شان تم ہو[194]

مثنوی سوہنی مہینوال

سوہنی مہینوال کے قصے کا تعلق بھی پنجاب کی سرزمین سے ہے اور ہیر و رانجھا اور سسی پنوں کی طرح یہ بھی ایک مقبول عام قصہ ہے۔

سوہنی مہینوال کا قصہ یوں ہے: بخارا کا ایک سوداگر عزت بیگ تجارت

---

۱۹۳   ایضاً، ص ۲۷۶

۱۹۴   ایضاً، ص ۲۷۴

کی غرض سے شاہجہاں کے زمانے میں ہندستان آیا اور دہلی سے واپسی پر نادر اشیا کی تلاش میں لاہور وارد ہوا۔ کسی نے اس سے کہا کہ پنجاب کے ایک شہر گجرات میں تُلا نامی ایک کلال ہے جو بے مثال کوزے بناتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کی نگاہیں کلال کی حسین بیٹی سوہنی سے چار ہوئیں، تجارت وغیرہ کا نشہ تو وہیں ہرن ہوا اور سر میں عشق کا سودا سمایا۔ عزت بیگ نے ''مہینوال'' نام اختیار کیا اور چرواہے کی حیثیت سے گجرات ہی میں رہنے لگا۔ سوہنی سے شناسائی پیدا کی اور عشق کی بے تابیاں دونوں طرف سے رنگ لانے لگیں۔ تُلا کلال کو جب یہ احوال معلوم ہوا تو اس نے مہینوال کو شہر سے نکلوا دیا۔ مہینوال نے گدائی اختیار کی اور بھیس بدل کر چناب کے دوسرے کنارے پر ڈیرہ ڈال دیا۔ سوہنی سے ہر شب ملاقات ہوتی اور مہینوال مچھلی کے کباب سے اس کی ضیافت کرتا۔ ایک روز اتفاق سے مچھلی ہاتھ نہ آئی تو مہینوال نے اپنی ران کا حصہ کاٹ کر کباب تیار کیے۔ مہینوال تیرنے کے اہل نہ رہا تو سوہنی رات کو گھڑے کے سہارے تیر کر آنے لگی۔ ایک رات جب وہ سولہ سنگار کرکے نکلی تو اس کی نند نے دیکھ لیا اور دوسری رات پکے گھڑے کی جگہ کچا گھڑا رکھ دیا۔ سوہنی کو اندھیرے میں اس کا پتا نہ چلا، اس رات طوفان بھی آیا اور سوہنی جب کچے گھڑے کے سہارے تیرنے لگی تو اس نے زیادہ دیر ساتھ نہ دیا۔ سوہنی عین منجدھار میں مہینوال، مہینوال پکارتی ہوئی ڈوب گئی۔ مہینوال نے بھی اس آواز پر لبیک کہا اور موجوں کی تھپیڑے کھاتا ہوا غرق ہوگیا۔

قصہ سوہنی مہینوال پر مبنی فارسی نسخوں کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ مثنوی سوہنی مہینوال، اثر صالح، سنہ تصنیف مابین ۳۹۔۱۸۴۱ء

۲۔ مثنوی ارژنگ عشق، عطا محمد زیرک کلانوری، سالِ تصنیف ۱۲۷۶ھ

۳۔ مثنوی قندلذّت، نجم الدین، مسکین ساکن کوروال، سنہ تصنیف ۱۲۸۴ھ(۱۹۵) (۱۹۶)

---

۱۹۵ اورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۹۳۱ء، ص ۶۳

۱۹۶ پنجابی قصے فارسی زبان میں، ص ۱۹۲۔۲۲۹ اور ۲۵۹

اردو میں بھی اس قصے پر مبنی ایک مثنوی دستیاب ہوئی ہے، جو برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔ یہ لاہور سے ۱۸۷۱ء میں ۸۰ صفحات پر شائع ہوئی۔ اس کے مصنف کا نام اروڑا رائے بتایا گیا ہے۔[۱۹۷] اروڑا رائے کا قصہ سوہنی مہینوال ۱۸۷۱ء ہی میں پنجابی زبان میں بھی لاہور سے شائع ہوا۔ اس کا یہ ایڈیشن کتب خانہ انڈیا آفس، لندن میں محفوظ ہے۔[۱۹۸] اس کے علاوہ اس کتب خانے میں فضل شاہ (لاہور ۱۸۶۹ء) گنگا رام (لاہور ۱۸۶۸ء) گوپال سنگھ (امرتسر ۱۸۷۵ء) اور قادر یار (لاہور ۱۸۶۷ء) کے پنجابی ایڈیشن بھی ہیں۔[۱۹۹] اردو نثر میں اس قصے کو اننت رام بیتاب نے لکھا۔ یہ کتاب لاہور سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔[۲۰۰]

مثنوی سیلی سجنوں

میر سعادت علی سعادت تخلص کی ایک مثنوی سیلی سجنوں کا ذکر میر حسن[۲۰۱] اور علی ابراہیم خاں[۲۰۲] نے کیا ہے۔ لیکن اس کا کوئی شعر پیش نہیں کیا۔ میر سعادت علی کا ذکر میر تقی میر، قائم، شفیق، گردیزی، مصحفی، قدرت اللہ قاسم، شیفتہ اور نساخ کے تذکروں میں بھی ملتا ہے۔ لیکن کسی نے اس مثنوی سے متعلق صراحت نہیں کی۔ صاحب گلزار ابراہیم نے فقط اتنا لکھا ہے کہ سیلی سجنوں نام کے دو عاشق و معشوق نواب قمرالدین خاں وزیر کے زمانے میں (۱۷۲۱۔۱۷۴۹) دہلی میں گزرے ہیں۔ انھیں کے افسانہ عشق کو سعادت نے

---

۱۹۷ بلوم ہارٹ، برٹش کتب، ص ۲۷

۱۹۸ انڈیا پنجابی، ص ۲۵

۱۹۹ ایضاً نیز، پنجابی کتب برٹش کالم ۱۴ اور ۲۴

۲۰۰ فہرست کتب خانہ، ص ۳۳

۲۰۱ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۷۹

۲۰۲ تذکرہ گلزار ابراہیم، ص ۱۶۱

مثنوی کی شکل میں لکھا ہے۔[۲۰۳] سعادت کا کوئی مجموعہ کلام دستیاب نہیں ہوتا اور غالباً گردش روزگار نے اس مثنوی کو بھی خاک لیئم کی نذر کردیا۔ یہ اگر موجود ہوتی تو اس کا شمار شمالی ہندستان کی قدیم ترین مثنویوں میں کیا جاتا۔

میر سعادت علی امروہے کے باشندے تھے۔ شاہی دربار سے متوسل ہوکر دہلی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ میر تقی میر نے ذکرِ میر میں انھیں سے متعلق لکھا ہے: "وآں عزیز مرا تکلیف موزوں کرون ریختہ کرد"۔ تذکرہ نکات الشعرا میں ہے: بابندہ ربط بسیار داشت"[۲۰۴] ۱۱۵۲ھ اور ۱۱۶۵ھ کے مابین کسی سال میں انتقال کیا۔[۲۰۵]

مثنویات قصہّ شاہ لدّھا

مثنوی قصہّ شاہ لدّھا از قائم چاند پوری

کلیات سودا، مطبوعہ نول کشور ۱۹۳۲ء جلد دوم میں ایک طویل عشقیہ مثنوی بغیر کسی عنوان کے ص ۸۵ سے ۱۰۰ تک درج ملتی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:

الٰہی شعلہ زن کر آتشِ دل
تپ دل دے بقدر خواہش دل

مثنوی کے خاتمے پر سودا کا تخلص یوں آیا ہے:

---

۲۰۳ ایضاً

۲۰۴ تذکرہ نکات الشعرا، ص ۲۷

۲۰۵ مزید حالات کے لیے ملاحظہ ہوں۔ مخزن نکات، ص ۱۸، ریختہ گویاں، ص ۹۴، گلشن ہند، ص ۱۶۱، چمنستانِ شعرا ص ۳۹۸، شعرائے اردو ص ۱۸۰، مجموعہ نغز جلد اوّل ص ۲۹۸، ہندی ص ۱۱۶، گلشنِ بے خار ص ۹۸، سخنِ شعرا ۲۱۶، خمخانۂ جاوید جلد چہارم ص ۱۹۵، میر کی آپ بیتی، پاورقی ص ۹۷

پس اے سودا خموشی پیشہ کر تو
سخن کے طول سے اندیشہ کر تو[۲۰۶]

لیکن دراصل یہ مثنوی سودا کی نہیں بلکہ قائم چاند پوری کی تصنیف ہے۔ بعض وجوہ سے قائم کا بہت سا کلام سودا کے کلّیات میں شامل ہوگیا ہے۔ اس میں سے کچھ کی نشان دہی شیخ چاند نے کی تھی۔[۲۰۷] مذکورہ بالا مثنوی بھی الحاقی تھی۔ اس کی طرف مولوی عبدالحق نے مقدمہ تذکرہ مخزن نکات میں[۲۰۸] اور عبدالباری آسی نے اپنے ایک مضمون[۲۰۹] میں اشارہ کیا تھا لیکن انھوں نے اس سلسلے میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ حالانکہ شاہ محمد کمال کے تذکرہ مجمع الانتخاب (سال تصنیف ۱۲۱۹ھ) میں یہ مثنوی قائم چاند پوری ہی کے نام سے درج ملتی ہے۔[۲۱۰] اس مثنوی کا صحیح نام قدرت اللہ شوق نے تذکرہ طبقات الشعرا میں لکھ دیا ہے۔ قائم کے ترجمے میں لکھتے ہیں: "مثنوی شاہ لدہا کہ فقیرے تکیہ دار عاشق مزاج مجنوں منش در نواحی پنجاب بود، بسیار باداہائے رنگین بستہ از اول تا آخر ہمہ اشعار انتخابی است"۔[۲۱۱]

اس مثنوی میں جیسا کہ اوپر کہا گیا، پنجاب کے ایک درویش شاہ لدھا کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے یہ کہانی قلم بند نہیں ہوئی تھی۔ قائم نے اسے کسی راوی سے سُنا اور اسی طرح نظم کردیا۔ خود کہتے ہیں:

---

۲۰۶ کلیات سودا، جلد ۲، ص ۱۰۰

۲۰۷ سودا، ص ۱۱۰

۲۰۸ مخزن نکات، ص ۹

۲۰۹ مطبوعہ رسالہ اردو جنوری ۱۹۳۹، ص ۶۵

۲۱۰ مجمع الانتخاب قلمی سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد

۲۱۱ نسخہ قلمی کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد ورق ۸۶ ب، نیز ملاحظہ ہو "قائم کی ایک عشقیہ مثنوی"، نثار احمد فاروقی، رسالہ سب رس، فروری ۱۹۶۰ء

شب اک ماتم سرائے خانۂ عشق — بیاں کرتا تھا یوں افسانۂ عشق
چنانچہ نوحہ[۲۱۲] خوانِ بزمِ ماتم — کرے ہے اس طرح سے نالشِ غم

مثنوی عشق کی تعریف سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد حمد باری تعالیٰ، نعتِ حضرت سید المرسلین، اور مناجات ہے جو ۲۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ کہانی کا آغاز پنجاب کے ایک درویش کے ذکر سے ہوتا ہے:

کہ تھا پنجاب میں اک مرد درویش — گرفتار بلائے حالتِ خویش
ہمیشہ دستِ دل سے پائے کوباں — سدا آشفتہ سر جوں زلفِ خوباں
مقام اس کا تھا اک جاگہ سرراہ — بوضع تکیہ ہے جس سے تو آگہ

یہ تکیہ ایسی پر فضا اور دل کشا جگہ پر واقع تھا کہ مسافر آتے جاتے ہوئے یہاں ستانے کے لیے رک جاتے تھے۔ ایک بار ایک بارات ادھر سے گزری اور تھوڑی دیر کے لیے سب وہاں اُتر پڑے۔ دلہن کا ڈولا ایک طرف اتارا گیا۔ گرمی غضب کی پڑ رہی تھی۔ دلہن ہوا کھانے کے لیے پردے سے باہر نکلی۔ اتفاقاً درویش کی نگاہیں اس نازنین سے چار ہوئیں اور عشق کا تیر دونوں کے دل سے پار ہو گیا:

دوچار اس سے ہوا یہ مرد درویش — گیا بے چارہ اک جھپکی میں ازخویش
نہ جانے تھی نگہ یا تیر یا بار — کہ بے تحریک وہ دل سے ہوئی پار
نگاہوں میں رہا صد بحث و تکرار — نہ تھا ہر چند واں امکانِ گفتار
غرض ایدھر تو جلتی تھی یہ دلریش — اودھر لوٹے تھا آتش پر وہ درویش
نہ اس کو کچھ سخن کہنے کا یارا — نہ اس کو جز خموشی اور چارا
یوں ہی باہم تھے یہ محوِ بلاہا — کہ ناگہ واں نے وہ ڈولا اٹھایا
ہوئی وہ قوم جب تکیہ سے راہی — اجازت اون نے اس محزوں سے چاہی

۲۱۲ مطبوعہ نسخے میں ”نوح“ جو غلط ہے

دو دل بیٹھے بٹھائے بلائے عشق میں گرفتار ہوگئے۔ نباہ کی صورت ہی کیا تھی! بارات جیسے آئی تھی ویسے ہی چلی گئی اور اس کے ساتھ دلہن کا ڈولا بھی۔ درویش ایک درخت پر چڑھ کر اسے ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا:

نظر آنے سے مطلق رہ گیا جب — ہوا وہ روز اس پر تیرہ جوں شب
گرا اوپر سے نیچے واں یہ مجروح — گئی دنبال ڈولی کے چلی روح

غرض درویش تو اس طرح عشق کے پہلے ہی وار میں ختم ہوگیا اور ادھر دلہن آتشِ عشق میں اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ سسرال میں اس کی بڑی خاطر مدارات کی گئی۔ طرح طرح کے ناز اٹھائے گئے لیکن اس کی وحشت اور بے قراری میں فرق نہ آیا۔ جب معاملہ علاج معالجے کے بس کا نہ رہا تو سسرال والوں نے دلہن کے والدین کو خط لکھ کر بلایا کہ وہ آکر اسے لے جائیں۔ شاید گھر کے مانوس ماحول میں اس کا جی بہل جائے۔ دلہن کے ماں باپ آئے اور اسے اپنے ساتھ لیے واپس گھر کو روانہ ہوئے۔ راہ میں یہ قافلہ پھر اسی درویش کے تکیے پر ستانے کے لیے رُکا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا:

کہ جب وہ نازنیں تکیہ میں آئی — جگہ درویش کی اک ڈھیر پائی
وہ نیشِ غم جو تھا خاطر میں مرکوز — ہوا جوں نیشِ عقرب نار آموز
شرارِ غم نے کی آخر شرارت — بدن میں یک بیک آئی حرارت
لگا کر ماہ سے اور تا بماہی — نظر میں چھا گئی یکسر سیاہی
گری بے طاقتی سے واں یہ غم ناک — طرح پانی کے لرزی ہر طرف خاک
اسی صورت سے یہ غلطاں تھی کچھ دور — کہ جذبِ عشق نے ٹکڑے کی وہ گور
نہ جانے پھر کہ واں کا حال کیا تھا — یہی وہ گور تھی یا اژدہا تھا
اسے اس گور نے اس طرح کھایا — نہ ماہی بیچ یوں یونس سمایا
ہوئی جوں آب پنہاں یہ تہ خاک — رہے باہر وہ سارے مثلِ خاشاک

اس کے بعد قائم نے دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا نقشہ کھینچا ہے اور اسی بیان پر مثنوی ختم کردی ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے مثنوی کا قصہ نہایت سادہ اور مختصر ہے۔ اس کی حزنیہ لَے اور دردانگیزی اسے میر تقی میر کی مثنویوں کے قریب لے جاتی ہے۔ لیکن قائم کو جذبات نگاری پر وہ قدرت حاصل نہیں جو میر کا حصّہ ہے۔ درویش کا کردار بھی پوری طرح اُبھر کر سامنے نہیں آتا۔ گو مثنوی مقامی رنگ لیے ہوئے ہے، لیکن قائم نے ماحول کی مرقع کشی اور جزئیات نگاری سے دلکشی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ قصّے کے اعتبار سے قائم کی یہ مثنوی سودا کی کوششوں پر بھاری ہے۔ سودا کی اکثر مثنویاں بیانیہ ہیں اور ان میں قصّے کا عنصر برائے نام ہے۔ قائم اپنے اسلوب بیان میں سودا سے متاثر تھے، لیکن مرصع زبان اور زور دار ترکیبوں کے استعمال میں وہ اعتدال سے کام لیتے تھے۔ ان کا لب و لہجہ دلنشیں اور پُر تاثیر ہے۔ انھیں خوبیوں کی بنا پر ادبی اعتبار سے قائم کی یہ مثنوی شمالی ہندستان کی قدیم مثنویوں میں اونچا مقام رکھتی ہے۔

مثنوی اعجازِ عشق از راسخ عظیم آبادی

قائم چاند پوری کی مثنوی شاہ لدّھا میں جو قصہّ ملتا ہے اور جس کا ذکر ابھی اوپر کیا گیا ہے، اسی قصّے پر مبنی ایک مثنوی کلیات راسخ میں بھی ملتی ہے۔ جس کا نام "اعجاز عشق" ہے۔[۲۱۳] معلوم ہوتا ہے یہ واقعہ یا قصہّ اس زمانے میں خاصا مقبول و معروف تھا۔ قائم چاندپوری (وفات ۱۲۱۰ھ) اور راسخ عظیم آبادی (وفات ۱۲۳۸ھ) کی عمروں میں جو تفاوت ہے، اس کے پیش نظر یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ راسخ نے اپنی مثنوی قائم کی مثنوی کے بعد لکھی اور ممکن ہے کہ قائم کی مثنوی راسخ کی نظر سے گزری ہو اور اسے دیکھ کر ہی انھیں یہ قصہّ نظم کرنے کی ترغیب ہوئی ہو۔

---

۲۱۳ اعجاز عشق "مثنویات راسخ" مرتبہ ممتاز احمد میں شامل ہے

راسخ کی مثنوی میں اشعار کی تعداد قائم کی مثنوی سے تقریباً دُگنی ہے۔ راسخ نے حمد، نعت، مناجات عاشقانہ وغیرہ پر دس صفحات صرف کیے ہیں۔ اصل حکایت اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

ہند کے بیچ نوجواں تھا ایک　　نہ جواں آفتِ جہاں تھا ایک

نوجوان کی شادی، برات کی رخصتی اور درویش کے تکیے میں رکنا، یہ سب واقعات اسی طرح بیان ہوئے ہیں جس طرح قائم کے ہاں ملتے ہیں۔ درویش اور عروس کی نگاہیں چار ہونے کے موقع پر راسخ نے بڑے گرم اور پُرسوز اشعار نکالے ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں:

ناگہاں نو عروسِ زیبا نے　　مقصدِ جانِ ناشکیبا نے
ٹک اٹھایا جو مہد کا پردا　　بہر تفریحِ طبع و کسبِ ہوا
برق سا چمکا گوشۂ معجر　　آگہ اس سے ہوا وہ خستہ جگر
ہوش کا اس کے انقطاع کیا　　ان نے اپنے تئیں وداع کیا
سوئے درویش وہ ستم گارہ　　ہوئی اک ڈھب سے گرم نظارہ
کی نگہ طرفہ آشنایانہ　　آپ سے ہوگیا یہ بے گانہ
غارت اس کی نگہ نے دل کو کیا　　دیکھا اس ڈھب کہ جی نکال لیا

اس کے بعد چند اشعار میں سراپا کا بیان ہے:

اللہ اللہ وہ صافیِ سینہ　　خاک سا جس کے آگے آئینہ
کیا فریبندہ حُسن زانو و ساق　　ان سے اٹھنا نگاہِ شوق پہ شاق
پیارے پیارے نگاریں اس کے پا　　نرم ایسے کہ پھول ہیں گویا
کف پائے حنائی کیا محبوب　　جلتی آنکھوں کو ان سے ملیے خوب
آگے کیا وصف ہو سراپا کا　　زہے حُسن اس عروس زیبا کا

راسخ نے عاشق و معشوق کے اضطراب اور پریشانی کو بھی بڑے موثر اور دلکش

پیرایے میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

بڑھ گیا کارِ شوق آخر کار　　نہ اٹھا بارِ شوق آخر کار
متصل مضطرب طپاں دل ہم　　نگراں ہمدگر مقابل ہم
تھے خمش لیک کہتے تھے کیا کیا　　بے زبانی زبان تھی گویا
شوق ٹپکا پڑے نگاہوں سے　　حسرت اک نکلے ان کی آہوں سے
عرصہ فرصت کا بے نہایت تنگ　　آرزو کی فراخیاں اس رنگ
ہم سخن ہونے کی کہاں جا تھی　　جز زبان نگہ کہ گویا تھی
دو گھڑی تھی یہ درمیاں صحبت　　اتنی ہی آسماں نے دی فرصت

آخر کہاروں نے ڈولا اٹھایا، برات روانہ ہو گئی، اور:

دمِ رخصت کچھ آہ کر نہ سکی
واپسیں اک نگاہ کر نہ سکی

جذبات نگاری میں تو راسخ، قائم سے آگے ہیں ہی، مرقع کشی میں بھی ان کی مہارت اپنا لوہا منوا لیتی ہے۔ مہد عروس کے چلے جانے کے بعد درویش کی حالتِ زار دیکھیے:

بڑھ گیا جب بہت نظر سے دُور　　ہو گئی طاقت نگہ معذور
اک درخت کشیدہ سر پہ چڑھا　　مہد واں بھی نظر کے آگے بڑھا
ہوگیا آنکھ میں جہاں تاریک　　لے زمیں سے بہ آسماں تاریک
غمِ فرقت میں ہائے خوب گھرا　　ہوکے بے جاں درخت سے وہ گرا
مہد کے ساتھ جی روانہ کیا　　جسم پر بے وقار تھا نہ گیا

بیچ بیچ میں موقع و محل کی مناسبت سے راسخ نے عشق کی تباہ کاریوں پر چند اخلاقی اشعار بھی لکھ دیے ہیں۔ یہ واقعات کی رفتار میں مزاحم ہوتے ہیں لیکن مثنوی کی دردناک فضا کا اثر ان سے ضرور گہرا ہو جاتا ہے۔ قصے کے انجام

میں راسخ نے خفیف سی تبدیلی کی ہے۔ عروس میکے واپس جاتے ہوئے باغ میں رُکتی ہے تو اُسے دایہ کے ذریعے باغبان سے معلوم ہوتا ہے کہ درویش کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ سُنتے ہی عروس کی نگاہوں میں جہان تیرہ و تار ہو جاتا ہے، لیکن وہ سنبھل کر دایہ کو پھول توڑنے کے بہانے دور بھیجتی ہے اور خود درویش کی قبر پر آتی ہے۔ اپنے چہرے پر خاک ملتی ہے اور قبر سے گلے لگ کر آہ و فریاد کرتی ہے۔ اس کے بعد قبر کا شق ہونا اور عروس کے اس میں سما جانے کا واقعہ وہی ہے جو قائم نے بیان کیا ہے۔ قائم کے ہاں اس کے بعد قصہّ ختم ہو جاتا ہے اور عروس کے عزیز و اقارب رو دھو کر اپنے گھر کی راہ لیتے ہیں۔ لیکن راسخ کی روایت کے مطابق عروس کے اس طرح غائب ہو جانے کے بعد کہرام مچ گیا اور اس کی تلاش شروع ہوئی۔ عروس کے آنچل کا پلو قبر سے باہر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اس نے غمازی کی اور بعض بے تہ لوگوں نے شہید اُلفت کی قبر کھود ڈالی۔ وہاں یہ منظر دکھائی دیا:

دونوں چسپیدہ یک دگر پائے — کیا معیت سے وے نظر آئے
عین درویش تھی وہ حور اس طرح — معنی اجزائے لفظ میں جس طرح
سب نے چاہا کہ ہو اُنھوں میں فصل — پر ہو کیا فصل یوں ہو جن کا وصل
عشق پُرکار کے ہنر دیکھو — وصل و پیوند ہمدگر دیکھو
کاہ تھا کوہکن اسی سے ہوا — نل بھی محو دمن اسی سے ہوا
دیکھ یہ اتصالِ روحانی — دور پہنچی سبھوں کی حیرانی
کی درست اس شہید عشق کی گور — گئے روتے سب اپنے گھر کی اور

راسخ عظیم آبادی نے حسن و عشق سے متعلق نو مثنویاں لکھی ہیں۔[۲۱۴] لیکن ان میں قصہ پن، منظر کشی اور جذبات نگاری کے اعتبار سے یہ مثنوی سب سے فائق ہے۔ واقعیت کی سادہ حقیقت نگاری کو اس زمانے کے قصےّ کہانیوں میں

۲۱۴ مثنویات راسخ، مقدمہ ص ۱۴۹

زیادہ دخل نہ تھا بلکہ اُس مافوق الفطرت عنصر کو اہمیت دی جاتی تھی جو ماورائی قوتوں کی برتری کا احساس پیدا کر کے انسان کو حیرت اور استعجاب میں گم کردے۔ عشق کی کرامتوں کو بھی اسی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ راسخ نے بھی کرامت ہی کی مدد سے عشق کی افضلیت ثابت کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ماحول کی کامیاب اور سچّی مرقع کشی کر کے مثنوی میں واقعیت کی تہ کو گہرا کردیا ہے۔ انھوں نے درویش اور عروس کے کردار کو بھی فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ راسخ کی مثنویوں کا عام نقص تمہید کی بے جا طوالت ہے لیکن یہ مثنوی اس سے پاک ہے۔ اشعار درد انگیز اور پُر تاثیر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ راسخ نے اس پر پورا زورِ سخن صرف کیا اور ایک ایک شعر جی ٹھونک کر لکھا ہے۔

مثنوی چھو منتر

اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ مثنوی چھو منتر کے مصنف میر ذوالفقار علی خاں متخلص بہ صفا، میر تقی میر کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ سے بنگالہ گئے اور وہاں سے دکن آئے۔ یہاں میر عالم اور ان کے بعد مہاراجہ چندولال کے مصاحب رہے۔ ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ زیرِ نظر مثنوی ۱۲۲۳ھ میں یا اس سے قبل لکھی گئی۔ کیونکہ اس میں میر عالم کی مدح لکھی ہے اور وہ ۱۲۲۳ھ میں فوت ہوئے۔ خود ذوالفقار علی خاں کا انتقال ۱۲۶۰ھ میں ہوا۔[۲۱۵]

مثنوی میں میر تقی میر کی مدح کے چند اشعار یہ ہیں:

ہاں اگر کچھ حسرتِ استاد ہے	تو بجا ہے یہ محلِّ یاد ہے
مثنوی یہ عشق کی تصویر ہے	قابلِ نذرِ جنابِ میر ہے
سو تو یہ باقی فقط افسوس ہے	لکھنؤ اب ہم سے لاکھوں کوس ہے

---

۲۱۵ محبوب الزمن، ص ۶۱۵

یہ مثنوی بھی کسی مقامی لوک روایت پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں بنارس کے ایک طالب علم کا دل خراش قصہ نظم کیا گیا ہے، جو ایک تاجر زادے پر عاشق ہوگیا تھا۔ روگ یہاں تک بڑھا کہ اس نے لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا۔ بد قسمتی سے معشوق کا کسی بیماری سے انتقال ہوگیا اور عاشق نے بھی وہیں چتا کے قریب جان دے دی۔

ادارۂ ادبیات اُردو، حیدر آباد کا نسخہ ۱۲۷۸ھ میں لکھا گیا۔ اس مثنوی کا ایک اور نسخہ مولوی سید محمد کے کتب خانے میں ہے، جو مصنف کے حین حیات ۱۲۴۹ھ میں لکھا گیا تھا۔ تعداد اوراق ۱۲۔[۲۱۶]

مثنوی جذبۂ عشق

مصحفی کی مثنوی جذبۂ عشق قاضی عبدالودود صاحب نے رسالہ اُردو، اپریل ۱۹۳۹ء[۲۱۷] میں شائع کی تھی۔ یہ مثنوی کتب خانہ مشرقیہ بانکی پور میں محفوظ دیوان اول اور دیوان پنجم دونوں نسخوں میں پائی جاتی ہے۔ دیوان اول میں وہ تمام کلام شامل ہے جو مصحفی نے دہلی میں کہا۔ اس لیے اغلب ہے کہ یہ مثنوی مصحفی نے ۱۱۹۸ھ یا اس سے قبل دہلی ہی میں تصنیف کی ہو۔

مثنوی جذبۂ عشق ۲۳۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ پہلے ۳۵ اشعار میں عشق کی تعریف و توصیف ہے۔ اس کے بعد مصحفی نے دہلی کے ایک جوہری کی سچی داستانِ عشق بیان کی ہے:

خاک دہلی میں اِک جوانِ حسیں — صاحبِ وضع صاحبِ تمکیں
گرچہ تھا جوہری وہ پاک نژاد — عشق تھا اس میں جوہر فولاد
عاشق زار اپنی زن پر تھا — بلبل اس خانگی چمن پر تھا

۲۱۶ ادارہ ادبیات، ص ۲۴۰

۲۱۷ ص ۱۹۶۔۲۰۶

یہ عورت حسن و جمال میں بے مثال تھی۔ مصحفی نے اس کا سراپا بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے اور اس کے ناز و انداز کی ہو بہو تصویر کھینچ کے رکھ دی ہے۔

رنگ کندن سا جو دمکتا تھا جس سے جو بن پڑا چھلکتا تھا
دی تھی یہ ناز کی نے اس کو بہار جس سے ہر عضو اس کا تھا گلزار
دیکھ کافر کی شوخیِ رفتار دنگ رہتے تھے مردمِ بازار
اس کی چتون کی وہ نگاہ تھی قہر جس کو کرتا سلام سارا شہر
تس پہ وہ برچھیاں نگاہیں تھیں جس سے مژگاں تمام آہیں تھیں
تھی وہ اس خوبی و صفا کے ساتھ ہوتی میلی نظر سے جس کی گات

جوہری اس نازک اندام کا بندۂ بے دام تھا اور:

گھر سے بازار تک اگر جاتا دو قدم چل کے پھر وہیں آتا
دل نہ لگتا تھا جب کہ اور کہیں قبلہ کرتا تھا اس صنم کے تیئں
بحر الفت میں تھا جو یکسر غرق وصل اور ہجر میں نہ پایا فرق

غرض:

دن بدن چاہ بڑھتی جاتی تھی مرگ دیکھ ان کو مسکراتی تھی
عیش و عشرت میں پا کے ان کے تیئں کیا دونوں پہ چشمِ بد نے کمیں

چنانچہ زوجہ جوہری کو بخار آنے لگا اور چند ہی دن میں وہ پھول کی طرح کمھلا گئی۔ رنگ زرد پڑ گیا اور چہرہ نیلا نظر آنے لگا۔ گھر کے لوگ اس کی یہ حالت دیکھ کر سخت گھبرائے۔ یہاں مصحفی نے ہندستانی عورتوں کی بدحواسی اور توہمات پرستی کا جو سچا نقشہ کھینچا ہے، وہ ان کی مشاقی اور قادرالکلامی کا بیّن ثبوت ہے۔ چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

کوئی بولی پری کے سائے تلے | آگئی ہے کہیں یہ بال کھلے
کوئی بولی کہ دوڑ ہی جاؤ | مرچیں جاکر کہیں پڑھا لاؤ
کوئی بولی کہ صدقہ دو فی الحال | کوئی بولی دکھاؤ جاکر فال
کوئی بولی کہ بید کو لاؤ | اس کی ناڑی تو اس کو دکھلاؤ
الغرض تھی بہت یہ ہانک پکار | نہ کھلے تھا کسی پہ یہ اسرار
کہ یہ نازک بدن جو کمھلائی | یک بہ یک اس پہ کیا بلا آئی

جوہری نے بھی دوا درماں میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا:

الغرض جو جتن تھے سب دو کیے | لیک بیمار مرگ کیوں کہ جیے
بعد یک چند وہ زنِ بیمار | اسی حالت میں مر گئی یک بار

زوجہ جوہری کے انتقال کے موقعے پر مصحفی نے پر تاثیر اور درد انگیز اشعار لکھے ہیں اور مرقع نگاری کا بھی حق ادا کر دیا ہے۔ ان اشعار میں حزن و حرماں کی وحشت سامانی ملاحظہ ہو:

اور سے اور ہوگئی صورت | بن گئی جیسے کاٹھ کی مورت
سر پہ مسّی نے اپنے ڈالی خاک | برگِ پاں نے کیا گریباں چاک
تھے کرن پھول وہ جو مثلِ چراغ | غم فرقت میں ہو گئے تھے داغ
آنجھیں چھلّو کی بھر بھرائی تھیں | دل پہ بانکوں نے بانکیں کھائی تھیں
انگلیاں ہوگئی تھیں یوں عریاں | جیسے شاخیں گلوں کی وقتِ خزاں
دیکھ چمپا کلی کو خوں روتی | سر پٹکتے تھے مانگ کے موتی
کرکے پاؤں کی انگلیوں کو یاد | بچھوے کرتے تھے دم بدم فریاد

آخر رو پیٹ کے ارتھی اٹھانے کا وقت آیا۔ مصحفی نے یہاں ہندو سماج سے اپنی گہری واقفیت کا ثبوت دیا ہے اور بعض رسوم بڑی خوبی سے بیان کی ہیں:

اتنے میں ارتھی کا جو تھا ساماں
لے کلاوے سے تا بہ بیڑۂ پاں

ہوا حاضر وہیں بہ یک باری
کی اٹھانے کی اس کی تیاری

نالہ فریاد دل خراشی تھی
آنسوؤں سے گلاب پاشی تھی

دم بہ دم رام رام ست کی صدا
جاتی تھی تا بہ گنبدِ خضرا

قدم اس دھج سے ان کے پڑتے تھے
گویا بخت اور اجل سے لڑتے تھے

پہنچے جمنا سے جب کہ ہو کر پار
بیچ مرگھٹ کے با دل افگار

اس دم اس نازنیں کو نہلا کر
غوطے پانی میں کتنے دلوا کر

ڈھیر میں لکڑیوں کے رکھوایا
آگ دی اور ان کو بھڑکایا

شعلہ اک گرم آسماں کو گیا
نہیں معلوم وہ کہاں کو گیا

وہ رشکِ قمر تو وہیں خاکستر ہوگئی، لیکن جوہری اندر ہی اندر شعلہ سا جلنے لگا۔ بارہ دن تعزیت داری میں گزر گئے اور:

تیرہواں دن ہوا جوہیں یک بار
آئی پھر ووہیں مرگ عاشق زار

آکے اُس خواب گہ میں بادل زار
تان چادر کو سورہا یک بار

کھنچ گئی روح جانبِ محبوب
ہوگئے ایک طالب و مطلوب

نہ جدائی کا کچھ رہا دھڑکا
ہوگیا صبحِ وصل کا تڑکا

اس میں سوتے ہوئے جو دیر ہوئی
بولی ماں یوں اسے جگا دے کوئی

اک نے جاکر کے جوہیں منھ کھولا
نہ ہلے لب نہ منھ سے کچھ بولا

مردنی رُخ پہ آشکار ہوئی
دوڑیو دوڑیو پکار ہوئی

سُن کے اس ماجرے کو آخرکار
ہوگیا بند جوہری بازار

آخر میں مصحفی اس واقعے کے سچا ہونے کی تصدیق کرتے ہوئے کہتے ہیں:

قصّہ یہ شہر میں ہوا مشہور
آیا سب کی زباں پہ یہ مذکور

بات مجھ تک بھی یہ جوہیں پہنچی
حد کڑھا اس گھڑی تو میرا جی

ایک انجام عشق تھا جو یہی　　اس کی ہمت پہ آفریں میں کہی
عاشقی میں یہ تازہ تھا مضموں　　میں نے اس کے تئیں کیا موزوں
کوئی عاشق جو اس کو دیکھے گا　　دیوے گا طبع مصحفی کو دعا

مصحفی کی یہ مثنوی واقعیت پسندانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ اس کی بڑی خوبی اختصار ہے۔ اشعار سادہ و پر تاثیر ہیں۔ اس میں قصہ پن برائے نام ہے۔ لیکن یہ کمی مرقع کشی سے کسی حد تک پوری کر دی گئی ہے۔ مصحفی کا اندازِ بیان سلیس و دل نشیں اور شگفتہ ہے جس سے قصے کی دردانگیزی کا دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔

مثنوی کرشن کنور

کرشن کنور از برہم گورکھپوری "میواڑ کے خاندان کی ایک حسین شاہزادی کرشن کنور کی دردناک داستان۔ منشی امیر احمد مینائی نے اس کی اصلاح کی"۔ (۲۱۸)

مثنوی جذب عشق

از میر شاہ حسین، متخلص بہ حقیقت، باشندۂ بریلی۔ اس قصے میں مصنف نے ۱۲۰۴ھ بمقام سمری نزد بندرابن کا ایک آنکھوں دیکھا واقعہ بیان کیا ہے۔ سنہ تصنیف ۱۲۱۱ھ اوراق ۷۱۔ (۲۱۹)

مثنوی بدھو گل فروش

سعادت یار خاں رنگین (وفات ۱۲۵۱ھ بمطابق ۱۸۳۵ء) کی یہ مثنوی ان کی تصنیف "امتحانِ رنگیں" میں شامل ہے، جو مجموعہ نورتن کا نواں حصہ ہے۔

۲۱۸　صدیق، ص ۵۳

۲۱۹　باڈلین ۲، ص ۱۲۸۹، نیز اشپرانگر ص ۲۳۲ (حالات کے لیے ملاحظہ ہو تذکرہ ہندی ص ۸۶)

امتحانِ رنگیں کا سالِ تصنیف ۱۲۳۲ھ ہے۔ اس کا مخطوطہ انڈیا آفس میں محفوظ ہے۔ یہ مصنف کا ذاتی نسخہ تھا جو بمقام باندہ ۱۲۴۶ھ میں لکھا گیا۔ تعداد اوراق ۲۴۔[۲۲۰]

"امتحانِ رنگیں" میں سعادت یار خاں رنگین نے ۲۷ مختلف اصنافِ سخن کا ذکر کیا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے ان تمام اصناف میں کلام کہا ہے۔ مثنوی کے ذیل میں انھوں نے اپنی سات مثنویاں گنوائی ہیں۔ ان میں سے ایک مثنوی بدھو گل فروش ہے جس کی صراحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"مثنوی بدھو گل فروش و وزیرن سبزی فروش یعنی کنجڑن کہ ہردو خودہا را در چاہ انداختہ مردند و ایں معاملہ درشاہ جہاں آباد بہ روے چشم خود گزشتہ"۔

رنگین نے دیباچہ "امتحانِ رنگین" میں لکھا ہے کہ اس نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس مثنوی میں پانچ سو شعر ہیں۔ آغاز اس طرح ہوتا ہے:

الٰہی چاہ کی اس دل کو دے چاہ   بتا دے چاہ کی سیدھی اسے راہ
کہ تا بہ چاہ گر تجھ کو سرا ہے   ترے بن اور کو مطلق نہ چاہے[۲۲۱]

مثنوی قطب مشتری

وجہی کی مثنوی قطب مشتری اردو ادبیات میں تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ سلطان محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸-۱۰۲۰ھ) کے زمانے میں ۱۰۱۸ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس میں تقریباً دو ہزار اشعار ہیں، جنھیں وجہی نے بارہ دن میں کہہ ڈالا۔ اس مثنوی کا ایک مخطوطہ انڈیا آفس لندن میں ہے۔[۲۲۲]

---

۲۲۰   بلوم ہارٹ، انڈیا نمبر ۸۶

۲۲۱   بلوم ہارٹ، انڈیا نمبر ۸۶

۲۲۲   بلوم ہارٹ انڈیا نمبر ۱۲۲/۲، مولوی عبدالحق سے تسامح ہوا ہے۔ غالباً وہ اسی مخطوطہ کو نسخہ برٹش میوزیم کہتے ہیں (مقدمہ ص ۱۸) برٹش میوزیم میں قطب مشتری کا کوئی نسخہ نہیں۔

دوسرا مولوی عبدالحق کے پاس تھا۔ انھوں نے ان دونوں مخطوطات سے مقابلہ کر کے اس مثنوی کو ۱۹۳۹ء میں شائع کر دیا ہے۔[۲۲۳]

وجہی کے حالات ہنوز پردۂ خفا میں ہیں۔ البتہ اس کی تصانیف سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا ایک ممتاز شاعر اور ادیب تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں اسے بڑی وقعت اور عزت حاصل تھی۔ مثنوی قطب مشتری کے علاوہ اس کا نثری قصہ "سب رس" (۱۰۴۵ھ) خاصا مشہور ہے۔

اس مثنوی میں محمد قلی قطب شاہ کے عشق کو داستانوں کے ڈھنگ پر فوق فطرت اور طلسماتی واقعات کے ساتھ ملا کر پیش کیا گیا ہے۔ قصے کا انداز روایتی ہے۔ سلطان ابراہیم قطب شاہ کے اولاد نہ تھی۔ مدت کے بعد جب بیٹا پیدا ہوا تو بڑی خوشیاں منائی گئیں اور تعلیم و تربیت کا اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام کیا گیا۔ بڑا ہونے پر شہزادے (محمد قلی) نے ایک رات خواب میں ایک جنس حسین کو دیکھا اور دل و جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔ ہزار بہلانے پر بھی شاہزادے کا دھیان اس سے نہ ہٹا۔ آخر ایک جہاندیدہ مشیر کو جو مصور بھی تھا، ساتھ لے کر شہزادہ اس پری تمثال کی تلاش میں گھر سے نکلا۔ راہ میں بڑے بڑے آلام و مصائب کا سامنا ہوا۔ شہزادے نے شجاعت اور دلیری سے ہر مشکل کو آسان کیا اور مدتوں کی دشت نوردی کے بعد اپنے محبوب کے وطن بنگال پہنچا۔ مصور نے دربار میں رسائی حاصل کی اور اسے محل کو آراستہ کرنے کا کام سونپا گیا۔ اس نے ایک جگہ محمد قلی کی شبیہ بھی بنادی، جسے دیکھتے ہی مشتری مست و بے خود ہو گئی۔ آخر محمد قلی اپنے خوابوں کی ملکہ کو اپنے ساتھ گولکنڈہ لے آیا جہاں بڑی دھوم دھام سے دونوں کی شادی کر دی گئی۔

مثنوی قطب مشتری دکھنی اُردو کی مشہور مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔ وجہی کا اندازِ بیان فطری ہے۔ اشعار رواں دواں، شیریں اور پر تاثیر ہیں۔ زبان آج سے ساڑھے تین سو برس پہلے کی ہے۔ اس لیے غیر مانوس معلوم

۲۲۳ مثنوی قطب مشتری۔ بہ تصحیح و تحشیہ مولوی عبدالحق، دہلی ۱۹۳۹ء، تعداد صفحات ۲۰/۱۰۹/۲۴

ہوتی ہے ورنہ اپنے زمانے کے معیار کی رو سے وجہی کا کلام صاف اور سلیس ہے اور اس میں تصنع نام کو بھی نہیں۔ ملاحظہ ہو دل دے بیٹھنے پر مشتری کا کیا حال ہوتا ہے:

صورت شہ کی تل تل نجھانے لگی کھڑے قد پہ بلہار جانے لگی
دیک اس نقش کوں نار حیران تھی سو سُد بُد گنوا سب پریشان تھی
نہ ان بھاؤتا تھا نہ پانی اسے ہوئی تلخ سب زندگانی اسے
وہی نقش تن تھا وہی نقش من وہی نقش پانی وہی نقش ان
قطب جیوں قطب ٹھار پر تھیر ہے وہاں مشتری پھرتی چو پھیر ہے[۲۲۴]

محمد قلی کے فراق میں مشتری کی زبان سے کیا برجستہ شعر کہلوائے ہیں:

کہاں ہے وہ شہ نرملا نوجواں کہاں ہے وو شہ گنونتا گن ندھاں
کہاں ہے وو لالن مٹھی چال کا کہاں ہے وو ساجن لنبے بال کا
کہاں وو چتر چنچلا من ہرن کہاں وو سگھڑا چپلا ہے سجن
ہوئے جل کجل نین دیدار باج یکیلی کدھاں لگ رہوں یار باج
رتن تھے سو تن پر انگارے ہوئے کہ مکھ چاند انجھو سو تارے ہوئے[۲۲۵]

وجہی کو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ وہ عربی فارسی الفاظ کو بھی ہندی لب و لہجے میں ڈھال کر انھیں اپنے اندازِ بیان سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ محمد قلی، اپنی محبوبہ کو دکن چلنے کے لیے کہتا ہے اور اپنے وطن کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے:

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں پنچ فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہے لگ

---

۲۲۴ مثنوی قطب مشتری، حوالہ ماسبق، ص ۷۷

۲۲۵ ایضاً

دکھن ملک نوں دھن عجب ساج ہے — کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے
دکھن کوں جو دیکھے گی اے نارتوں — نہ کرسی کدھیں یاد بنگالے کوں
دکھن ملک بھو تیج خاصا رہے — تلنگانہ اس کا خلاصا اہے(۲۲۶)

تاریخی حیثیت

اس مثنوی کو پڑھ کر خیال گزرتا ہے کہ اس میں عشق و محبت کے جو واقعات افسانوی رنگ میں پیش کیے گئے ہیں، وہ محمد قلی کی عاشق مزاجی کے عین مطابق ہیں اور ان کا در پردہ تعلق محمد قلی اور بھاگ متی کے تاریخی عشق سے ہے۔ اس ضمن میں مولوی عبدالحق کہتے ہیں: ”ممکن ہے ایسا ہو، لیکن کتاب سے اس کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔ مثنوی میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں بھاگ متی کے عشق سے ان کا کوئی تعلق نہیں پایا جاتا۔ وجہی کا مقصد اس مثنوی کے لکھنے سے بادشاہ کے حسن و جمال، شجاعت اور لیاقت کی تعریف کرنا ہے اور بس“۔

بھاگ متی کا ذکر ابوالفضل نے ”اکبرنامہ“ میں اور فیضی نے ”لطیفہ فیاضی“ میں خود محمد قلی کی زندگی میں کیا۔ فیضی اکبر اعظم کا خاص مشیر کار تھا اور شہنشاہ کو دکھن کے حالات سے مطلع کرنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ یہاں سے اس نے موقع بہ موقع رازدارانہ طور پر جو عرضداشتیں اکبر کو بھیجیں، ان کا مجموعہ ”لطیفہ فیاضی“ کے نام سے اسی زمانے میں مرتب ہوا تھا۔ اس کا جو نسخہ حیدر آباد کے سنٹرل ریکارڈز آفس میں ہے اس کے صفحہ ۱۶ پر یہ عبارت ملتی ہے:

”محمد قطب الملک مذہب تشیع دارد و معمورہ ساختہ و عمارات پرداختہ بھاگ نگر بنام بھاگ متی کہ فاحشہ کہنہ و قدیم اوست“۔(۲۲۷)

فیضی کے دس بارہ برس بعد فرشتہ نے اپنی تاریخ میں بھاگ متی کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

---

۲۲۶ مثنوی قطب مشتری، حوالہ ماسبق، ص ۱۰۰

۲۲۷ بحوالہ ڈاکٹر زور، بھاگ متی اور بھاگ نگر، مشمولہ نذر محمد قلی قطب شاہ، حیدر آباد ۱۹۵۸ء، ص ۲۱۸

"آں قطب فلک اجلال در اوائل پادشاہی بر فاحشہٗ بھاگ متی عاشق شدہ، ہزار سوار ملازم او گردانیدہ، تابطریق امرائے کبار بہ دربار آمد و شدمی نمودہ باشد"۔(۲۲۸)

محمد قلی کے کلام میں بھاگ متی سے اس کے گہرے تعلق خاطر کے اشارے مل جاتے ہیں۔ جلوہ، بارہ پیاریوں اور بعض دوسری نظموں میں بھاگ متی کا صریحاً ذکر کیا گیا ہے۔(۲۲۹)

ان شواہد کی موجودگی میں ڈاکٹر زور کا مندرجہ ذیل بیان مثنوی قطب مشتری اور بھاگ متی کے تعلق کی گتھی کو بخوبی سلجھا دیتا ہے:

"محمد قلی نے بھاگ متی کو خود ہی حیدر محل کا خطاب دیا تھا۔ یہ اشارہ تھا اس کی اس خواہش کی طرف کہ اس کی محبوبہ کو اس کے اصلی نام سے کوئی یاد نہ کرے اور صرف خطاب یاد رکھے۔ اسی مصلحت سے تو اس نے اپنے شہر کا نام بھاگ نگر سے حیدر آباد بدل دیا تھا۔

(محمد قلی کا جانشیں) محمد قطب شاہ بہت بڑا زاہد اور متقی بادشاہ تھا جس نے مکہ مسجد کا سنگ بنیاد رکھا اور جس کی تہجد کی نماز بھی کبھی قضا نہیں ہوئی تھی۔ اس بادشاہ نے اور اس کے استاد حضرت میر محمد مومن نے مسلسل یہ کوشش کی کہ حیات بخشی بیگم ملکۂ سلطنت کی والدہ بھاگ متی حیدر محل کے بارے میں لوگ تذکرہ نہ کیا کریں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی کہ فیضی اور فرشتہ نے اسے فاحشہ لکھ دیا تھا۔

اس واقعے کی پردہ پوشی کرنے کے لیے قطب شاہی عہد میں اتنے جتن کیے گئے کہ درباری شاعر ملاوجہی سے ایک مثنوی بطور خاص بھاگ متی کی وفات ۱۰۱۷ھ کے بعد لکھوائی گئی، جس میں اصل واقعے کو کچھ اس طرح بدل دیا گیا کہ

---

۲۲۸ تاریخ فرشتہ، ج دوم، ص ۱۷۳

۲۲۹ محمد قلی قطب شاہ، کلیات ص ۹۰، ۱۶۱، ۱۶۴، ۲۱۷، ۲۵۷، ۲۶۸ اور ۳۱۲

(لوگ) اس کے مطالعہ اور اس سے نتیجہ اخذ کرنے میں اب تک غلطاں و پیچاں ہیں"۔(۲۳۰)

مثنویات چندر بدن و مہیار

یہ ایک دکنی مثنوی ہے جس کا مصنف مقیمی ہے۔ منجملہ دوسرے اشعار کے جن میں شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے، دو یہ ہیں:

شرح ست مقیمی پرت پیار کا　　قصہ کہہ توں پورا سو مہیار کا
دنیا تو فنا ہے مقیمی سبھی　　رہے گی بچن کی نشانی یہی

اس مثنوی کا سنہ تصنیف معلوم نہیں اور زمانہ تصنیف کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ ڈاکٹر زور اسے ۱۰۳۵ھ اور ۱۰۴۸ھ کے درمیانی عرصے کی تصنیف بتاتے ہیں۔(۲۳۱) نصیرالدین ہاشمی نے اس کا زمانۂ تصنیف ۱۰۳۷ھ سے ۱۰۵۰ھ تک کا لکھا ہے۔(۲۳۲) حکیم شمس اللہ قادری نے لکھا ہے کہ مقیمی نے اسے ۱۰۹۸ھ میں نظم کیا ہے اور تاریخ اس طرح بیان کی ہے:

صدی بارہویں میں تھے کم سال دو　　لکھیا نظم کوں میں نے باطرز نو(۲۳۳)

مثنوی کے مطبوعہ متن میں یہ شعر ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ مثنوی چونکہ اپنے زمانے میں بہت مقبول تھی، اس کے قلمی نسخے ہندستان اور یورپ کے کتب خانوں میں بکثرت ملتے ہیں۔ "مجلسِ اشاعت دکنی مخطوطات" نے اس مثنوی کو محمد اکبرالدین صدیقی کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۵۶ء میں

۲۳۰　نذر محمد قلی قطب شاہ، ص ۲۱۹

۲۳۱　ادارہ ادبیات جلد اول، ص ۳۸، نیز اردو شہ پارے، ص ۳۷۔۳۹

۲۳۲　یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۲۱۰، دکن میں اردو۔ طبع ثالث میں ص ۱۲۶ پر، ۱۰۵ فہرست سالار جنگ میں صرف ۱۰۴۸ھ، ص ۵۸۸

۲۳۳　اردوے قدیم، نول کشور ایڈیشن، ص ۹۴

حیدر آباد سے شائع کردیا ہے۔ مقدمہ ۳۷ اور متن ۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

مقیمی کی شخصیت کا تعین ہنوز نہیں ہو سکا۔ دکن میں مندرجہ ذیل چار شخصیتیں مثنوی کے زمانۂ قرین قیاس میں ایسی ہو گزری ہیں، لفظ مقیم جن کے نام کا حصہ تھا:

۱۔ میرزا محمد مقیم استر آبادی جو محمد عادل شاہ کے دور کا فارسی شاعر تھا۔

۲۔ مقیم مشہدی، مرتضیٰ نظام شاہ کے عہد کا امیر جو ملا محمد رضا مشہدی کا لڑکا تھا۔

۳۔ میرزا محمد مقیم سلمی، دور محمد عادل شاہ کا فارسی شاعر۔

۴۔ ملا محمد مقیم جو عبداللہ قطب شاہ کے دور کا امیر تھا۔

ڈاکٹر زور میرزا محمد مقیم استر آبادی کو مثنوی چندر بدن کا مصنف قرار دیتے ہیں۔[۲۳۴] ان کا بیان ہے کہ "احوال بادشاہان بیجاپور" میں اس کے فارسی اور اُردو کلام کا تذکرہ موجود ہے۔ نصیر الدین ہاشمی بھی ان کے ہم خیال ہیں۔[۲۳۵] محمد اکبر الدین صدیقی ان چاروں کو ایک ہی شخص سمجھتے ہیں اور ان کا بیان ہے کہ میرزا محمد مقیم استر آبادی نہیں بلکہ مشہدی تھا۔[۲۳۶] وہ فارسی کے علاوہ دکھنی زبان میں بھی شعر کہتا تھا اور مثنوی چندر بدن اسی کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد ان سے متفق نہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اوپر جو نام درج کیے گئے ہیں، ان میں سے نمبر ۱ اور نمبر ۳ کے ایک ہونے کے امکانات ہیں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ان میں سے کوئی دکھنی اُردو میں شعر کہتا ہو اور مقیمی تخلص کرتا ہو۔ میرزا محمد مقیم استر آبادی جس کا ذکر "فتوحاتِ عادل شاہی" میں آیا ہے، ابراہیم عادل شاہ کے دور کا شاعر نہیں اور اسے مقیمی قرار دینے کے قرائن بہت ضعیف ہیں۔[۲۳۷]

---

۲۳۴ ادارہ ادبیات جلد اوّل، ص ۳۷

۲۳۵ دکن میں اردو، طبع ثالث، ص ۱۲۶

۲۳۶ مثنوی چندر بدن و مہیار۔ مطبوعہ ص ۱۳ (مقدمہ)

۲۳۷ اردو ادب دسمبر ۱۹۵۷ء، ص ۵۲۔۶۳

گارساں دتاسی نے "تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی" میں مثنوی چندر بدن کے قلمی نسخوں کا ذکر کرتے ہوئے نسخہ توپ خانہ لکھنؤ کے مصنف کا پورا نام "محمد مقیم خاں" لکھا ہے۔(۲۳۸) لیکن اشپرانگر نے توپ خانہ کے جس نسخے کا ذکر کیا ہے، اس کے مصنف کا نام محض "مقیمی" بتایا ہے۔(۲۳۹) بہر حال دتاسی واحد راوی ہے جس نے مثنوی چندر بدن کے مصنف کے پورے نام کی اطلاع دی ہے چونکہ مقیمی کی اصلیت کے بارے میں ابھی تک بحث چلی آرہی ہے، گارساں دتاسی کی یہ اطلاع اس سلسلے میں اہم ہے۔

قصہ

شہر سندرپٹن کی شہزادی چندربدن حسن و جمال میں سر آمدِ روزگار تھی۔ سالانہ میلے کے موقع پر مہیار نامی ایک مسلمان سوداگر اس پر عاشق ہو گیا اور آگے بڑھ کر معشوق سے اپنی بے قراری کا اظہار کر دیا۔ لیکن چندربدن نے مطلق التفات نہ کیا۔ مہیار نے انجم نگر کے بادشاہ کی وساطت سے چندربدن کے والدین سے درخواست کی جسے انھوں نے رد کر دیا۔ دوسرے برس میلے کے موقع پر وہ پھر چندر بدن کے قدموں میں گرا اور بڑی عاجزی اور فروتنی سے محبت کا اظہار کرنے لگا۔ چندربدن نے درشت لہجے میں کہا: کمبخت، تو ابھی زندہ ہے۔ یہ سنتے ہی اس عاشق نامراد نے وہیں جان دے دی۔ مہیار کا جنازہ جب محبوب کے دروازے کے سامنے سے گزرنے لگا تو آگے نہ بڑھ سکا۔ معشوق کو جب اس کا علم ہوا تو غسل کر کے اس نے کلمہ پڑھا اور پاک و صاف چادر اوڑھ کر سو گئی۔ جنازہ قبرستان پہنچا اور دفن کرنے کے لیے جب تابوت پر سے چادر ہٹائی گئی تو دیکھا کہ عاشق و معشوق دونوں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ انھیں علاحدہ کرنے کی کوشش کی گئی مگر بے سود۔ آخر دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا۔

---

۲۳۸ تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی جلد دوم، ص ۳۹۱، بحوالہ بلوم ہارٹ انڈیا ص ۵۳

۲۳۹ اشپرانگر نمبر ۶۷۱

تاریخی حیثیت

اس قصّے کی تاریخی حیثیت مشتبہ ہے۔ دکھنی مورخوں میں صرف قاضی سید نوراللہ نے اپنی کتاب "تاریخ عادل شاہیہ" اور ان کے بعد شاہ تجلی علی تجلی نے اپنی تاریخ "توزک آصفیہ" میں اس قصّے کی اصلیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ یہ واقعہ ابراہیم عادل شاہ (۹۸۸۔۱۰۳۷ھ) کے دور کا ہے جو بمقام کدری کوٹہ پیش آیا۔ انھوں نے خود کدری کوٹہ میں یہ قبر دیکھی اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں چندر بدن اور مہیار دفن ہیں۔[۲۴۰]

نصیرالدین ہاشمی کا بیان ہے کہ "علاقہ مدراس کے ایک قصبے میں ان دونوں کی قبر موجود ہے اور زیارت گاہ عام ہے"۔[۲۴۱] اکبرالدین صدیقی لکھتے ہیں کہ "یہ مقام مدراس سے شمال مغرب میں ۸۰ میل دور آج بھی موجود ہے"۔[۲۴۲]

قصے کی اصلیت خواہ کچھ بھی ہو، اس کے خاتمے میں جو فوق الفطرت عنصر ملتا ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ پدماوت اور دوسری نیم تاریخی لوک کہانیوں کی طرح اس میں بھی زیبِ داستاں کے لیے بعد میں بہت کچھ بڑھا دیا گیا اور واقعہ کچھ کا کچھ ہوگیا۔ بعض اوقات چھوٹے بیج سے بہت بڑا درخت اسی طرح پیدا ہوتا ہے۔

تبصرہ

مقیمی کے کلام میں وہ شگفتگی، جزالت اور زور نہیں جو غواصی، نصرتی اور ابن نشاطی کے ہاں پایا جاتا ہے۔ وہ قصّے کو سیدھے سادے طور پر بیان کرتا ہے اور کسی بات کو پیچیدہ بنا کر طول دینے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کا اندازِ

---

۲۴۰ بحوالہ مقدمہ مثنوی چندر بدن و مہیار، ص ۳۴

۲۴۱ دکن میں اردو، طبع ثالث ص ۱۲۶

۲۴۲ مقدمہ مثنوی چندر بدن و مہیار، ص ۳۵

بیان تصنع سے پاک اور فطری ہے۔ صاف، آسان اور سہل زبان میں وہ ادائے مطلب پر قادر ہے۔ مہیار چندربدن کے عشق میں گرفتار ہونے کے بعد اس سے یوں خطاب کرتا ہے:

نزک جا کے بولیا کہ سُن اے پری ۔۔۔ مجے تجہ لطافت دیوانہ کری
دیوانہ ہوں تیرا، دیوانے کے تیئں ۔۔۔ آپس تے نہ کر دور جانے کے تیئں
سو تج بن مجے کوئی ہونا نہیں ۔۔۔ کہ بن جل مچھی کا سوجینا نہیں
کہتا ہوں تجے میں کہ اے گن بھری ۔۔۔ توں کرنا ایتا کچ مری دل بری
لکدمار اس کوں او ٹھی بول یوں ۔۔۔ سج کچ اپس کوں اے بے ڈول توں
کہاں میں چندرماں کہاں تو دیوا ۔۔۔ کتا کیا موے توں دیوانہ ہوا(۲۴۳)

جب جنازے کو قبر میں اُتارنے لگے تو عالم ہی دوسرا نظر آیا:

ہوا جیوں عمل سب قبر کا تمام ۔۔۔ اٹھیا دفن کرنے کوں شہ نیک نام
جو دیکھیا جنازے میں مہیار کوں ۔۔۔ تو اس جفت مل کر سواس نار سوں
کفن بیچ آکر او چندر بدن ۔۔۔ گلے لگ کے سوتی ہے جو ایک تن
جدا ان کو ہر چند کرنے منگے ۔۔۔ کہ دونوں کوں دو ٹھار دھرنے منگے
نہ کیتے اپس میں جدائی پذیر ۔۔۔ کہ تھے عاشقاں میں یو دو بے نظیر(۲۴۴)

چندربدن اور مہیار کا قصہ بعض دوسرے شاعروں کا بھی پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ فارسی میں یہ تین بار لکھا گیا۔ سب سے پہلے اسے آتشی نے غالباً مقیمی کے بعد تصنیف کیا۔ مؤلف توزک آصفیہ نے آتشی کی مثنوی کے چند اشعار نقل کیے ہیں۔ دوسری فارسی روایت ایک شاعر عشق کی ہے جس کا ذکر بعد کے ایک شاعر چندہ حسینی واقف عرف پیراں صاحب بیجاپوری نے اپنی اُردو مثنوی "چندربدن و مہیار" میں کیا ہے۔ فارسی کا تیسرا نسخہ حکیم مرزا قاسم

---

۲۴۳ مثنوی مقیمی، حوالہ ماسبق

۲۴۴ ایضاً

علی بیگ اخگر کا ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔[245] مثنوی چندر بدن فارسی کا چوتھا نسخہ میرزا یار بیگ یار کا ہے۔ شفیق اورنگ آبادی نے یار اورنگ آبادی (متولد ۱۱۴۶ھ) کے ترجمے میں لکھا ہے: ''قصہ چندر بدن و مہیار کہ بزبان دکن بود بفارسی نظم نمود''۔[246]

پنجابی زبان میں قصہ چندر بدن کو امام بخش نے نظم کیا۔ یہ نسخہ اُردو رسم الخط میں لاہور سے ۱۸۷۴ء میں شائع ہوا۔[247] اُردو نثر میں اسے ریاض الدین احمد نے منتقل کیا۔[248] قصہ چندر بدن، اُردو منظوم کا ایک مجہول المصنف نسخہ لاہور سے ۱۸۷۵ء میں ۲۴ صفحات پر شائع ہوا۔[249] اس کا دوسرا ایڈیشن بھی لاہور ہی سے ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا۔[250]

مقیمی کی مثنوی کے علاوہ اُردو میں چندر بدن اور مہیار کے قصّے پر مبنی پانچ دوسرے شاعروں کی مثنویاں بھی ملتی ہیں۔ اس قصے کے بارے میں عبدالقادر سروری نے صحیح لکھا ہے: ''اس کا مقصد مذہبِ اسلام کی عظمت ظاہر کرنا تھا۔ دکن میں ایسی کئی قبریں ملتی ہیں، جن پر دو تعویذ بنے ہوئے ہیں''۔[251] چندر بدن اور مہیار ہی کے قصّے پر بس نہیں، اس مقصد کے لیے کئی دوسرے قصّے بھی گھڑ لیے گئے اور انھیں سچا واقعہ بیان کیا جانے لگا۔ ان مثنویوں کے متعلق ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی کا بیان ہے کہ ''تبلیغِ اسلام کے لیے یہ بھی ایک طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ مثنوی کا ہیرو مسلمان ہوتا اور ہیروئن ہندو۔

---

۲۴۵ مقدمہ مثنوی چندر بدن، حوالہ ماسبق

۲۴۶ گل رعنا قلمی، ورق الف ۵۵۰

۲۴۷ انڈیا پنجابی، ص ۱۸، نیز پنجابی کتب برٹش کالم ۲۲

۲۴۸ فہرست کتب خانہ، ص ۶۴

۲۴۹ انڈیا مطبوعات ص ۱۶۰

۲۵۰ ایضاً

۲۵۱ اردو مثنوی کا ارتقا، ص ۴۹

دونوں میں قصّے کے دوران میں مذہب اور معاشرت کی برتری پر بحث ہوتی۔ آخرکار ہیروئن اپنا مذہب ترک کر کے مشرف بہ اسلام ہو جاتی"۔[۲۵۲]

ذیل میں ہم ایسی سولہ اردو مثنویوں کے نام پیش کر رہے ہیں جن میں ہیرو مسلمان اور ہیروئن ہندو دکھائی گئی ہے۔[۲۵۳] پہلی پانچ مثنویاں چندر بدن اور مہیار ہی کے قصّے پر مبنی ہیں۔ نمبر ۶ سے نمبر ۱۲ تک کی مثنویاں بھی دکھن و گجرات میں لکھی گئیں۔ چندر بدن و مہیار کے قصّے سے ماخوذ نہیں، لیکن ان کے قصّے اس سے ملتے جلتے ضرور ہیں۔ آخری چار مثنویاں شمالی ہندستان میں لکھی گئیں۔ ان میں تبلیغ کا عنصر کم ہے یا بعض میں بالکل نہیں۔ بالخصوص آخری مثنوی "سراپا سوز" میں تو رواداری اور باہمی اخوت کی فضا ملتی ہے اور مختلف مذاہب کی بنیادی وحدت پر زور دیا گیا ہے۔ ان مثنویوں کے نام یہ ہیں:

(۱) مثنوی ندرتِ عشق؛ (۲) مثنوی از واقف؛ (۳) مثنوی از بلبل؛ (۴) مثنوی از محمد عبدالقادر شاکر؛ (۵) مثنوی از سیف اللہ[۲۵۴] (یہ پانچوں مثنویاں قصہ چندر بدن و مہیار پر مبنی ہیں)؛ (۶) مثنوی مغل اور ناگرنی؛ (۷) مثنوی نازنین اور پٹھان؛ (۸) مثنوی ہیرا لال؛ (۹) مثنوی نتھو وبامنی؛ (۱۰) مثنوی طالب و موہنی؛ (۱۱) مثنوی شمعِ عشق؛ (۱۲) مثنوی بہلول صادق؛ (یہ سات دکھنی مثنویاں قصہ چندر بدن و مہیار سے ملتے جلتے قصوں پر مبنی ہیں)۔ (۱۳) مثنوی شعلہ شوق؛ (۱۴) مثنوی سوز و گداز؛ (۱۵) مثنوی دل پذیر؛ اور

---

۲۵۲ نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۴، ص ۱۰

۲۵۳ اردو نثر میں بھی اس انداز کے قصے ملتے ہیں مثلاً قصہ معظم شاہ و چتر ریکھا یا قصہ ملکہ زماں و کام کنڈلا

۲۵۴ مثنوی نمبر ۴ اور ۵ کے لیے ہماری معلومات کا ماخذ اکبر الدین صدیقی کا مقدمہ (حوالہ ماسبق) ہے۔ دتاسی نے تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی میں قصہ چندر بدن و مہیار از حیدر علی دکھنی کا ذکر کیا ہے، ص ۲۰۴ (بحوالہ قاضی عبدالودود، معاصر ۱۱، ص ۱۲۷) لیکن ہم اس کی تصدیق سے قاصر ہیں

(۱۶)مثنوی سراپا سوز (یہ چار مثنویاں شمالی ہندستان میں لکھی گئیں۔ ان میں بھی ہیرو مسلمان اور ہیروئن ہندو ہے)۔ اب فرداً فرداً ان سولہ مثنویوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

قصۂ چندر بدن پر مبنی مثنویاں

مثنوی ندرت عشق

اس مثنوی میں ایک دکھنی شاعر محمد باقر آگاہ نے چندر بدن و مہیار کا قصہ بیان کیا ہے۔ مثنوی کا سالِ اختتام ۱۲۱۴ھ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں[۲۵۵] اور دوسرا کتب خانہ انجمن ترقی اردو میں محفوظ ہے۔[۲۵۶]

آگاہ نے قصے میں تصوف بھی شامل کردیا ہے۔ زبان نسبتاً عام فہم اور انداز بیان دلنشیں ہے۔ چندر بدن کی تعریف میں یہ شعر ملاحظہ ہوں:

اگر نکلے وہ غیرتِ ماہتاب	شبِ تار میں سیر کو بے نقاب
چکوروں کو ہو چاندنی کا خیال	ہو موروں کا بجلی سے آشفتہ حال
سُنے رس بھری بات اس کی اگر	تو سب رس ہو تلخی سے جگ میں سچر[۲۵۷]
تھی ناگن کچھ ایسی وہ زلف رسا	کہ جی سے گیا جس کو اس نے ڈسا[۲۵۸]

مثنوی از واقف

واقف کا پورا نام بابا چندہ حسینی واقف عرف پیراں صاحب ہے۔ وہ بیجاپوری شاعر تھا اور اس نے یہ قصہ ۱۲۲۷ھ میں نظم کیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ

---

۲۵۵ سالار جنگ، ص ۶۷۳

۲۵۶ مثنویات ۲۶

۲۵۷ سچر بہ معنی مشہور

۲۵۸ ندرت عشق قلمی نسخہ انجمن، مثنویات، ص ۲۶

کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔[۲۵۹] مصنف نے صراحت کردی ہے کہ اس نے یہ قصہ آگاہ کی دکھنی اور عشق کی فارسی مثنوی سے اخذ کیا۔ مگر واقف کی مثنوی دوسروں کی نسبت بہت طویل ہے۔ مثلاً چندر بدن کے سراپا ہی پر واقف نے ۱۰۷ شعر لکھ دیے ہیں۔ نمونہ :

کہ ایسے میں وہاں سے آئی دلبر	نکل جیوں ابر سے خورشیدِ انور
جو دیکھا حسن کا آتا ہے بوٹا	وہ جیسا شمع پر پروانہ ٹوٹا
گرا اس کے قدم پر جاکے اک بار	نہایت عاجزی کے ساتھ مہیار
کہا قدموں پہ گر "عاشق ہوں تیرا	کہ تجھ پر جان و دل قربان میرا"

مثنوی از بلبل

یہ آتشی کی فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ادارۂ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں ہے۔[۲۶۰] سنہ تصنیف معلوم نہیں اور شاعر کے حالات بھی تاریکی میں ہیں۔ ڈاکٹر زور کا بیان ہے کہ یہ مثنوی مقیمی کے بہت بعد لکھی گئی ہے۔ اس کی زبان زیادہ قدیم نہیں۔ یہ مثنوی شاعرانہ تخیل اور لطافت کے اعتبار سے بھی مقیمی کی مثنوی سے بہتر ہے۔ ملاحظہ ہو مہیار کے اظہار عشق کرنے پر چندر بدن یوں نغمہ بار ہوتی ہے :

قدم سوں اُس کے سرکوں مار ٹھوکر	کہی بکتا ہے کیا دیوانہ ہوکر
کہاں میں چاند ہوں ہور تو دیوا ہے	موے دیوانہ بے ہودہ ہوا ہے
نہیں ہے تاب ذرہ وصل خورشید	کرے کیا قطرہ با دریائے اُمید
یہ کہہ کر اس کے سر کو مار ٹھوکر	کرشمہ ناز ہور غمزے میں ہوکر

---

۲۵۹ سالار جنگ، ۵۸۵

۲۶۰ ادارہ ادبیات ج اول، ص ۳۹ اور آصفیہ ج ۳، ص ۶۳۶

پری پیکر رُخ نیکو شمائل	کری مہیار کوں غمزے سوں گھائل[۲۶۱]

مثنوی از شاکر

حاجی شیخ محمد عبدالقادر شاکر رئیس وانم باڑی (مدراس) نے بھی اس قصّے کو مثنوی کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہ مثنوی "قصۂ گلزارِ شاکر" کے نام سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس مثنوی میں مذہبی مباحث اور تصوف کا عنصر زیادہ ہے۔ سبب تالیف میں شاعر نے بتا دیا ہے کہ اس نے اپنی مثنوی کی بنیاد باقر آگاہ کی مثنوی (ندرت عشق) اور ایک "پرانی کتاب" (غالباً روایت مقیمی یا آتشی) پر رکھی۔ شاکر کا اندازِ بیان شگفتہ اور اشعار شیریں ہیں:

اس کے بعد آئی وہاں چندر بدن	گلبدن، غنچہ دہن، رشک چمن
زعفرانی رنگ اور زریں لباس	ان لباسوں پر عجب پھولوں کی باس
وہ مہادیوی کے آگے شاد شاد	مانگتی تھی عجز سے اپنی مراد
پا کے بو چندربدن کی ماہیار	ہو کے آیا پاس اس کے بے قرار
فرطِ الفت سے لپٹ کر رو دیا	کچھ جھجک کر اس سے ہٹ کر رو دیا
قہر سے چندربدن نے یہ کہا	"اے موے چل کیا تو دیوانہ ہوا"

مثنوی از سیف اللہ

سیف اللہ نے بھی اپنی مثنوی میں کم و بیش وہی باتیں بیان کی ہیں جو دوسروں کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ اس مثنوی کے بارے میں غلام یزدانی صاحب نے اپنے مضمون مطبوعہ رسالہ ساقی میں مفصل تبصرہ کیا تھا۔ ان کا مملوکہ نسخہ ناقص الآخر ہے اور موجودہ حالت میں اشعار کی کل تعداد ۸۷۹ ہے۔ سیف اللہ چندربدن کی تعریف میں یوں رطبُ اللّساں ہے:

---

۲۶۱ ادارہ ادبیات، ج اول، ص ۴۰

سندر، ساوری، مست، جوبن بھری　　شگفتہ جبیں، شیر دل، من بھری
دو زلفاں اسے بانکی کالیاں　　نین مرگ سی مست، متوالیاں
غضب ناک اور چست و چالاک تر　　نپٹ اچپلی، شوخ، بے باک تر
پوتر رہی پوجا اور پاٹ میں　　رکھے گیان کا دھیاں دن رات میں

قصۂ چندر بدن اور مہیار سے ملتی جلتی مثنویاں

مثنوی مغل اور ناگرنی

اس مثنوی کا ذکر ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی نے گجرات کی مثنویوں کے ضمن میں کیا ہے۔ اس کا قصہ یوں ہے: ایک مغل زادہ کسی ناگر عورت پر فریفتہ ہوگیا۔ حبشی غلام کے ذریعے نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے تو ناگر عورت ٹالتی رہی، جب مغل زادے کے عشق کا یقین ہوگیا تو وہ اس شرط پر شادی کے لیے رضامند ہوگئی کہ وہ دریا میں کودے گی۔ اگر مغل زادہ اسے بچالے تو وہ اس کی ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آخر ناگر عورت مسلمان ہوگئی اور دونوں ایران چلے گئے۔

اس مثنوی کا مخطوطہ کسی شخص صبغۃ اللہ نے بمقام رادھنپور (گجرات) میں ۱۲۵۴ھ میں لکھا۔ اس سے مصنف اور سنہ تصنیف کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ زبان کی قدامت سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ مثنوی بارہویں صدی ہجری کے نصف اول میں لکھی گئی ہوگی۔

مثنوی کے کرداروں کی مناسبت سے دکھنی اردو کے علاوہ فارسی اور گجراتی کا استعمال بھی کیا ہے۔ ناگر عورت کو دیکھتے ہی مغل زادے کی یہ حالت ہوتی ہے:

ناگری بھاؤ سیں گاگری لیتے لٹ لٹکتے چال سیں آئی
دیکھتے ہی مغل گھیر کھا پڑا رونہہ رونہہ میں نیہہ بندھائی

اپنے حبشی غلام کو قاصد بنا کر بھیجتا ہے:

بشنو عنبر من بگویم بائی کے جاگے تمکوں راکھا
یک سخن برساں مجہ غریب اصفہاں کا

ناگرنی قاصد کی باتیں سُن کر کہتی ہے:

ہینڈ پرو موؤ دیستو رہ کہیں کالو مونڈ ہوئی نے آوو
(پرے ہٹ کہاں سے یہ کالا منہ لے کر یہاں آیا)
کیا نومگل، کیا نوویڑو، کیائی وات توں ایوی لیا دو
(کہاں کا مغل، کون سا وقت، کہاں کی بات تو ایسی لایا)(۲۶۲)

مثنوی نازنین اور پٹھان

اس مثنوی کا قصہ بھی گزشتہ مثنوی سے ملتا جلتا ہے۔ مصنف کے بارے میں کوئی معلومات نہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ حامد تخلص کرتا تھا۔ یہ مثنوی غالباً ۱۲۰۱ھ - ۱۲۱۰ھ کے لگ بھگ لکھی گئی۔ قصے کی داخلی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو نازنین اور پٹھان کا یہ قصہ سورت کے ایک نواب متصدی تیغ بیگ خاں (۱۱۲۵-۱۱۴۹ھ) کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔(۲۶۳) ڈاکٹر محمد باقر کا بیان ہے کہ قصے میں کل ۲۷۳ اشعار ہیں جو ۲۶ صفحوں پر پھیلے ہوئے ہیں(۲۶۴) حامد کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

دیوانا ہوا دیکھ اس کا جمال نہ دیکھی تھی جگ میں اسی کی مثال
پٹھان اپنے دل میں کیا یہ فکر کہ اس نازنیں سے کروں کچھ ہنر

۲۶۲ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۲ء، ص ۱۹
(یہ اشعار مثنوی کی بحر میں نہیں ہیں)

۲۶۳ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، حوالہ ماسبق جولائی ۱۹۵۲ء، ص ۶

۲۶۴ اردو جولائی ۱۹۵۶ء، ص ۲۸۷

اسی وقت وہ نار نہا کے چلی   اندر اس جواں کے لگی تلملی(۲۶۵)

مثنوی قصہ نازنین و پٹھان کا ایک مطبوعہ نسخہ کتب خانہ انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے۔ یہ قصہ علی خاں کے منظوم تمبولن اُردو اور عاجز کی مثنوی لال و گوہر کے ساتھ گجراتی رسم الخط میں بمبئی سے ۱۸۷۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شاعر کا نام حامد علی درج ہے۔(۲۶۶)

مثنوی ہیرا لال

یہ مثنوی گجرات کے ایک شاعر پربین (پروین) سے منسوب کی گئی ہے۔ مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۲۱۶ھ ہے اور یہ ۱۳۷ اشعار پر مشتمل ہے۔

قصہ یوں ہے کہ گجرات میں ریواندی کے کنارے نادوت قصبے میں ہیرا نامی ایک عورت رہتی تھی۔ ایک روز وہ ندی سے پانی بھرنے گئی جہاں اس پر قصبہ ڈھبوئی کے ایک پٹھان کی نظر پڑی جو اسے دیکھتے ہی فریفتہ ہوگیا۔ ہیرا نے پٹھان کو بُرا بھلا کہا اور ڈرایا دھمکایا۔ اثنائے گفتگو میں مذہبی بحث چھڑ گئی۔ پٹھان نے اسلام کی خوبیاں بیان کیں اور ہیرا نے اپنے مذہب کے محاسن بتائے۔ بالآخر ہیرا لاجواب ہوگئی اور پٹھان کے ساتھ ڈھبوئی چلی گئی، جہاں قاضی نے دونوں کا عقد کردیا۔

اس مثنوی میں ایک جدت یہ برتی گئی ہے کہ ہیرو کی زبان اُردو ہے اور ہیروئن کی گجراتی۔ وہ پٹھان کو دھتکارتے ہوئے کہتی ہے:

سی کو کو کرے چھے مارا کان ماں   جسے آبرو تاری ایک آن ماں
(کیا بک رہا ہے میرے کان میں   جائے گی آبرو تیری ایک آن میں)

پٹھان جواب دیتا ہے:

---

۲۶۵ ایضاً، ص ۲۸۸

۲۶۶ انڈیا مطبوعات، ص ۱۶۳

تیرے بن مجھے کچھ سو بھاتا نہیں　　تجھے اب لیے بن سو جاتا نہیں(۲۶۷)

مثنوی نتھو و بامنی

یہ مثنوی ایک غیر معروف گجراتی شاعر حاجی محمد کی تصنیف ہے جو ۱۲۹۰ھ میں بمبئی سے شائع ہوئی۔ اس میں منگرول ریاست کاٹھیاواڑ کا ایک قصہ بیان کیا گیا ہے۔ منگرول کے حاکم کا ایک سپاہی نتھو ایک بامنی پر عاشق ہو گیا۔ بامنی نے التفات نہ کیا۔ دونوں نے اپنی اپنی مذہبی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی اور مدتوں بحث و تکرار ہوتی رہی۔ آخر تنگ آکر بامنی نے کہا کہ اگر تو عاشقِ صادق ہے تو میری خاطر شہر کی فصیل سے کود کے دکھادے۔ نتھو نے ایسا ہی کیا۔ بامنی کا دل پسیجا اور وہ اس سے علانیہ محبت کرنے لگی۔ بامنی کے عزیز و اقارب کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ معاملہ نواب تک پہنچا۔ بامنی نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور اس کا عقد نتھو سے کر دیا گیا۔

شاعر نے صراحت کر دی ہے کہ یہ قصہ پہلے سے موجود تھا، جسے اس نے مکمل ترین صورت میں نظم کیا ہے۔ شاعر کو زبان پر قدرت حاصل ہے اور بعض جگہ ستھرے اشعار نکالے ہیں۔ بامنی کے حسن و جمال کو یوں بیان کیا ہے:

شکم اس کا سانچے میں گویا ڈھلا　　قیامت وہ قد تھا، اسی کا بلا
وہ آنکھوں میں کاجل لگا تھا غضب　　وہ رفتار اس کی قیامت غضب
عجب اس کے تن کا سبھی تھا سنجوگ　　نگہ تیر جیسی تھی بھالے کی نوک

مثنوی طالب و موہنی

اُردو میں طالب اور موہنی کے قصہء عشق کو ایک دکھنی شاعر سید محمد والہ موسوی نے نظم کیا۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ انڈیا آفس لندن میں محفوظ

۲۶۷　ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۱۰

۲۶۸　ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۱۶

ہے[۲۶۹] اور ایک حال ہی میں ادارۂ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں دستیاب ہوا ہے[۲۷۰] جسے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اپنے مقدمے کے ساتھ حیدر آباد سے شائع کردیا ہے۔[۲۷۱] اس مثنوی کے ایک مخطوطے کا ذکر اشپرانگر کے ہاں بھی ملتا ہے۔[۲۷۲]

سید محمد والہ، سید محمد باقر خراسانی کے فرزند تھے۔ عالم شباب میں لاہور اور وہاں سے دہلی آئے۔ دہلی سے نظام الملک آصف جاہ کے ساتھ ۱۱۳۷ھ میں دکن آئے۔ مختلف عہدوں پر فائز رہے اور ۱۱۸۲ھ میں بمقام ترچناپلّی فوت ہوئے۔[۲۷۳] فارسی میں صاحب دیوان تھے۔ ڈاکٹر زور نے مثنوی طالب و موہنی کے علاوہ ان کی دس اور تصانیف کی نشاں دہی کی ہے۔[۲۷۴]

والہ جس زمانے میں دکن میں وارد ہوئے، ابنِ نشاطی کی مثنوی پھولبن کا بڑا شہرہ تھا۔ یہ مثنوی انھیں پسند نہ آئی اور اسی کے جواب میں انھوں نے طالب و موہنی کا قصہ نظم کیا۔ والہ نے صراحت کردی ہے کہ اس مثنوی میں انھوں نے ایک مقامی قصّے کو بیان کیا ہے۔ اورنگ آباد اور احمد نگر کے جنوب میں موجودہ عثمان آباد کے قریب قلعہ پرینڈہ ایک تاریخی مقام تھا، وہاں ایک بوڑھے برہمن نے والہ کو طالب اور موہنی کی داستان عشق سنائی۔ والہ کے دل پر اس کا گہرا اثر ہوا اور انھوں نے اسے مثنوی کے انداز پر لکھ ڈالا۔[۲۷۵]

قصہ یوں ہے: طالب نامی ایک مسلمان نوجوان نے مہاجن کی لڑکی

---

۲۶۹ بلوم ہارٹ انڈیا نمبر ۷۲

۲۷۰ ادارہ ادبیات، جلد سوم، ص ۹۱

۲۷۱ طالب و موہنی مرتبہ ڈاکٹر زور، حیدر آباد، ۱۹۵۷ء

۲۷۲ اشپرانگر، ص ۶۴۰

۲۷۳ تذکرہ محبوب الزمن، ص ۱۱۸۵

۲۷۴ مثنوی طالب و موہنی، حوالہ ماسبق

۲۷۵ مثنوی طالب و موہنی، ص ۳۰

موہنی کو پنگھٹ پر پانی بھرتے دیکھا اور اس پر شیدا و مفتوں ہوگیا۔ اس نے موہنی کا تعاقب کیا اور مہاجن کے گھر کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ رہا اور کھانا پینا بند کردیا۔ لوگوں میں اس کے عشق و جنون کا چرچا ہونے لگا۔ تین چار روز گزرنے پر مہاجن نے اس ڈر سے کہ خون ناحق اس کے سر نہ جائے، طالب کو کھانا پیش کیا مگر طالب نے اسے چکھنے سے انکار کردیا۔ آخر لوگوں کے کہنے سننے پر مہاجن نے موہنی کے ہاتھ کھانا بھیجا جو طالب نے قبول کرلیا۔ بات بڑھتے بڑھتے شہر کے عامل تک پہنچی اور وہ بھی اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔ آخر مہاجن نے ایک چال چلی اور خبر اڑائی کہ موہنی بیمار ہے۔ کچھ روز بعد مشہور کردیا کہ موہنی مرگئی ہے اور اس کا جنازہ اٹھایا گیا۔ طالب بھی ماتم کرتا ہوا ساتھ ہولیا۔ موہنی کے اعزہ و اقربا نے لعنت ملامت کی کہ محبوب کے مرجانے کے بعد بھی تو زندہ ہے کون کہتا ہے کہ تو عاشق صادق ہے؟ غرض:

عشق میں روز اوّل سوں فدا تھا ‏ ‏ ‏ ‏ وو طالب عاشقِ صاحب وفا تھا
وو ڈولی سوں اپس کا مکھ پھرایا ‏ ‏ ‏ ‏ یہ طعنہ جب سُنا غیرت میں آیا
مرے موہنی اور اس بن میں جیوں حیف ‏ ‏ ‏ ‏ دنیا کا میں اتا پانی پیوں حیف
اپس کو بے دھڑک باولی میں ڈالا ‏ ‏ ‏ ‏ نظر آیا تمام آفاق کالا
فنا مشتاق یک غوطہ نہ کھایا ‏ ‏ ‏ ‏ گرا اور جیوں دیا سرنیں اُچایا[۲۷۶]

موہنی کو اس حادثے کی اطلاع ملی تو وہ بھی اسی کنویں میں کود کر مرگئی۔ دونوں لاشیں باہر نکالی گئیں تو باہم پیوست تھیں۔ عامل نے نماز جنازہ ادا کی اور دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کردیا۔

والہ کے لب و لہجے میں فارسی کا اثر نمایاں ہے۔ دکنی لہجہ ناپختہ ہے۔ اشعار ہموار نہیں۔ دکن کے قدیم گاؤں پرینڈہ کی تعریف ان الفاظ میں سنیے:

پرینڈا نیں جنت کی گل زمیں ہے ‏ ‏ ‏ ‏ دیکھے کیا چوکدن بستی رنگیں ہے

۲۷۶ مثنوی طالب و موہنی، ص ۴۳

گھراں وہاں کے زبس عالی بنا تھے   نگاہاں کے کمنداں نارسا تھے
وو گلشن سب در ودیوار دِستے   خیابانِ چمن بازار دستے
ہوا یوں تازگی کی باس لاتی   کہ گویا زلف کے کوچے سے آتی
ہر اِک گلشن میں تھے موزوں نہالاں   گل افشاں جیوں دل نازک خیالاں
پرینڈا یوں اتھا والہ جو دیکھا   اتا کچھ نیں رہا عالم کا لیکھا(۲۷۷)

والہ نے اپنی مثنوی ابن نشاطی کی پھولبن کے جواب میں لکھی تھی لیکن اُس کی شہرت کا عشر عشیر بھی اسے نصیب نہ ہوا۔

مثنوی شمعِ عشق

یہ مثنوی کسی شاعر انور کی تصنیف ہے جس نے اُسے ۱۲۵۹ھ میں لکھا۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں محفوظ ہے (تعداد صفحات ۹۱) اس مثنوی کا قصہ والہ کی مثنوی ''طالب و موہنی'' سے ملتا جلتا ہے یعنی ایک مسلمان لڑکا ایک برہمن لڑکی پر عاشق ہوگیا۔ بدنامی سے بچنے کے لیے لڑکی کی موت کی جھوٹی خبر مشہور کی گئی۔ عاشق نے سُنا تو گنگا میں ڈوب کر خودکشی کرلی۔ اس پر لڑکی نے بھی ایسا ہی کیا جب دونوں کی لاشیں دریا سے نکالی گئیں تو باہم پیوست تھیں وغیرہ۔(۲۷۸)

مثنوی بہلول صادق

یہ مثنوی ایک دکھنی شاعر لطفی کی تصنیف ہے۔ میر لطف علی نام اور لطفی تخلص تھا۔ درویش محمد خاں صوبہ دار برار کے نواسے تھے۔ ۱۲۰۰ھ میں انتقال ہوا۔(۲۷۹) ان کی مثنوی بہلول صادق کا واحد نسخہ انڈیا آفس لندن میں

---

۲۷۷ مثنوی طالب و موہنی، ص ۳۲

۲۷۸ بحوالہ مقدمہ مثنوی چندربدن و مہیار، حوالہ ماسبق، ص ۵۵

۲۷۹ محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن، ص ۹۷۴

ہے۔ تعداد اوراق سات۔[۲۸۰]

مثنوی کا قصہ ''چندر بدن و مہیار'' اور ''طالب و موہنی'' سے ملتا جلتا ہے۔ بہلول نامی ایک مسلمان بنارس کے گھاٹ پر اشنان کرنے والی ایک ہندو لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ نوبت دیوانگی تک پہنچی۔ آخر دریا میں کود کے مر گیا۔ لڑکی نے بھی اسی طرح جان دے دی۔ موجیں دونوں نعشوں کو ساحل پر لے آئیں تو دونوں آپس میں بغلگیر پائے گئے۔ آخر دونوں کو سپردِ آتش کرنے کے بعد ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا۔[۲۸۱]

ادبی اعتبار سے مثنوی پست اور پھیکی سیٹھی ہے۔

مثنوی شعلۂ شوق

میر تقی میر نے اس مثنوی میں پرسرام اور اس کی بیوی کا دردناک قصہ بیان کیا ہے۔ مثنوی کا آغاز عشق کی تعریف سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد پرسرام کی تصویر یوں پیش کی گئی ہے:

کہ واں اِک جواں تھا پرسرام نام — خوش اندام و خوش قامت و خوش خرام
جوانی کے گلشن کا وہ آب و رنگ — گلستاں سے کام اس کی خوبی پہ تنگ
جدھر کو وہ ٹک گرم رفتار ہو — قیامت ادھر سے نمودار ہو
سراپا میں اس کے جہاں دیکھیے — وہیں روئے مقصود جاں دیکھیے

پرس رام کو اپنے ایک چاہنے والے سے گہرا ربط و اخلاص تھا۔ اس دوران میں پرس رام کی شادی ہو گئی اور وہ اپنی بیوی کی محبت میں ایسا گرفتار ہوا کہ اپنے قدیمی عاشق کے پاس اس کی آمد و رفت کم ہونے لگی۔ عاشق نے گلہ کیا تو پرس رام نے کہا:

---

۲۸۰ بلوم ہارٹ انڈیا نمبر ۷۹

۲۸۱ یورپ میں دکنی مخطوطات، ص ۵۳۹

نہ فرصت مجھے صبح ہے اب نہ شام — طرف اس کے ہے دل کو میلِ تمام
اسے بھی مرے ساتھ اخلاص ہے — دلوں کو بہم رابطہ خاص ہے
نکلتا ہوں گھر سے جو میں ایک آن — تو پاتا ہوں جاکر اسے نیم جان
نہ دیکھے جو مجھ کو تو مرجاوے وہ — وہیں جی سے اپنے گزر جائے وہ

سننے والے نے اسے عورتوں کا مکرو فریب قرار دیا۔ چنانچہ دونوں نے مل کر امتحان لینے کی ٹھانی۔ پرس رام کی موت کی جھوٹی خبریوں ہی گھڑلی گئی کہ وہ دریا پر نہانے گیا تھا کہ ڈوب کر مرگیا۔ ایک شخص یہ خبر پرس رام کی بیوی کو سنانے کے لیے بھیجا گیا۔ اسے سنتے ہی وہ دردمند ایک آہ کے ساتھ زمین پر گری اور جاں بحق ہو گئی:

گری ہوکے بے جان وہ دردمند — ہوا شور نوحے کا گھر سے بلند
موئی غم میں اس جملہ تن ناز کے — گئی جان ہمرہ سخن ساز کے
وہ آیا جو تھا دل پریشاں گیا — کہ اس واقعہ سے پشیماں گیا
خبر لے گیا اس کنے زود تر — جو تھا درپے امتحاں بے خبر
کہ وہ رشک مہ امتحان دے گئی — محبت کے ناموس کو لے گئی

بیوی کی موت کے سانحے کے بعد پرس رام پر جنوں کی سی کیفیت طاری ہونے لگی:

جگر غم میں یک لخت خوں ہوگیا — رُکا دل کہ آخر جنوں ہوگیا
کبھو یاد کر اس کو نالاں رہے — کبھو ٹک جو بھولے تو حیراں رہے
ہوئی رفتہ رفتہ جو وحشت زیاد — لگا بھاگنے سب سے وہ نامراد
کبھو جا کے صحرا سے لاویں اُسے — کبھو روتے دریا پہ پاویں اسے

ایک دن ایک ماہی گیر نے پرس رام کو بتایا کہ رات کو دریا کے کنارے ایک شعلہ اترتا ہے اور "پرس رام"، "پرس رام" پکارتے ہوئے کناروں پر

دوڑنے لگتا ہے۔ چنانچہ چند دوستوں کے ساتھ پرس رام رات کو کشتی کی سیر کے بہانے دریا پر پہنچا۔ تھوڑی دیر کے بعد دریا کے دوسرے کنارے پر روشنی نمودار ہوئی اور:

لبِ آب وہ شعلہ جاں گداز ترٹپ کر بہت با زبانِ دراز
پکارا کہاں ہے پرس رام تو محبت کا ٹک دیکھ انجام تو
یہ بے تاب سُن کر ہوا بے قرار سفینے سے اترا بصد اضطرار
ہوا ہم دم اس آتش انگیز سے کہا اس بلائے دل آویز سے
کہ میں ہوں پرس رام خانہ خراب مرا دل بھی اس آگ سے ہے کباب
محبت تری برقِ خرمن ہوئی تری دوستی جی کی دشمن ہوئی
سخن مختصر کچھ وہ شعلہ چلا کچھ اک اپنی جاگہ سے یہ دل جلا
بہم گرم جوشی سے یک جا ہوئے کہ گزری تھی مدت بھی تنہا ہوئے
وہ شعلہ رہا ایک جا مشتعل کہے تو تسلی ہوئے جان و دل
یکایک بھڑک کر وہ جلنے لگا پھر ایدھر ادھر پھرنے چلنے لگا
کیا پاس پانی کے آکر صعود رہی روشنی سی کوئی دم نمود
پھر آگے کسی پر نہ پیدا ہوا نجانا کہ شعلہ وہ پھر کیا ہوا[۲۸۲]

پوری مثنوی درد و اثر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ میر کی طبیعت کو یاس و الم کے مضامین سے خاص مناسبت تھی۔ اس مثنوی کا قصہ ماخوذ ہے۔ لیکن میر کے سوزِ دروں کی آنچ قدم قدم پر محسوس ہوتی ہے۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کا بیان ہے[۲۸۳] کہ اس مثنوی کا قصہ میر کی اختراع نہیں۔ شوق نیموی نے اسے یادگارِ وطن میں بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں پٹنہ کا ایک مسلمان محمد حسن ایک مہاجن کی

---

۲۸۲ کلیات میر، مرتبہ عبدالباری آسی، ص ۸۹۰

۲۸۳ میر تقی میر، ص ۴۲۷

لڑکی شام سندر پر عاشق ہوگیا۔ جنوں یہاں تک بڑھا کہ معشوق کے گھر میں رسائی پیدا کرنے کے لیے وہ پنڈت بن گیا اور پرس رام نام رکھ لیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد شام سندر کی شادی کسی اور سے ہو رہی تھی اور محمد حسن پنڈت کی حیثیت سے رسوم ادا کر رہا تھا کہ گھر میں آگ لگ گئی۔ اس نے شام سندر کی جان بچائی اور بعد میں اس سے نکاح کرلیا۔ ایک سال محمد حسن چھتر کے میلے میں گیا ہوا تھا کہ شام سندر نے اس کی کشتی کے غرق ہو جانے کی خبر سنی اور اس صدمے سے مر گئی۔ محمد حسن کسی طرح ہاتھ پاؤں مار کر کنارے پر آ لگا۔ اسے شام سندر کی موت کا احوال معلوم ہوا تو ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ دوستوں نے بتایا کہ رات کو دریا کے کنارے "ایک تند و تیز روشنی آسمان سے اترتی اور 'حسن حسن' پکارتی ہے"۔ محمد حسن اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں گیا، جب شعلہ نمودار ہوا تو وہ اس کی طرف لپکا، تھوڑی دیر بعد سطحِ آب پر دو تیز و تند روشنیاں ابھریں اور حسن، شام سندر، حسن — شام سندر، کہتی ہوئی ایک دوسرے کی طرف بڑھیں، بھک سے ملیں اور بجلی کی سی چمک سے سارا دریا منور ہوگیا۔ اس کے بعد محمد حسن کی لاش کا پتا نہ چلا۔

ڈاکٹر موصوف نے شمیم رضوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ محمد حسن نے دریا میں اترنے سے پہلے اپنی صدری کی جیب میں ایک تحریر چھوڑی تھی، جسے میر کے ہم عصر تائید عظیم آبادی نے اپنے ایک خط کے ساتھ شاہزادہ جہاں دار کو بھیج دیا۔ تائید کے خطوط کا مجموعہ "زبدۃ المنشات" کے نام سے شائع ہوگیا۔ اس میں محمد حسن کے خط کی نقل موجود ہے۔[۲۸۴]

قاضی عبدالودود کا بیان ہے کہ تائید کے خطوط کا مجموعہ "ریاض المنشآت" میرے پاس تھا۔ اس میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں۔[۲۸۵] شمیم رضوی سے کراچی میں زبانی گفتگو ہوئی۔ انھوں نے تائید کی تحریر خود نہیں

---

۲۸۴ میر تقی میر، ۱۹۵۴، ص ۴۳۰

۲۸۵ معاصر ۹، ص ۱۸۳

دیکھی۔ کراچی میں مختلف اصحاب سے گفتگو کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ تائید کی کوئی تحریر ابوالعاص صاحب کے پاس نہ تھی۔(۲۸۶)

دراصل اس واقعے کی اصلیت کا تنہا ثبوت شوق نیموی کا مندرجہ بالا بیان ہے جسے انھوں نے اپنی مثنوی "سوز و گداز" کے آغاز میں بھی درج کیا ہے۔ لکھتے ہیں: "...... یہ قصہ کچھ فرضی نہیں، اصلی ہے، جس کو تقریباً ڈیڑھ سو برس گزرے ہوں گے۔ اس کی اصلیت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود وہ مرحوم عاشق اپنے حالات آپ لکھ گیا ہے جس کو تائید عظیم آبادی (المتوفی ۱۲۰۶ھ) نے اپنے خط میں بعینہٖ نقل کر کے شاہزادۂ جہاندار شاہ کے حضور میں روانہ کیا ہے۔ پھر ان کے بیٹے تمنا مرحوم نے اس خط کو زبدۃ المنشات میں درج کیا ہے۔ تائید نے اس خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ "مکان عالی شانِ آں مہاجن کے قریب چوک بود، بعد حادثہ آتش زدگی بنام آں نو عروس اشتہار یافتہ" ...... فی الواقع چوک کے قریب باڑے کے گلی کے پاس ایک چھوٹا سا محلہ سندر باڑا نام مشہور ہے جو آج تک مہاجنوں سے آباد ہے۔ واقعہ حسرت ناک و پرسوز کو ...... باقر علی خاں باقر لکھنوی مرحوم نے بھی نثر فارسی میں لکھا ہے۔"(۲۸۷)

شوق نیموی نے قصے کی جو روایت بیان کی ہے، اس کا مطالعہ اگر تاریخی شواہد کی روشنی میں کیا جائے تو وہ صحیح ثابت نہیں ہوتی۔ مثنوی شعلۂ شوق اور شوق نیموی کے بیان کیے ہوئے قصے میں جو فرق ہے وہ تفصیل کا محتاج نہیں۔ میر تقی میر (المتوفی ۱۲۲۵ھ) اور شوق نیموی (المتوفی ۱۳۲۲ھ) کے زمانے میں تقریباً ایک صدی کا بُعد ہے۔ عوامی قصے کہانیوں میں یہ بات عموماً دیکھی گئی ہے کہ تھوڑی سی مدت میں وہ کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں۔ مختلف لوگ انھیں مختلف انداز پر بیان کرتے ہیں اور بعض اوقات تو قصہ اتنا بدل جاتا ہے کہ اصل اور

۲۸۶ مکتوب قاضی عبدالودود بنام مولف

۲۸۷ دیباچہ مثنوی سوز و گداز، شوق نیموی طبع ثانی ۱۹۲۴ء، پٹنہ، ص ۲

نقل میں مطابقت دشوار ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی معاملہ اس قصے کا بھی ہے۔ شوق نیموی نے قصے کی جو روایت بیان کی ہے وہ اصل سے مختلف ہے اور یقیناً بعد کے زمانے کی ہے۔ ایک سو برس کے عرصے میں عوام کی زبان پر چڑھ کر اس قصےّ میں بہت سے افسانے ہو گئے۔ ہیرو کو مسلمان اور ہیروئن کو ہندو قرار دے کر قصے میں مذہب کا عنصر بھی داخل کر دیا گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس قصے کی اصل روایت وہی ہے جو میر نے بیان کی ہے۔[۲۸۸] باقی تمام باتیں بعد کے لوگوں نے زیب داستاں کے لیے بڑھادیں۔ شوق نیموی نے اپنے زمانے میں جس طرح لوگوں کی زبان سے اس قصے کو سنا بغیر کسی تحقیق کے اسی طرح "یادگار وطن" میں لکھ دیا اور اسے اپنی مثنوی "سوز و گداز" میں بھی بے کم و کاست نظم کر دیا۔
قاضی عبدالودود صاحب نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میر کے زمانے کی لکھی ہوئی ایک فارسی مثنوی میں بھی اس قصےّ کو تقریباً اسی طرح بیان کیا گیا ہے، جس طرح میر نے "شعلۂ شوق" میں نظم کیا ہے۔ میر کے دیوانِ اول کا قلمی نسخہ جس میں مثنوی شعلۂ شوق شامل ہے، ۱۱۹۲ھ کا مرقومہ ہے۔[۲۸۹] اس سے بہت پہلے کی لکھی ہوئی ایک فارسی مثنوی "تصویرِ محبت" (۱۱۵۶ھ کی تصنیف، نام تاریخی) کا ذکر اشپرانگر نے کیا ہے۔[۲۹۰] اس کا بیان ہے کہ اس میں رام چند کا قصہ ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کے پاس ایک بیاض ہے جس میں یہ مثنوی موجود ہے (ناقص الاول) "اس فرق کے ساتھ کہ میر نے نام پرسرام لکھا ہے اور فقیر نے رام چند۔ قصہ دونوں کے یہاں ایک ہی ہے۔ کم از کم اس حصےّ میں جو میرے پاس ہے، کوئی ایسی اہم بات جو میر کے یہاں نہ ہو

---

۲۸۸ میر کے دیوان اول قلمی مکتوبہ ۱۱۹۲ھ مخزونہ ادارہ ادبیات اردو نمبر ۴۴ میں مثنوی شعلۂ شوق کے آغاز میں یہ عبارت ملتی ہے: "آغاز قصہ جانکاہ کہ در عہد محمد شاہ در عظیم آباد پیش وضیع و شریف بہ ظہور رسیدہ بود"، میر، ص ۵۹۷

۲۸۹ ادارہ ادبیات اول، ص ۱۰۸

۲۹۰ اشپرانگر، ص ۳۹۵

نہیں ملتی"۔(۲۹۱)

مثنوی سوز و گداز

محمد ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی کی اس مثنوی کا تعلق جیسا کہ پہلے بتایا گیا پرس رام (یا رام چندر) کے روایتی قصّے سے ہے۔ شوق نیموی نے قصّے کو بالکل اسی طرح نظم کر دیا ہے، جس طرح وہ اُن کے زمانے میں مشہور تھا۔ اس میں ہیرو اور ہیروئن کا مذہب باہم مختلف بتایا گیا ہے اور اسی اختلاف کی مدد سے قصّے میں رومانی رکاوٹوں کی کشمکش کو شدید تر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شوق نیموی کی مثنوی میں محمد حسن اپنی محبوبہ کے لیے پنڈت کا بھیس بدلتا ہے، پرس رام نام رکھواتا ہے اور اشلوک از بر کر کے رامائن کی کتھا سناتا ہے:

بھرا پھر روپ اک دن برہمن کا　　جبیں پر قشقہ خوں رنگ کھینچا
گیا کنٹھی سے سوانگ اپنا نرالا　　لیا نام صنم جپنے کو مالا
حمائل دوش پر زنار ڈالی　　بغل میں ایک پوتھی بھی دبالی
بدل کر بھیس سوئے چوک آیا　　کبت سے ایک عالم کو لبھایا

میر نے شادی سے پہلے پرس رام کا تعلق کسی امرد سے بتایا ہے۔ شوق نیموی کے ہاں ایسا نہیں بلکہ قصہ محمد حسن اور شام سندر کے معاشقے سے شروع ہوتا ہے۔ شوق کے ہاں پرس رام کے ڈوبنے کا واقعہ بھی بدلا ہوا ہے۔ میر کہتے ہیں کہ پرس رام کی بیوی کی آزمائش کے لیے پرس رام کے ڈوب مرنے کی جھوٹی خبر مشہور کی گئی۔ شوق نیموی کے ہاں ایک میلے سے آتے ہوئے پرس رام کی کشتی بھنور میں پھنس کر الٹ جاتی ہے اور لوگوں کو پرس رام کے ڈوب مرنے کا مغالطہ ہوتا ہے:

حسن کچھ لوگ لے کے اپنے گھر سے　　گیا اک سال میلے میں چھتر کے

۲۹۱　معاصر ۹، ص ۱۸۴

کئی دن عیش و عشرت میں بسر کی
یکایک لہر آئی دل میں گھر کی
قدم اپنا برنگ موج اٹھایا
پہنچ کر گھاٹ پر بیڑا منگایا
سوار اس میں ہوا اسباب کے ساتھ
چلا گھر کی طرف احباب کے ساتھ
مثال کشتی دل پھٹ گئی پال
تڑپ کر رہ گئے سب بے پر وبال
حسن آغوشِ دریا میں جو آیا
بھنور نے اپنی چھاتی سے لگایا
بہت کچھ ہاتھ پاؤں اس نے مارے
تو کوسوں بہہ کے جا پہنچا کنارے
یہاں لوگوں نے اس سے ہاتھ دھویا
یہ سمجھے موجِ دریا نے ڈبویا(۲۹۲)

محمد حسن کے ڈوبنے کی خبر سنتے ہی شام سندر کے کلیجہ پھٹ کے مرجانے اور راتوں کو دریا کے کنارے روشنی اترنے کا باقی قصہ بدستور ہے۔ سارے قصے میں صرف یہی ایک واقعہ فوق الفطرت ہے اور اسی کی بنا پر قصے کی واقعیت تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے۔

مثنوی دل پذیر

اس مثنوی کا دوسرا نام "مثنویِ مہ جبیں و نازنیں" ہے۔ اسے سعادت یار خاں رنگین نے تصنیف کیا۔ اس کی تاریخ لالہ مان سنگھ نے کہی ہے جس سے مثنوی کی تصنیف کا سنہ ۱۲۱۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس کے دو مخطوطے پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ہیں،(۲۹۳) ایک انڈیا آفس میں(۲۹۴) اور ایک برٹش میوزیم(۲۹۵) میں۔ تعداد اشعار ۱۸۶۵۔

اس مثنوی میں شہزادہ مہ جبیں اور نازنیں کی محبت کا حال نظم کیا گیا ہے۔ قصے کا خلاصہ یہ ہے: بلغار کے بادشاہ خاور شاہ کو نجومیوں نے بتایا کہ

---

۲۹۲ مثنوی سوز و گداز، ۱۹۲۴، ص ۳۵

۲۹۳ مثنوی مہ جبیں و نازنیں (قلمی) بحوالہ صابر علی خاں، سعادت یار خاں رنگین، ص ۱۳۱

۲۹۴ بلوم ہارٹ انڈیا، نمبر ۲۱۱

۲۹۵ بلوم ہارٹ برٹش، ص ۴۰

تمھارے بیٹا تبھی ہوسکتا ہے جب تم کسی پری کو اپنی ملکہ بناؤ۔ بادشاہ نے حق شناس نامی زاہد او. وزیر کو ساتھ لیا اور سحر کے حصار میں پہنچا۔ یہاں اسمِ اعظم کی بدولت دیووں اور زنِ جادوگر سے مقابلہ کرنے کے بعد پری کو قبضے میں لیا جس سے ایک لڑکا مہ جبیں پیدا ہوا۔ چودہ برس کی عمر میں اس نے ایک مرقع میں کسی کی تصویر کھینچی اور بے ہوش ہوگیا۔ وزیر کے بیٹے دانشور نے مہ جبیں کے دل کا راز پالیا اور وہ دونوں مرقع والی شہزادی کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ راہ میں کئی طلسمات آئے اور ایک رانی نے شہزادے کو جادو کے زور سے مینڈھا بنا دیا۔ سراندیپ کی مہارانی ادھر سے گزری تو اس نے شہزادے کو پھر سے انسان بنایا اور دور دراز کے فاصلے طے کرنے کے لیے کچھ منتر بتائے۔ شہزادہ اور وزیر زادہ دونوں بنارس آئے۔ یہاں انھیں معلوم ہوا کہ جس حسینہ کی تلاش میں وہ خراب و خوار پھر رہے ہیں وہ کشمیر کی شہزادی ہے اور اس کا نام نازنین ہے۔ غرض یہ دونوں کشمیر پہنچے اور زنانہ لباس میں گا بجا کر رانی کا دل رجھانے لگے۔ لیکن جب کام بننے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو شہزادہ بنارس سے فوج لے کر آیا اور دھاوا بول دیا۔ فریقین میں صلح اس شرط پر ہوئی کہ رانی مسلمان ہوجائے۔ غرض وزیر نے قاضی کو بلا کر دونوں کی شادی کرادی۔

رنگین بڑے زندہ دل اور طباع شاعر تھے۔ ان کا مشاہدہ تیز تھا۔ مثنوی کے سیدھے سادے قصے کو انھوں نے طول دے کر بیان کیا ہے اور بات میں بات پیدا کی ہے۔ بعض اشعار محض بھرتی کے ہیں۔ زبان پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ جہاں ان کی طبیعت زور مارتی ہے، اشعار برجستہ اور شگفتہ نکلتے ہیں۔ مثنوی میں ایک جگہ ہولی کا منظر کھینچا ہے، اس سے چند شعر ملاحظہ ہوں:

چلتی ہے دو طرف سے پچکاری مینہ برستا ہے رنگ کا بھاری
بادل آئے ہیں گھر گلال کے لال کچھ کسی کا نہیں کسی کو خیال
ہیں جو مصروف سب صغیر و کبیر اڑ رہا ہے گلال اور عبیر

بن گئے ہیں ہوا میں وہ بادل — اور زمیں میں پڑے ہیں تھل کے تھل
اور اٹھا کر کسی نے بھاری گیند — کنپٹی میں کسی نے ماری گیند
اور مٹھی میں اپنی بھر کے گلال — ڈال کر رنگ منہ کیا ہے لال
جس کے بالوں میں پڑ گیا ہے عبیر — بڑبڑاتی ہے یہ وہ ہو دل گیر
ایسی ہولی کا کھو جڑا جاوے — کوئی نوج ایسے کھیل میں آوے
جس کے لاگا ہے قمقمہ بھاری — ہاتھ سے وہ پٹک کے پچکاری
کہتی ہے یوں پیار کر جھولی — ستیاناس ہو ترا ہولی
جس نے ڈالا ہے حوض میں جس کو — وہ یہ کہتی ہے کوس کر اس کو
یہ ہنسی تیری بھاڑ میں جاوے — تجھ کو ہولی نہ دوسری آوے[۲۹۶]

مثنوی سراپا سوز

یہ مثنوی قاضی محمد صادق خاں اختر کی تصنیف ہے۔ اشپرانگر نے اس کا سنہ تصنیف ۱۲۳۱ھ لکھا ہے[۲۹۷] جو غلط ہے۔ امام بخش ناسخ کے قطعہ تاریخ سے جو مثنوی کے آخر میں درج ہے، سالِ تصنیف ۱۲۴۴ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس مثنوی کا ایک مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد میں محفوظ ہے۔[۲۹۸] اس کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے پاس بھی تھا۔[۲۹۹] مصنف کی زندگی ہی میں یہ مثنوی لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی لکھنؤ ہی سے نکلا تھا۔ جس کا تعارف محمد علی شاہ میکش اکبر آبادی رسالہ اُردو ادب میں کرا چکے ہیں۔[۳۰۰] اس مثنوی کا ایک اور ایڈیشن بھی ہماری نظر سے گزرا ہے جو لکھنؤ ہی

---

۲۹۶ بحوالہ سعادت یار خاں رنگین، حوالہ ماسبق

۲۹۷ اشپرانگر، ص ۵۹۹

۲۹۸ سالار جنگ ص ۶۸۷

۲۹۹ مثنوی سراپا سوز رسالہ نیا دور لکھنؤ، جنوری ۱۹۶۰ء

۳۰۰ اردو ادب، مارچ ۱۹۵۳ء، ص ۵۷

سے ۱۸۵۸ء میں چھپا تھا۔ حسرت موہانی نے اس مثنوی کو محبت خاں محبت کی مثنوی "اسرارِ محبت" اور آغا علی شمس لکھنوی کی "طلعت الشمس" کے ساتھ "مجموعہ" کے نام سے اُردوے معلّیٰ پریس سے شائع کیا تھا۔

قاضی محمد صادق خاں 'اختر' ہگلی کے رہنے والے تھے۔ وطن چھوڑ کر لکھنؤ آئے اور قتیل کے شاگرد ہوئے۔ انھیں غازی الدین حیدر نے ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ اشپرانگر نے ان کی فارسی سوانح عمری "صبح صادق" کا ذکر بھی کیا ہے۔(۳۰۱) ۱۸۵۸ء میں انتقال کیا۔(۳۰۲)

قاضی محمد صادق خاں کی تصانیف میں فارسی شعرا کا تذکرہ آفتاب عالم تاب بھی قابل ذکر ہے، جس کا قلمی نسخہ اسٹیٹ لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کا بیان ہے کہ "صبح صادق مشکل سے سوانح عمری کہی جاسکتی ہے"۔(۳۰۳)

مثنوی سراپا سوز کا قصہ یوں ہے: بنارس کا ایک حسین نوجوان ایک روز بازار میں چلا جارہا تھا کہ ناگاہ اس کی نگاہیں سنار کی دخترِ زیبا سے چار ہوئیں۔ اس پری تمثال کا سامنا ہوتے ہی نوجوان بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑا۔ اس کے احباب اسے وہاں سے اُٹھا کر گھر لائے اور ایک شخص کو پیامی بنا کر سنار کی لڑکی کے پاس بھیجا۔ سنار کی لڑکی کو اپنے عاشقِ صادق کے حالِ زار پر رحم آیا، لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور کہلوا بھیجا کہ تم مسلمان ہو، میں ہندو، ہم دونوں کا ساتھ ممکن نہیں۔ نوجوان نے جوگیوں کا روپ دھارن کیا اور گلے میں زنار ڈال کر سنار کے گھر کے آگے دھونی رما کے بیٹھ گیا۔ بات محلے برادری میں پھیلی اور یہاں تک بڑھی کہ وہ نوجوان لڑکی کے عزیزوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ لڑکی یہ دیکھ کر جوشِ غم سے پاگل ہوگئی اور نوجوان کی نعش سے لپٹ کر آہ و زاری کرنے لگی۔

---

۳۰۱ اشپرانگر، حوالہ ماسبق

۳۰۲ تاریخ ادب اردو، ص ۳۰۷، خم خانۂ جاوید پنجم، نیز سراپا سخن، ص ۱۰۷

۳۰۳ مکتوب بنام مولف

سوز دروں سے اس کا تن بدن بھٹی کی طرح جلنے لگا اور آن کی آن میں وہ ڈھیر ہو گئی۔ عشق نے دو دیوانوں کو ہمیشہ کے لیے ملا دیا۔

مثنوی مختصر ہے۔ کہیں کہیں تصنع سے کام لیا ہے۔ مجموعی طور پر اشعار رواں اور بندشیں چست ہیں۔ شاعر کے کلام سے اس کے زورِ طبیعت اور پختگی کا پتا چلتا ہے۔ نوجوان کے مارے جانے کے بعد سنار کی لڑکی کی حالت ملاحظہ ہو:

دیکھ کر نعشِ یار سینہ فگار — لگی کہنے بہ دیدۂ خونبار
اے مرے جاں نثارِ راہِ وفا — کشتۂ تیغ و خنجر اعدا
ہائے اے میرے چاہنے والے — بات اپنی نباہنے والے
گر تو ملکِ عدم کا عازم تھا — چھوڑ جانا مجھے نہ لازم تھا
مجھ پہ سوجی سے یوں مرے گا کون — ناز برداریاں کرے گا کون[۳۰۴]

اس مثنوی کی خصوصیت یہ ہے کہ بجائے کسی ایک مذہب کی برتری اور افضلیت ثابت کرنے کے اس میں باہمی رواداری، آشتی اور دونوں مذہبوں کی بنیادی وحدت اور یکرنگی پر زور دیا گیا ہے۔ سنار کی لڑکی نے جب یہ کہلوا بھیجا کہ ہندو اور مسلمان کی تفریق ہماری راہ میں حائل ہے تو نوجوان اس کا جواب یوں دیتا ہے:

جس جگہ عشق کی ہے جلوہ گری — ہے وہ منزل دوئی سے پاک و بری
ان کے آگے جنھیں ہے عشق سے کام — دین کیا چیز کفر کس کا نام
انھیں اسلام ہے رخِ جاناں — کفر ہے اس پہ خالِ مشک افشاں
غور کیجے تو ہیں یہ دونوں ایک — اس میں کب ہے تفاوت بد و نیک
ہے حرم کی اگر اذاں ناموس — دیر کا پردہ دار ہے ناقوس
خانۂ کعبہ ہو کہ کعبۂ دیر — یاں سوا ایک کے نہیں ہے غیر[۳۰۵]

---

۳۰۴ مثنوی سراپا سوز، لکھنؤ ۱۸۵۸ء

۳۰۵ ایضاً

پانچ مزید ملتی جلتی مثنویاں

ذیل میں پانچ مزید ایسی مثنویوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے جن میں عاشق و معشوق کا تعلق مختلف مذاہب سے دکھایا گیا ہے۔ اس سے پہلے سولہ ایسی مثنویوں کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ ان پانچ کو ملاکر اس قسم کے قصوں پر مبنی اُن اُردو مثنویوں کی کل تعداد اکیس ہو جاتی ہے جو ہمارے علم میں ہیں۔

مثنوی حُسن و عشق، راسخ

مثنوی سراپا سوز میں قاضی محمد صادق خاں، اختر (وفات ۱۲۷۵ھ) نے جو قصہ بیان کیا ہے اس سے ملتا جلتا قصہ راسخ عظیم آبادی (وفات ۱۲۳۸ھ) ان سے پہلے اپنی مثنوی "حُسن و عشق" میں نظم کر چکے تھے۔

مثنوی کے شروع میں "عشق عافیت سوز" کی تعریف ہے، جو تقریباً آٹھ صفحوں کو محیط ہے۔ چند اشعار جن میں ہندستانی تلمیحات بڑی بے تکلفی سے استعمال کی گئی ہیں، ملاحظہ ہوں:

ہیں طرفہ فسوں ترے فسانے	سامع ان کے سبھی دوانے
آرامِ وطن دمن سے چھوٹا	نل تیرے سبب وطن سے چھوٹا
جوگی بنا کامروپ تجھ سے	کھو بیٹھا وہ رنگ روپ تجھ سے
بے چین ہوئی اُدھر لتا کام	کھویا دونوں کا تو نے آرام

ایک نوجوان ایک ہندو لڑکی سے عشق کا دم بھرتا تھا۔ رفتہ رفتہ عشق کی لاگ بڑھنے لگی اور عاشق کے نالوں سے نوبت رسوائی تک پہنچی۔ معشوق پر پابندیاں عائد کردی گئیں۔ آخر عاشق ایک دن کشاں کشاں محبوب کے آستاں پر آیا۔ لیکن ناتوانی اور نقاہت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ سجدہ کرتے ہی روح پرواز کر گئی۔ معشوقہ کو معلوم ہوا تو وہ دوڑی ہوئی دروازے پر آئی اور:

بیٹھی جا لاش کے وو نزدیک — آنکھوں میں ہوا جہان تاریک
کی ایک نگاہِ یاس اُس پر — سر زانو پہ اپنے اس کا رکھ کر
اپنے اس شوق کشتہ کی لاش — آنکھوں سے ہوئی وہ خون دل پاش
ہو جاذب ریش جیسے مرہم — یوں کھینچی بغل میں تنگ اک دم
عاشق پہ غرض فدا کیا جی — منھ پر رکھ اس کے منھ دیا جی

اختر نے اپنی مثنوی میں عاشق اور معشوق دونوں کو بالتصریح مختلف مذاہب سے دکھایا ہے۔ لیکن راسخ نے فقط معشوقہ کی تخصیص کی ہے یعنی وہ "دخت ہندو" تھی۔ اس کے علاوہ راسخ کے ہاں بنارس کا بھی کوئی ذکر نہیں، جب کہ اختر نے اس قصے کی جائے وقوع بنارس بتائی ہے۔ اختر کی مثنوی میں بعض دوسرے اضافے یہ ہیں کہ لڑکی کے والد کو زرگر دکھایا گیا ہے اور نوجوان عاشق لڑکی کے عزیزوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ اس کے برعکس راسخ کی مثنوی میں وہ کشتۂ عشق خود بخود مر جاتا ہے۔ ان اختلافات سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ راسخ کی مثنوی اختر کی نظر سے گزری تھی اور انھوں نے قصے میں بعض باتیں بڑھاکر اسے زیادہ دلچسپ طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔

راسخ نے پہلے پہل اپنی یہ مثنوی لکھنؤ میں غازی الدین حیدر کو نذر کی۔ دوسری مرتبہ انھوں نے اس میں ایک طویل تمہید اور خاتمے کے دعائیہ اشعار بڑھاکر اسے "سرکار کمپنی انگریز بہادر" کو پیش کردیا۔ "مثنویات راسخ" میں اصل مثنوی ۱۲ صفحوں میں اور اضافہ شدہ اشعار ۴۶ صفحوں پر شائع ہوئے ہیں[۳۰۶] خاتمہ کے اشعار میں سے 'جو کمپنی کی مدح میں ہیں' چند ملاحظہ ہوں:

ہے طبع مری بہت پریشاں — روزی کی فکر سے ہوں حیراں
محسود ہوں کیوں نہ ہر غنی کا — مداح فقط ہوں کمپنی کا
مطلب دل کا حصول ہووے — یہ نذر اگر قبول ہووے

۳۰۶ مثنویات راسخ، مثنوی حسن و عشق، ص ۱ تا ۵۸

مثنوی کششِ عشق

راسخ عظیم آبادی نے اپنی اس مثنوی میں ایک درویش اور راجکماری کا دردناک قصہ نظم کیا ہے۔ اس مثنوی کا تقریباً دو تہائی حصہّ حمد و نعت و منقبت، مناجات، وصف عشق، مدح نواب، صفت بازارہا، وصف عمارت، وصف مسجد، وصف امام باڑہ وغیرہ پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی پہلے نواب آصف الدولہ کو نذر کی گئی جن کی مدح میں تقریباً ایک تہائی اشعار صرف کیے گئے ہیں۔ لیکن حک و اضافہ کے بعد راسخ نے اسی مثنوی کو لارڈ منٹو سے منسوب کردیا اور خود کو کمپنی کا خیر خواہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ میں دیوان راسخ قلمی مکتوبہ ۱۲۲۴ھ میں یہ مثنوی اپنی اصلی شکل میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد نے اصلی متن کو تبدیل شدہ متن کے ساتھ ''مثنویات راسخ'' میں شائع کردیا ہے۔[۳۰۷]

مثنوی ایک ایسے درویش کے ذکر سے شروع ہوتی ہے جو سوائے عشق کے دنیا کے تمام علائق سے آزاد تھا۔ پھرتا پھراتا وہ بنارس میں آیا۔ یہاں ہر صورت ہوش ربا اور فتنۂ روزگار دکھائی دی۔

زہے شہر محسود باغ بہشت — زن و مرد سب حور و غلماں سرشت
ہر اک غیرت افزائے ماہ تمام — کرے صبح عاشق کو زلف ان کی شام
پڑے چشم جس گوشۂ بام پر — خدا ہی کی آجائے قدرت نظر
لب بحر جاوے اگر کوئی واں — تو دیکھے عجب طرح کا اک سماں
ہر اک سمت خیل پری وش زناں — بہم گرم بازی و غوطہ زناں
کوئی دست بستہ سوئے آفتاب — کوئی شرمگیں کوئی پُر بے حجاب
کوئی باندھے بالوں کو سوناز سے — کوئی کھولے زلفیں اک انداز سے

درویش نے بھی وہیں گنگا کے کنارے ڈیرا ڈال دیا۔ ایک دن راجا کی بیٹی وہاں

---

۳۰۷ مثنویات راسخ، ص ۱-۲۴

اشنان کے لیے آئی۔

نہاتی تھی خورشید انور کی طرح　　بدن اس کے جھمکے تھا گوہر کی طرح
عیاں عکس رو اس کا یوں آب میں　　نظر آوے خورشید جوں آب میں
بیاں کیا کروں اس کے جلوے کی لاگ　　کہے تو کہ لاگے ہے پانی میں آگ

قضارا اس درویش نے راجکماری کو دیکھا اور نگاہیں چار ہوتے ہی ہوش و حواس ہار گیا۔ دن پریشانی اور راتیں بے خوابی میں گزرنے لگیں۔ راجکماری ہر روز صبح کے وقت گھاٹ پر آتی۔ درویش نظارے کی تاب نہ لا سکتا اور غش کھا کے گر جاتا۔ لوگوں نے اسے بہت سمجھایا کہ کیوں ناحق روتے کڑھتے ہو۔ شاہ و گدا میں میل کیسا۔ وہ عالی نسب تجھ فرومایہ کو کیوں پوچھنے لگی۔ لیکن درویش بھی چراغ محبت کا پروانہ تھا۔ راہِ عشق میں ثابت قدم رہا۔ جب یہ روز روز کا تماشا رسوائی کی شکل اختیار کرنے لگا تو راجکماری کی سہیلیوں نے مشورہ دیا:

تو اس ننگ کو درمیاں سے اٹھا　　یہ فتنہ نہ جانے کہاں سے اُٹھا
بٹھا اس کو تو آب تدبیر سے　　مبادا یہ شعلہ بلندی کرے
کہہ اس سے اگر مجھ پہ عاشق ہے تو　　یہ دعویٰ جو ہے اس میں صادق ہے تو
تو جا ڈوب دریا میں شکل حباب　　نہ کر جان کا صرف خانہ خراب

غرض راجکماری نے ایسا ہی کیا اور درویش یہ سنتے ہی:

ہوا مضطرب سا وو اس جا کے بیچ　　کنارے پہ تھا یا کہ دریا کے بیچ
ہم آغوش موجوں سے جا ہوگیا　　نظر پھر نہ آیا کہ کیا ہوگیا

درویش کے ڈوب جانے کے بعد راجکماری بیکلی سی محسوس کرنے لگی۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ سہیلیاں اُسے گھر لائیں۔ لیکن ہر لحظہ اس کی بیتابی بڑھنے لگی اور کاہشِ غم سے وہ اندر ہی اندر گھلنا شروع ہوگئی۔ ایک رات وہ بستر خواب سے اٹھی، آئینے کے سامنے آئی اور:

لگی کہنے دل سے نہ ہو تو اداس   کہ چلتے ہیں آج اس ستم کش کے پاس
کیا شانہ ہر تار گیسو کے تئیں   بنایا بہت زلفِ خوشبو کے تئیں
حنا سے کفِ دست رنگیں کیے   بہت پائے نازک نگاریں کیے

دایہ کو ساتھ لے کر یہ جگر تفتہ رات کے وقت گھاٹ پر آئی اور عین اسی جگہ موجوں سے ہم آغوش ہوکر غرق ہوگئی، جہاں درویش نے ڈوب کر جان دی تھی۔ اعزّہ و اقارب کو پتا چلا تو گھر میں کہرام مچ گیا۔ دریا میں دام ڈلوائے گئے۔ بالآخر ہفتے بھر کی کوشش کے بعد دونوں کی نعشیں ایک ساتھ برآمد ہوئیں:

نہ کہہ مجھ سے راسخ کہ حیرت ہے یہ   مری جان آخر محبت ہے یہ
نہ حیراں ہو یہ کام ہیں عشق کے   یہی کچھ تو انجام ہیں عشق کے

مثنوی کا قصہ بس اتنا ہی ہے۔ لیکن شروع میں راسخ نے اس سے دُگنے اشعار مدح وغیرہ پر صرف کیے ہیں، جو ایک عشقیہ مثنوی میں بالکل بے ربط معلوم ہوتے ہیں۔ راسخ نے مثنوی کے اس حصے سے ایک طولانی قصیدے کا کام لیا ہے۔ ان اشعار کو اگر حکایت والے حصے الگ کردیا جائے تو بجائے خود ایک مدحیہ مثنوی کہے جاسکتے ہیں۔ راسخ کی عشقیہ مثنویوں کی یہ ایک عام کمزوری ہے کہ وہ اصل کی نسبت فرع پر کہیں زیادہ زور طبع صرف کرتے ہیں (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو مثنوی نیرنگ محبت اور حسن و عشق) اس مثنوی میں بھی طویل تمہید کا اثر حکایت پر بُرا پڑا ہے۔ نہ صرف یہ کہ مثنوی کے دونوں حصّوں میں کوئی ربط و توازن نہیں، بلکہ قصّے پر بھی پوری توجہ نہیں کی گئی اور تمہیدی اشعار کے انبار میں قصّے کی انفرادی حیثیت دب کر رہ گئی ہے۔ قصّے کے انجام میں بھی کوئی ندرت نہیں۔ عاشق و معشوق کی نعشوں کا ایک ساتھ برآمد ہونا اس زمانے کے اکثر قصوں میں پایا جاتا ہے۔ خود راسخ نے اپنی ایک اور مثنوی "جذب عشق" میں بھی موت کے بعد عاشق و معشوق کی یہی حالت دکھائی ہے۔ ان خامیوں کے باوجود قصّے کی المیہ سادگی دل پر اثر کرتی ہے۔ راسخ نے بنارس کے مقامی

ماحول کو کامیابی سے پیش کیا ہے اور وہاں کے گلرخوں کی تصویریں بھی بڑی خوبی سے کھینچتی ہیں۔ میر کی مثنویوں کے قصوں کی طرح اس مثنوی میں بھی واقعیت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ زبان صاف، سادہ اور سلیس ہے اور اس کی یہی خوبیاں اسے دہلوی شاعروں کی مثنویوں سے قریب لے جاتی ہیں۔

مثنوی راجہ و چیری

یہ مثنوی جرأت کے مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں، بلکہ کلیات جرأت کے رام پور اور پٹنہ کے قلمی نسخوں میں درج ہے۔ اس میں کل ۲۰۳ اشعار ہیں۔ آغاز یوں ہوتا ہے:

الٰہی دردِ الفت کر عنایت　　مجھے اپنی محبت کر عنایت

ایک راجا کی بہت سی چیریاں (کنیزیں) تھیں، لیکن وہ ان میں سے کسی پر ملتفت نہ تھا۔ ایک دن وہ سیر کو گیا اور اس کی نگاہیں ایک ایسی عورت سے چار ہوئیں، جو حسن و صباحت میں چودھویں کا چاند تھی۔ راجا اسے دل دے بیٹھا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس کے بھائی کی کنیز تھی۔ راجا کی بے قراری دیکھ کر کنیز نے تغافل برتنا شروع کیا اور وصال کے لیے یہ شرط رکھی کہ راجا سفر اختیار کرے اور جوگی رتن سین کا اتا پتا ڈھونڈ نکالے۔ بالآخر راجا جوگی کی تلاش میں روانہ ہوا۔ راہ میں ایک دریا آیا۔ راجا کشتی میں بیٹھ کر دریا عبور کرنے لگا کہ پنج تن کی یاد آئی اور وہ مسلمان ہو گیا۔ دوسرے کنارے پر راجا کی ملاقات ایک درویش سے ہوئی۔ اس نے بشارت دی کہ راجا واپسی پر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گا اور جوگی رتن سین کا سراغ مل جائے گا۔

شاعر نے قصے کو یہیں چھوڑ دیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر زندگی رہی تو باقی کہانی ختم کریں گے۔ قصہ بے ربط اور غیر دلچسپ ہے۔ شاعرانہ اعتبار سے بھی اس میں کوئی خوبی نہیں۔ جرأت کی طبیعت کو سراپا نگاری سے خاص مناسبت تھی۔

اور انھوں نے اس موضوع پر بعض مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں۔ زیر نظر مثنوی میں بھی کنیز کا سراپا مفصل بیان کیا گیا ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ ماہ چہاروہ تھی ایسی چیری	اجالا کر دکھاوے جو اندھیری
سراپا آہ شکلِ برق تھی وہ	غرض ناز و ادا میں غرق تھی وہ
بندھے جوڑے کا عالم کہیے کیا ہائے	کہ ہر موجن کا تھا دام بلا ہائے(۳۰۸)

مثنوی حسن و عشق، بسمل

بسمل فیض آبادی کی اس مثنوی کا تعارف ۱۹۳۹ء میں عبدالباری آسی نے رسالہ اُردو میں کرایا تھا۔(۳۰۹) یہ مثنوی ۱۲۰۳ھ میں لکھی گئی۔ اس میں مہجور اور منوہر چند کے غیر فطری عشق کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ قصہ بسمل کو جواہر علی خاں خواجہ سرا نواب ناظر نے سنایا اور اسے نظم کرنے کی فرمایش بھی کی۔ اس میں بھی عاشق و معشوق کا تعلق باہم مختلف مذہب سے بتایا گیا ہے۔

بسمل کا پورا نام محمد جواد اور عرف مرزا لالن تھا۔ ان کے والد حکیم علی حسین خاں اپنے زمانے کے نامی اور شاہی طبیب تھے۔ بسمل بھی ایک وقت تک نواب آصف الدولہ کے دربار سے متعلق رہے۔ عبدالباری آسی نے مثنوی حسن و عشق کے علاوہ ان کی ایک اور مثنوی پارسانامہ کا بھی ذکر کیا ہے، جو ۱۲۱۳ھ کی تصنیف ہے۔ بسمل ۱۲۱۹ھ تک حیات تھے۔

مثنوی حسن و عشق خاصی طویل ہے اور ۱۴۱۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز حمد و نعت اور جواہر علی خاں نواب ناظر کی مدح سے ہوتا ہے۔ قصہ یوں ہے: ایک سوداگر کا حسین و جمیل لڑکا مہجور نام، انتہا کا عاشق مزاج تھا۔ آخر یہ سودا اتنا بڑھا کہ دیوانہ ہو کر گھر سے نکل گیا۔ مدتوں جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ ایک دن اتفاقاً اسے ایک روضے پر نیند آگئی۔ خواب میں ایک حسین نظر آیا،

۳۰۸ بشکریہ ڈاکٹر گیان چند جین

۳۰۹ رسالہ اردو۔ جنوری ۱۹۲۹ء، ص ۶۵۔ ۱۱۲

جس نے اپنا نام منوہر بتایا اور کہا کہ تجھے کچھ خبر بھی ہے، میں تیرے غم میں خراب و خوار پھرتا ہوں۔ منوہر چند ملک چنپاپٹن کے راجا کا لڑکا تھا۔ اس نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا اور شوریدگی کے عالم میں شہروں شہروں پھرنے لگا۔ آخر اسی روضے کے قریبی گاؤں میں آیا۔ یہاں ایک بیراگی کی بدولت اس کی ملاقات مہجور سے ہوئی۔ بیراگی نے منوہر کے باپ راجا اتم چند کو پورا واقعہ سنایا اور نصیحت کی کہ یہ عشق کے اسرار ہیں۔ ان دونوں کو ہمیشہ ساتھ رکھنا۔ لیکن کچھ دنوں بعد لوگوں نے راجا کو بدگمان کر کے مہجور کو وہاں سے نکلوا دیا۔ اس کے جانے کے بعد منوہر بیمار ہوا اور مدقوق ہو گیا۔ بیٹے کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر راجا نے مہجور کو واپس بلایا، لیکن وقت نکل چکا تھا۔ بالآخر منوہر مر گیا۔ لوگ جب اسے چتا میں رکھ کر جلانے لگے تو انھوں نے دیکھا کہ مہجور بھی ایک درخت سے لگا ہوا خود بخود جل کر خاک ہو گیا تھا۔

مثنوی کا قصہ غیر فطری ہے، لیکن یہ شاعر کا طبع زاد نہیں۔ بسمل نے دراصل اپنے زمانے کی روشِ خاص کی پیروی کی ہے اور جس طرح یہ قصہ انھیں سنایا گیا، انھوں نے ویسے ہی اسے نظم کر دیا۔ فنی اور ادبی اعتبار سے یہ مثنوی کئی خوبیوں کی حامل ہے۔ بسمل نے مہجور اور منوہر کی وارفتہ مزاجی، عشق کی صفات، ماں باپ کے اضطرار، سراپا اور مجرا کے بیان میں پورے طور پر زور قلم صرف کیا ہے۔ منظر کشی بھی نہایت عمدہ ہے۔ گو بعض حصے طویل ہیں، لیکن ان سے مثنوی کی وحدت تاثر میں فرق نہیں آیا۔ شاعر کو زبان پر پورا عبور حاصل ہے اور اشعار شیریں، دل نشیں اور مرصع ہیں۔ نمونے کے طور پر یہ اشعار دیکھیے جن میں بیٹے کا اپنی ماں سے جدا ہونا دکھایا گیا ہے:

یہ حالت دیکھ کر ماں چلچلائی — پکڑ دستِ پسر کو تلملائی
ہوا تھا رنگ چہرہ اس کا کاہی — سراپا تھیں علاماتِ تباہی
علم آرا ہوئی دیوانگی تھی — شکیب و صبر سے بیگانگی تھی

طلب کر اپنے ہر اک ہم نشیں کو — رکھ ان کے پاؤں کے اوپر جبیں کو
یہی کہتی تھی ان سے کھینچ کر آہ — عزیزو! جاتا ہے میرا یہ دل خواہ
اگر سنبھلے تو تم اس کو سنبھالو — اسے چاہِ محبت سے نکالو

مثنوی کے آخر میں بے ثباتی عالم کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ان اشعار کی پختگی اور حُسن کاری دیکھیے:

غنیمت ہے ارے ظالم کوئی دم — یہ عرصہ زندگانی کا بہت کم
کہ شمع بزم ہستی آہ فریاد — سدا رہتی ہے زیرِ دامن باد
جو آیا اس گزرگہ میں سو گزرا — نہ وامق ہی رہا آخر نہ عذرا
نہ سودا ہی رہا ہے اب نہ یاں درد — ملے جا کیسے کیسے خاک میں مرد
یہی خورشید ہووے اور یہی ماہ — یہی وضع زمانہ اور یہی راہ
کچھ اشیا سے یہاں کی کم نہ ہوویں — یہ سب کچھ یوں ہی ہوں اور ہم نہ ہوویں

مثنوی گلدستۂ مسرّت

منشی عطا علی خاک کی یہ مثنوی مطبع نظامی کانپور سے ۱۲۸۵ھ میں ۱۲ صفحات پر شائع ہوئی۔ اس کا سال تصنیف ۱۲۸۳ھ ہے۔ جیسا کہ ظہور علی ظہور کے اس قطعہ تاریخ سے ظاہر ہے:

دیکھی جو مثنوی یہ ہم نے ظہور جس دم — بے شبہ اس کو پایا گلدستۂ مسرت
آئی یہ اپنے جی میں تاریخ اس کی لکھیے — دل نے کہا "بنایا گلدستۂ مسرت"

۱۲۸۳ھ

اس مثنوی میں ہسوہ (ضلع فتح پور، اترپردیش) کا ایک سچا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تصدیق واحد علی وحید کے اس قطعے سے بھی ہوتی ہے جو مثنوی کے آخر میں درج ہے:

وحید مثنوی جو یہ عطا علی نے کہی معاملہ ہے قریب جوار ہسوا کا
حُسن کا قصہ ہے روپا ہے اسکی جانِ عزیز یہ قصہ دید کے لائق ہے دل ہے شیدا کا (کذا)

مثنوی کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے۔ یہ ۱۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد ۸ اشعار شاعر نے اپنے مرشد کی تعریف و توصیف میں لکھے ہیں۔ چند یہاں درج کیے جاتے ہیں:

شاہ عبدالسلام فخر زماں زیب اورنگ کشور عرفاں
عابد حق شناس و با ایماں زاہد پاک و حافظِ قراں
جائے ہسوہ ہے اس سے رشک ارم عام ہیں اس کے فیض لطف و کرم

قصے کے آغاز سے پہلے مصنف نے اپنے اُستاد کا ذکر یوں کیا ہے:

نام برہان دین باسم مبیں بہر دین نبی دلیل متیں
بسکہ ہے پارسا وہ مرد خدا ہے تخلص بھی پارسا اس کا
باغ ہسوہ کی ہے بہار اس سے ہے مجھے پایۂ وقار اس سے

عطا علی خاک نے سبب تالیف میں لکھا ہے کہ ایک دن ہسوہ میں وہ اپنے دوست واحد علی وحید کے ہاں بیٹھے تھے کہ منظوم قصوں کا ذکر چل نکلا۔ کوئی شیریں فرہاد کا نام لیتا تھا۔ کوئی لیلیٰ مجنوں کا قصیدہ پڑھتا تھا۔ کسی نے ہیر و رانجھا کی داستانِ عشق بیان کی مگر عطا علی نے کہا کہ قدیم قصوں کو جانے دیجیے۔ اب بھی جذبۂ عشق میں حرارت باقی ہے اور عشق و محبت کا ایک درد انگیز واقعہ یہیں گزرا ہے:

کوئی مجنوں کا ذکر کرتا تھا کوئی لیلےٰ وشوں پہ مرتا تھا
کوئی کرتا تھا ذکرِ رانجھا و ہیر کوئی سکتے میں صورتِ دلگیر
بولا میں بھی یہ سن کے قال و مقال ہے عبث قصہ کہن پہ خیال
جذبۂ عشق اب بھی باقی ہے جامِ رنگیں بدست ساقی ہے

ابھی اک ماجرا یہیں گزرا حال میں نے وہ سب بیان کیا
سُن کے وہ ذکر خوش ہوئے اکثر بولے کر نظم اے سخن پرور
اس کی خواہش ہر اک سعید نے کی کد زیادہ مگر وحید نے کی

اس کے بعد شاعر نے دعویٰ کیا ہے کہ اصل قصّے سے وہ انحراف نہیں کرے گا:

نظم کرتا ہوں یہ نیا قصہ یعنی جس طرح سے کہ ہے گزرا
کرتا ہوں حالِ واقعی تحریر لائیں اس کا یقیں صغیر و کبیر

آغاز قصہ کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ عطا علی خاک اس واقعے کے عینی شاہد نہیں تھے بلکہ انھوں نے اسے کسی دوسرے سے سُنا تھا۔

راوی معتبر جہاں پیا کہ وہ ناقل ہے اس فسانے کا
مجھ کو اس طرح سے بتایا ہے کہ وہ آنکھوں سے دیکھ آیا ہے

ہسوہ کے قریبی علاقے میں ایک گل فروش رہتا تھا۔ اس کی نوجوان بیٹی روپا اپنے حسن و جمال کی بدولت گاؤں بھر میں مشہور تھی۔ کم سنی میں اس کی شادی ہوگئی تھی۔ لیکن ابھی گونا نہیں ہوا تھا اور وہ ماں باپ ہی کے گھر رہتی تھی۔ صبح و شام گاؤں کے کنویں سے پانی بھر لانا اس کا معمول تھا۔ اس کنویں کے قریب زمیندار کے کارندے شیخ حسن کا مکان تھا۔ ایک دن ناگہاں دونوں کا سامنا ہوا اور روپا دل و جان سے حسن پر فدا ہوگئی۔

ہوش جاتے رہے نگاہ جو کی ہل گیا آسمان آہ جو کی
تھی وہ لیلیٰ مگر بنی مجنوں چشم بیمار سے وہ روئی خوں
پانی چھڑکا نہ ہوش میں آئی اور بھی آگ اس نے بھڑکائی
لائے گھر تک ولے جگر تھامے کوئی بازو کوئی کمر تھامے
کی دوا جس نے جو کہ بتلائی لیک آئی نہ کچھ توانائی

بڑھی دو دن میں ایسی بیماری جیسے برسوں کا کوئی آزاری
نہ کھلا اس کا کچھ بھی راز بطون بڑھ چلا رفتہ رفتہ اور جنون

آخر ایک ہم راز دایہ کو ہمدرد و مونس جان کر روپا نے احوالِ دل بتایا۔ دایہ اس کا پیغام لے کر حسن کے پاس گئی۔ لیکن حسن بدنامی کے خیال سے ملاقات کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے مشورہ دیا:

کس لیے در پے مصیبت ہے کہ اسی طرح تجھ کو الفت ہے
چاہ پر بہر آب روز آنا دیکھ کر مجھ کو گھر چلی جانا
میں بھی دیکھوں تجھے بہانے سے لطف ہو ایسے آنے جانے سے
دُور سے دونوں کا نظارہ ہو کوئی جانے نہ اور اشارہ ہو
کیا کروں ہے خیال بدنامی دیکھیے کیا کرے یہ ناکامی
نوکری جائے گی جفا کے ساتھ ہوں گا مشہور اس خطا کے ساتھ

مگر دایہ بھی بڑی پرفن تھی۔ وہ مکر و حیلے سے حسن کو روپا کے گھر لے ہی آئی۔

پھونکنے کے بہانے گھر میں گیا ہوئے اک جا وو مہر و ماہ لقا
زندگی پائی جسمِ مردہ نے کھول دی آنکھ اس فسردہ نے

روپا عشق میں وارفتہ و بے خود ہو چکی تھی۔ اس نے حسن سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس کے بغیر ایک پل بھی زندہ رہنے کو تیار نہیں۔ لیکن حسن راہِ عشق کو وضعِ احتیاط سے طے کرنا چاہتا تھا۔ وہ بغیر کسی قسم کا وعدہ کیے اپنے مکان پر لوٹ آیا۔ غرض اس کی بے التفاتی سے روپا کی حالت روز بروز بگڑنے لگی۔ ملاحظہ ہو عطا علی خاک نے ان کیفیات اور حالات کو کیسی روانی اور برجستگی سے ادا کیا ہے:

ایک دن بھی نہ پھر قرار آیا تھرتھرایا بدن بخار آیا
دل میں کہنے لگی نہیں جو یار تو یہ جینا عبث ہے آخرکار

باپ ماں سے بہانہ کرکے اٹھی　　دل دھڑکتا تھا ہاتھ دھر کے اٹھی
کہتی تھی اپنے دل سے وہ ناداں　　جان کیا ہے اگر نہیں جاناں
جب نہ راضی کسی کا دلبر ہو　　پھر تو عاشق کو موت بہتر ہو

روپا کی دیوانگی اس حد تک بڑھ گئی:

چاہ میں ہو کے باولی اک بار　　گر پڑی وہ کنویں میں آخرکار
بولیں پنہاریاں یہ چلاّ کر　　کہ گری گل فروش کی دختر
دوڑی خلقت کنویں کے گرد آئی　　مجتمع ہوگئے تماشائی

لوگوں کی بروقت مدد سے روپا کی جان بچ گئی۔ اس حادثے میں حسن کے اوسان بجا نہ تھے۔ وہ دل ہی دل میں خوف زدہ تھا کہ کہیں رازِ عشق عیاں نہ ہو جائے۔ مگر روپا نے انتہائی ضبط اور رازداری کا ثبوت دیا۔

نہ کیا پر کچھ اس نے ذکر ذری　　سخت معیوب سمجھی پردہ دری
آئی تھی یاں پہ بہر آب کشی　　ناگہاں اتفاق سے ہوں گری

اس مقام پر عطا علی خاک اپنے تاثرات یوں پیش کرتے ہیں:

واہ محبوب ہو تو ایسا ہو　　اور مطلوب ہو تو ایسا ہو
نل کہاں کا تھا اور کہاں کی دمن　　دیکھو کیا کر گئے وہ غنچہ دہن
پدمنی کون تھی کہاں کا رتن　　مل گئے کیسے کیسے خاک میں تن
یک دگر تھے فدائے یک دیگر　　نہ کھلا رازِ دل کسی پہ مگر

راہِ وفا میں روپا کی ثابت قدمی اور عشق میں اس کی شوریدہ سری کا حسن پر گہرا اثر ہوا۔ یادِ یار خلش بن کر تڑپانے لگی اور آخر اس نے دایہ کے ذریعے روپا کو اپنے مکان پر آنے کی اجازت دے دی۔ روپا کے دل کی مراد بر آئی۔ وہ موقع پاکر گھر سے بھاگ نکلی اور ماہ و مشتری ایک دوسرے کے قریب

آئے۔ گلی محلے والوں کے خوف سے حسن نے آبادی سے دُور ایک مکان لیا اور روپا کو اس میں ٹھہرایا۔ مگر چند ہی روز میں روپا کے والدین کو اس کی خبر ہو گئی اور ایک دن جب حسن کام سے باہر گیا ہوا تھا، وہ روپا کو پکڑ کر زبردستی اپنے گھر واپس لے آئے۔ روپا سے کہا گیا کہ وہ حاکمِ شہر کے سامنے فریاد کرے کہ حسن نے اسے اغوا کیا ہے اور اس سے سخت بیداد ہوئی ہے۔ لیکن روپا اس کے لیے تیار نہ ہوئی۔ بلکہ یہ جواب دیا:

کچھ میں شیریں نہیں نہ نکلے جاں ‏ ‏ اس پہ ہو جاؤں دم میں بس قرباں
جذبۂ عشق ہے تو جاؤں گی ‏ ‏ یا اسی کو یہاں بلاؤں گی

اس کے بعد وہ پھر موقع کی تاک میں رہی۔ غرض ایک رات:

نیند میں جب ہوئے وہ سب غافل ‏ ‏ بام پر آئی اپنا تھامے دل
کودی یکبار جوششِ خوں سے ‏ ‏ جیسے ٹوٹے ستارہ گردوں سے
چست و چالاک آئی پیش حسن ‏ ‏ غیرت گل سے گھر بنا گلشن
عید آئی بہم ملے دونوں ‏ ‏ کہہ چلے اپنا اپنا غم دونوں[۳۱۰]

روپا نے اپنی وفاشعاری، بلند ہمتی اور ایثار کی بدولت حسن کو اپنا گرویدہ بنا ہی لیا تھا۔ دوسرے ہی دن محبوب نے عاشق کی خاطر مذہب تبدیل کیا اور دونوں کا نکاح ہو گیا۔ غرض اس طرح عشق نے اپنی راہ سے سماجی رکاوٹوں اور مذہبی بندشوں کے کانٹے نکال دیے اور:

مل گئی اپنے دلربا سے وہ ‏ ‏ چھوٹی رنج و غم و جفا سے وہ
دونوں جانب عجب کلام رہے ‏ ‏ وصل سے دونوں شاد کام رہے

عطا علی خاک اُردو کے ان بدنصیب شاعروں میں ہیں، جو لطفِ سخن کے باوجود قبول عام سے محروم رہے۔ ان کی مثنوی میں ادبی شان موجود ہے۔

۳۱۰ مثنوی گلدستۂ مسرت، کان پور ۱۲۸۵ء

قصے کو انھوں نے بڑی سادگی، سلاست اور روانی سے نظم کیا ہے اور بعض مقامات پر نہایت شگفتہ و شیریں اشعار بھی نکالے ہیں۔ واقعات کے تسلسل میں کہیں جھول نہیں۔ روپا کے کردار کو ایسی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے کہ اس کی سیرت کے بنیادی اوصاف نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن ان خوبیوں کے باوجود یہ مثنوی مشہور تو کیا، غالباً اپنے حلقے میں معروف بھی نہ ہوئی۔

باب چہارم

ہند ایرانی قصّے

ہند ایرانی قصّے

مثنوی پھول بَن

یہ مثنوی دکھنی شاعر ابن نشاطی کا زندۂ جاوید کارنامہ ہے۔ اسے مجلس اشاعتِ دکنی مخطوطات نے پروفیسر عبدالقادر سروری سے مرتب کراکے شائع کردیا ہے۔[1] پروفیسر موصوف اس کا سنہ تصنیف ۱۰۷۶ھ قرار دیتے ہیں۔[2] انڈیا آفس کے مخطوطہ پھول بَن میں اس مثنوی کا سال تصنیف ۱۰۶۶ھ بتایا گیا ہے[3] اور پھول بن کا یہی نسخہ سب سے قدیم ہے۔ انڈیا آفس میں پھول بن کا ایک اور مخطوطہ بھی ہے، لیکن اس میں سنہ تصنیف درج نہیں ہے۔[4] پروفیسر سروری کو حیدر آباد میں اس مثنوی کے جو چھ نسخے دستیاب ہوئے ہیں، ان میں سے چار میں سنہ تصنیف ۱۰۷۶ ہی درج ہے۔[5] ان نسخوں میں سے تین کتب خانہ سالار جنگ میں[6] ایک جامعہ عثمانیہ میں اور ایک کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہیں۔[7] ایک نسخہ آغا حیدر حسن کے پاس ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو میں پھول بن کے تین مخطوطے دریافت ہوئے ہیں۔[8]

---

۱ پھول بن، ابن نشاطی مرتبہ عبدالقادر سروری، حیدر آباد ۱۹۳۸ء، تعداد صفحات ۱۱۹/ ۱۷۴

۲ ایضاً، مقدمہ، ص ۱۱۲

۳ بلوم ہارٹ انڈیا، نمبر ۱۰۳

۴ ایضاً، مشمولہ "مجموعہ" نمبر ۱۲۲

۵ پھول بن، مقدمہ، ص ۱۱۲

۶ سالارِ جنگ، ص ۵۹۵

۷ آصفیہ ج ۲، ص ۱۵۰۰

۸ ادارہ ادبیات ج ۱۔ ۴۹، ج ۲۔ ۲۳ اور ۳۳

مثنوی پھول بن کا ایک ایڈیشن حال ہی میں انجمن ترقی اُردو، پاکستان نے بھی شائع کیا ہے۔[9]

ابن نشاطی کا پورا نام شیخ محمد مظہر الدین ابن شیخ فخر الدین تھا۔ وہ قطب شاہی سلطنت کے پایۂ تخت گولکنڈہ کا باشندہ تھا۔ پھول بن کے علاوہ اس کی کسی اور تصنیف کا ہنوز پتا نہیں چلا۔ وہ سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ تا ۱۰۸۳ھ) کے دربار کا معزز عہدہ دار اور مشہور نثر نگار تھا۔ اس کا سنہ وفات پردۂ خفا میں ہے۔[10]

ابن نشاطی کی مثنوی پھول بن ایک فارسی مثنوی "بساتیں" سے ماخوذ ہے، جیسا کہ اس نے ان اشعار میں صراحت کر دی ہے:

اچھے گا عشق کا جس میں روایت　　　اچاہاں خوب یک تازہ حکایت
محبت دیکھنے کی آرسی ہے　　　بساتیں جو حکایت فارسی ہے
دکھن کی بات سوں سریاں کو کہ کھول　　　اسے ہر کس کے تیں سمجا کے توں بول[11]

جس مثنوی "بساتیں" کا ذکر ابن نشاطی نے کیا ہے، اس کا کوئی نسخہ ہندستان یا یورپ کے کسی کتب خانے میں نہیں۔ لیکن پھول بن کو محض ترجمہ یا تلخیص نہیں کہا جا سکتا۔ قصہ ایرانی انداز کا ہے مگر اس میں جگہ جگہ شاعر کے مقامی ماحول کی جھلک ملتی ہے۔ منظر نگاری اور مرقع کشی کے رنگ تو تمام تر ہندستانی زندگی سے ماخوذ ہیں۔ اس سے گمان گزرتا ہے کہ ابن نشاطی نے اصل قصے میں کچھ اضافے بھی کیے، جس سے یہ قصہ صحیح معنوں میں ہندایرانی بن گیا۔

مثنوی پھول بن کا قصہ یوں ہے:

مشرق میں ایک شہر کنچن پٹن یعنی سونے کا نگر کہلاتا تھا۔ یہاں کے

۹　پھول بن مرتبہ شیخ چاندا بن حسین، کراچی، ۱۹۵۵ء

۱۰　ایضاً

۱۱　پھول بن حوالہ ماسبق، ص ۲۲

بادشاہ نے خواب میں ایک درویش کو دیکھا اور اس کا معتقد ہو گیا۔ آخر وہ درویش بادشاہ کو مل گیا اور دربار میں آکر بادشاہ کو روز نئے نئے قصے سنانے لگا۔ پہلا قصہ کشمیر کے بادشاہ کا ہے۔ اس کے باغ میں ایک نادر اور نہایت خوشبودار پھول تھا۔ ایک کالا بلبل روز آکر اسے چھیڑنے لگا۔ جس سے پھول مرجھا گیا۔ آخر بلبل کو پکڑ کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ دراصل ختن کے سوداگر کا لڑکا ہے۔ پھول گجرات کے زاہد کی بیٹی ہے، جس سے اسے عشق ہو گیا تھا۔ زاہد نے ناموس کو برباد ہوتے دیکھ کر دونوں کو بددعا دی جس سے وہ اس شکل میں تبدیل ہو گئے۔ بادشاہ کو گل و بلبل کی حالت پر افسوس ہوا۔ اس نے آیۃ الکرسی پڑھ کر دونوں پر ایک خاص الخاص انگوٹھی کو پھیرایا۔ اس سے دونوں اپنی اصلی شکل میں آگئے۔ شاہ کشمیر نے بڑی دھوم دھام سے ان دونوں کا بیاہ کردیا۔ سوداگر کے بیٹے کو منصب و اعزاز سے نوازا اور وہ ہر روز نئے نئے قصوں سے بادشاہ کا دل بہلانے لگا۔ ایک راجا جوگیوں کا بڑا عقیدت مند تھا۔ جوگیوں نے اس پر مہربان ہو کر اسے نقلِ روح کا منتر سکھایا۔ راجا نے ایک کمزور لمحے میں یہ منتر اپنے وزیر کو بتادیا۔ وزیر مکار اور دھوکے باز تھا۔ ایک دن شکار کے دوران میں راجا نے تفریحاً اپنی روح ایک مردہ بدن کے جسم میں داخل کی۔ وزیر نے فوراً اپنی روح راجا کے خالی جسد میں منتقل کی اور اس طرح دغا بازی سے سلطنت کا مالک بن گیا۔ راجا کی باعصمت رانی ستونتی نے جب راجا کی چال ڈھال میں فرق محسوس کیا، تو اس سے کٹنے لگی۔ ادھر اصلی راجا نے اپنے وزیر کی غداری دیکھ کر ہرن کا جسم چھوڑا اور توتے کی شکل اختیار کرلی۔ اس توتے کو نقلی راجا یعنی وزیر نے خریدا۔ ایک دن موقع پاکر توتے نے اپنی رانی یعنی ستونتی سے بات چیت کی۔ جب اسے رانی کی وفاداری کا یقین ہو گیا، تو اس نے وزیر کی مکاری اور اپنا ماجرا کہہ سنایا۔ دونوں نے مل کر اُسے ختم کرنے کی چال چلی۔ وزیر جب رات کو رانی سے اظہارِ محبت کرنے لگا، تو رانی نے کہا کہ اصلی راجہ تو نقلِ روح کا فن جانتا تھا، اگر تم وہی ہو تو سامنے کی مردہ قمری میں اپنی روح

منتقل کر کے دکھاؤ۔ وزیر ہوس میں دیوانہ ہو رہا تھا، اس نے ایسا ہی کیا۔ توتا تاک میں تھا، فوراً اپنے اصلی جسم میں آ گیا۔ قمری کو ہلاک کر کے اُسے پھینک دیا اور راجا پھر سریر آرائے سلطنت ہوا۔

تیسرا اور آخری قصہ مصر کے شہزادے ہمایوں فال اور ملکِ عجم کی شہزادی سمن بر کا ہے۔ دونوں کے دل عشق کے تیر میں چھدے ہوئے تھے۔ والدین کے خوف سے وہ اپنے اپنے ملک سے نکل کر ہندستان میں پناہ گزیں ہوئے اور ملک سندھ میں رہنے لگے۔ شاہ سندھ نے ایک مالن سے سمن بر کے حسن و جمال کا شہرہ سُنا تو ہوس کے ہاتھوں دیوانہ ہو گیا۔ وزیر سے مشورہ کر کے بادشاہ نے ہمایوں فال کو کشتی کی سیر اور شراب نوشی کی دعوت دی۔ دعوت کے دوران شطرنج کا دور چلا، شہزادے کو مات ہوئی اور اسے دریا میں اُتر کر کنول کا پھول توڑ لانے کو کہا گیا۔ شہزادہ جیسے ہی پانی میں اترا، ایک مچھلی نے اسے نگل لیا۔ شاہ سندھ نے شہزادی سمن بر پر ڈورے ڈالنے چاہے لیکن کامیابی نہ ہوئی اور سمن بر جوگن کا بھیس بدل کر شہزادے کی تلاش میں روانہ ہو گئی۔ شاہ مصر کو اپنے اکلوتے بیٹے کے دریا میں ڈوبنے کی خبر ملی تو اس نے سندھ پر دھاوا بول دیا۔ مصریوں کو فتح ہوئی۔ اپنی جاں بخشی کے لیے شاہ سندھ نے ایک طلسمی مچھلی کو حکم دیا کہ وہ شہزادہ ہمایوں فال کی خبر لائے۔ معلوم ہوا کہ جس مچھلی نے شہزادے کو نگلا تھا، وہ اسے جزیرہ سمن پر اُگل آئی ہے اور اب شہزادہ پریوں کی قید میں ہے۔ اس دوران میں سمن بر شہزادے کی کھوج میں ایک پری ملک آرا کی مملکت میں پہنچی۔ اس نے مدد کا وعدہ کیا۔ جزیرۂ سمن کے بادشاہ کو خط لکھے گئے۔ بالآخر پریاں شہزادے کو جزیرۂ سمن سے واپس لے آئیں۔ شہزادہ اپنی محبوبہ سمن بر اور اس کے بعد اپنے والدین سے ملا اور ہر طرف خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔

اس قصے میں سنسکرت اور عربی فارسی قصوں کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ قصے میں قصہ پیدا کرنے کا اصول بید بائے کی کہانیوں اور الف لیلیٰ سے لیا

گیا ہے۔ تمہیدی قصوں کے بعد جو داستانیں بیان کی گئی ہیں، ان میں بھی اسلامی اصل پر ہندی پیوندکاری بڑی خوش اسلوبی سے کی گئی ہے۔ کنچن پٹن، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، ہندستان ہی کا کوئی شہر ہے۔ خواب میں درویش کا نظر آنا اور بادشاہ کا اس کی تعبیر چاہنا، قصہ گوئی کا ایرانی انداز ہے۔ پہلی کہانی میں میر قصہّ ختن کے سوداگر کا لڑکا ہے۔ لیکن قصےّ کی جائے وقوع کشمیر اور اس کی ہیروئن گجرات کے زاہد کی بیٹی ہے۔ دوسرا قصہ خالص ہندستانی ہے۔ راجا کی جوگیوں سے عقیدت، روح کی نقلِ مکانی اور پرندوں کا انسانوں کی طرح باتیں کرنا، شک سپ تتی، بیتال پچیسی، پنچ تنتر وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ تیسرا قصہ ایرانی انداز کا ہے۔ اس کا ہیرو اور ہیروئن دونوں اسلامی ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن جس باغ میں ان دونوں کی ملاقات دکھائی گئی ہے، اس کا ذکر پڑھ کر ذہن بے اختیار ہندستان کے قدرتی مناظر کی طرف منتقل ہوتا ہے:

مدن مد کی مستی آتی گہ لالے — کھڑے تھے ہت میں لے مئے کے پیالے
ہرے ہور لال پیلے پات جھڑکر — چمن میں ہر طرف ہر ٹھار پڑکر
بھنور پھولاں پو بیٹھے سود سے یوں — کہ مکھ پر گل رخاں کے خال ہے جیوں
پھریں پھولاں پہ بلبل کھول یوں بال — کہ اڑتے ہیں پتنگ جیوں شمع اپرال
پتمبر باند پیلے پکاں آئے — کنواریاں کر منجھی کیاں اپسیس دکھلائے
ہونٹوے آئے موراں ناچنے کوں — کرے تھے لال طوطیاں پان کھاموں

شہزادہ اور شہزادی دونوں مصر و عجم سے فرار ہوکر ہندستان میں پناہ لیتے ہیں اور شہر سندھ میں گنگا کے کنارے ایک محل میں رہنے لگتے ہیں۔ اس زمانے میں فاصلوں کی دوری کی وجہ سے غالبًا ابن نشاطی کو شمالی ہند کے جغرافیے کا صحیح علم نہ تھا ورنہ وہ دریائے گنگا کو سندھ کے علاقے میں بہتا ہوا نہ دکھاتا۔ شاعر نے ملک سندھ اور دریائے گنگا کے منظر کو یوں بیان کیا ہے:

کتے تھے نانوں اس کا شہر سندکر — قرار یوں تھا کہ وہ ہے اصل ہندکر

تھے گھر پر گھر یتے اس شہر میں ڈاٹ — کہ واں بارے کے نیں تھا شخص کوں باٹ
اتھا نیر اس ندی کا دودتے صاف — مٹھائی میں کرے وو شہد پر لاف
نچھل نیر اس ندی کا دیکھ جیچوں — سٹیا غیرت سوں دریا میں آپس کوں
دیکھ اس آب رواں کوں شطِ بغداد — پڑیا غیرت سوں جا دریا میں آزاد
دیکھ اس میں خوب گن پیدا و پنہاں — چھپا ظلمات میں جا آب حیواں
حباب اچھے جو اس ابرار کے تھے — مگر دیدے اولی الابصار کے تھے

شاہ سندھ اور بادشاہ مصر میں جنگ کے بعد شہزادی اپنے "گوہر گم شدہ" کی تلاش میں نکلتی ہے تو جوگن کی وضع اختیار کرتی ہے۔ ایسا بعض دوسری اُردو مثنویوں میں بھی پایا گیا ہے۔ مثلاً مثنوی سحر البیان میں نجم النسا، مثنویِ عالم (تصنیف نواب بادشاہ محل صاحبہ ۱۸۵۳ء) میں بزم افروز اور دل پذیر اور مثنوی لذتِ عشق میں بیدار بخت میر قصہ کا سراغ لگانے کے لیے یہی وضع اختیار کرتے ہیں۔ گاؤں گاؤں گھومنے کے لیے کسی عورت کا جوگن کی وضع اختیار کرنا قدیم ہندستانی حالات میں مناسب ترین طریقہ تھا۔ ملاحظہ ہو، ابن نشاطی ایک ایرانی شہزادی کو ہندستانی روپ میں کیسی کامیابی سے پیش کرتا ہے:

بھبھوتی اپنے موں کو پھر لگائی — پنم کا چاند بادل میں چھپائی
برہ کے درد دک سوں پدمنی وو — چلی بنواس لے بیراگنی وو
پڑی دُک غم کی آ سینے اُپر سل — چلی پھرتی جنگل کی ہوکے کوئل
یو نازک ناز کی ناری نویلی — یو نازک چھند کے چھب کی چھبیلی
کدھیں پھولاں اپر چلتی جو جاوے — چھلے پاواں کوں آکر تلملاوے
وہ ایسی ناز کی تے ہاتھ دھو شوخ — دیکھو نکلی ہے کیوں پردیس تے شوخ

یہ جوگن جگہ جگہ اپنے دلبر کو تلاش کرتی ہوئی ایک جزیرے میں پہنچتی ہے۔ یہاں سونے چاندی سے جگمگاتے ہوئے محلات میں طرح طرح کے نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ شاعر جہاں ترکوں کی رزم کا منظر دکھاتا ہے، وہاں قطب

شاہیوں کی بزم کی تصویریں بھی پیش کرتا ہے:

کہیں بلبل کوں پھولاں پر لکھے تھے کہیں بھنورے کہیں تیتر لکھے تھے
لکھے تھے ترکماناں کی کہیں رزم لکھے تھے قطب شاہاں کی کہیں بزم
تھے حیراں چین کے نقاش سارے چتر ایسا چتارے تھے چتارے

ابن نشاطی کے دل میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مصر کا بادشاہ جب ملکِ سندھ پر چڑھائی کرتا ہے تو شاہ سندھ اسے وزیر کے ذریعے کہلوا بھیجتا ہے:

گھڑی میں مار مصریاں کوں بھگاویں ہمیں ہندی اگر جھگڑے پہ آویں
ہمارا کام ہے شمشیر بازی ہمارا فن ہے کرنا ترک تازی
انن کو دیکھ جنگل پکڑے شیراں دلیری میں یو ایسے ہیں دلیراں
انوں کی بات سوں جھڑتی ہے انگار نہیں چقمک سوں کس کوں کام اس ٹھار
وہی بانچے خدا جس کو سنبھالے اگر نکلیں جو لیں ہاتھاں میں بھالے

مثنوی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن نشاطی نہایت قادرالکلام شاعر تھا۔ حیرت ہے کہ ایسے صاحبِ کمال فن کار کا ابھی تک صرف ایک کارنامہ معلوم ہوا ہے۔ قدیم دکھنی معیار کی رو سے اس کی زبان ایسی صاف اور اندازِ بیان ایسا منجھا ہوا، پختہ اور بے رخنہ ہے کہ پھول بن کو اس کی اولین تصنیف قرار دینے میں ہمیں تامّل ہے۔ ولی سے پیشتر کے تمام دکھنی ادبیات میں سوائے محمد قلی کے ابن نشاطی ہی ایک ایسا شیوا بیان شاعر ہے، جس کے کلام میں آورد کا نام و نشان نہیں۔ اس کی طبیعت ایک ایسا چشمہ ہے، جس سے شیریں اشعار کا جھرنا ہمیشہ بہتا رہتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ پھول بن میں ۳۹ صنعتیں استعمال کی گئی ہیں۔ اس کے باوصف مثنوی کی زبان بڑی سادہ، سلیس، شگفتہ اور دلکش ہے۔ جو لوگ دکھنی شاعری سے لطف اندوز ہونے کا ذوق و شوق رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ زورِ تخیل اور روانیِ طبع میں نشاطی کا وجہی اور غواصی سے

کوئی مقابلہ نہیں۔ کہیں کہیں تو اس کا قد نصرتی سے بھی نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ الفاظ کا ساحر ہے اور ان کے مناسب ترین استعمال پر حیرت انگیز قدرت رکھتا ہے۔ دوسرے قصے میں راجا توتے کی شکل میں اپنی وفاشعار رانی کا امتحان لینے کے لیے پوچھتا ہے کہ اے گُلِ گلشنِ خوبی! تیری جوانی کا رنگ کیوں برباد ہوا۔ رانی آہ کھینچ کر جواب دیتی ہے کہ "جب دیا نہ ہو تو رات کیسے سہاتی ہے۔ جب منہ میں پان نہ ہو تو چہرہ کیونکر بھلا لگتا ہے۔ فراق میں جان دینا آسان ہے لیکن پیا کے انتظار میں زندہ رہنا مشکل! پریشانی اور وسوسے کا شکار ہوں لیکن محبت میں ثابت قدم ہوں۔ شمع کی مانند جل رہی ہوں، مگر اپنی جگہ سے ٹلی نہیں"۔ اصل اشعار یہ ہیں:

کہ سب عالم اوپر روشن ہے یو بات — دیوا نیں سو سہاوے کس سندر رات
جو نیں جس کے اچھے گاموں میں تنبول — وہ کیوں کر خوب دستا موں سوتوں بول
برہ میں جیو دنیا بھوت آساں — ہے جینا پیو بن مشکل نگر جاں
پریشانی میں گرچہ میں علم ہوں — محبت میں ولے ثابت قدم ہوں
اگرچہ شمع کے نمنے جلی ہوں — ولے جاگے تے اپنے نیں ٹلی ہوں

ان تشبیہوں اور استعاروں کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ جزئیات کے بیان، مکالموں کی برجستگی اور مناظر کی تصویر کشی میں بھی ابن نشاطی اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اس کا زورِ طبیعت بلند اور پست کسی شے کو خاطر میں نہیں لاتا اور اس کے قلم میں بلا کی روانی اور برش ہے۔ اس کے اشعار دل سے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی آواز میں رس ہے اور اس کے زبان و بیان کا لوچ، اس کی مدھرتا، گھلاوٹ اور سریلاپن دل پر گہرا اثر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پھول بن دکھنی مثنویوں میں امتیازی مقام کی مستحق ہے۔ شاعرانہ لطافت اور انداز و بیان کی خوبیوں کے باوصف اس مثنوی کی عظمت کا ایک گوشہ یہ بھی ہے کہ اس میں ایک مخلوط قصہ پیش کرتے ہوئے ہند ایرانی معاشرے کے ذوق و احساس کو ملحوظ

رکھا گیا ہے۔ دکھنی ادبیات میں ایسی مثنویوں کی کمی نہیں جو مقامی قصوں سے ماخوذ ہیں یا عوامی بنیاد کی روایات پر لکھی گئی ہیں۔ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک سے جو مخلوط معاشرت پیدا ہوئی تھی اور اس کا جو اثر اپنے زمانے کے قصوں پر پڑا، دکھنی مثنویوں میں اس کی بھرپور اور کامیاب نمایندگی مثنوی پھول بن ہی کرتی ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے صحیح کہا ہے کہ پھول بن کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ شاعر نے قصے کو اپنے زمانے اور ماحول کے چوکھٹے میں بٹھایا اور اس میں اپنے گردو پیش کے مخلوط معاشرتی کوائف کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔[۱۲]

مثنوی سحر البیان

میر حسن کی یہ مثنوی اُردو ادب کا لافانی شاہکار ہے۔ میر حسن نے یوں تو کئی مثنویاں لکھیں، لیکن جو قبول عام سحر البیان کو نصیب ہوا اور کسی مثنوی کے حصے میں نہ آیا۔ بہ قول میر حسن انھوں نے اس کہانی میں اپنی عمر صرف کردی تب کہیں جا کے بڑھاپے میں یہ مثنوی لکھی گئی۔ (سنہ اختتام ۱۷۸۴ء / ۱۱۹۹ھ) جان گل کرائسٹ کی فرمائش سے ۱۸۰۲ء میں میر بہادر علی حسینی نے اس کو نثر میں منتقل کیا۔[۱۳] کتب خانہ انڈیا آفس، لندن کی مطبوعہ ہندستانی کتابوں کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی میر حسن کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۰۳ء میں ۱۵۲ صفحات پر اور دوسرا ۱۸۰۵ء میں ۱۶۳ صفحات پر شائع ہوا۔ اس مثنوی کے ۱۸۰۳ء سے ۱۸۸۱ء تک کے ۱۹ مختلف ایڈیشن انڈیا آفس میں محفوظ ہیں۔[۱۴][۱۵] ۱۸۵۰ء میں مثنوی سحر البیان، نہال چند لاہوری کی گل بکاؤلی

---

۱۲ عبدالقادر سروری، اردو مثنوی کا ارتقا، ص ۷۵

۱۳ بلوم ہارٹ، برٹش کتب ۱۱۲

۱۴ انڈیا مطبوعات، ص ۱۶۴

۱۵ بلوم ہارٹ، برٹش کتب ۱۱۳

کے ساتھ بمبئی سے شائع ہوئی۔ تب سے اب تک اس کے بے شمار ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

اس قصے کو مندرجہ ذیل مصنفین نے اردو میں ڈرامے کے طور پر لکھا:

(۱) نوشیرواں جی مہربان جی، آرام[۱۶] (منظوم)

(۲) رونق بنارسی (پارسی وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی)[۱۷]

(۳) غلام حسین عرف حسینی میاں، ظریف[۱۸]

(۴) حافظ محمد عبداللہ (تماشائے دل پذیر آگرہ، ۱۸۸۹ء)[۱۹]

(۵) فقیر محمد تیغ[۲۰]

(۶) آغائے دہلوی (شگوفہ عشق)[۲۱]

(۷) فقیر محمد (بمبئی ۱۸۷۹ء اور ۱۸۸۱ء)[۲۲]

انگریزی سے اس کا ترجمہ C.E. Bowdler Bell نے ۱۸۷۱ء میں کلکتے سے شائع کیا۔[۲۳] M.H.Court نے بہادر علی حسینی کی نثر سے انگریزی میں ترجمہ کیا جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۹ء میں کلکتے سے شائع ہوا۔[۲۴]

مثنوی سحر البیان کا ہندی ترجمہ آگرہ سے ۱۸۶۳ء میں[۲۵] اور کلکتہ سے

---

۱۶ اردو ڈراما، عشرت رحمانی، ص ۱۸۳ اور ۲۰۴

۱۷ ایضاً، ص ۲۱۲

۱۸ ایضاً، ص ۲۲۰

۱۹ ایضاً، ص ۲۲۶ اور انڈیا مطبوعات، ص ۹۹

۲۰ ایضاً، ص ۲۲۶

۲۱ صدیق، ص ۷

۲۲ انڈیا مطبوعات، ص ۹۶

۲۳ بلوم ہارٹ برٹش کتب، ص ۱۱۳

۲۴ بلوم ہارٹ، برٹش ضمیمہ ۱۶۷، اس کا پہلا ایڈیشن ۷۲-۱۸۷۱ء میں الہ آباد سے شائع ہوا مقالات دتاسی ص ۲۱۱

۲۵ ہندی کتب برٹش، کالم ۶۵

۱۸۸۱ء میں[۲۶] شائع ہوا۔ "سنگیت بدر منیر" کے نام سے یہ میرٹھ سے بھی ۱۸۷۶ء میں چھپا۔[۲۷] پنجابی زبان میں اسے امام الدین نے "قصہ بدر منیر" کے نام سے منتقل کیا۔ یہ ترجمہ اُردو رسم الخط میں لاہور سے ۱۸۷۷ء میں شائع ہوا۔[۲۸]

پشتو زبان میں مثنوی میر حسن کا منظوم ترجمہ ملّا احمد تراہی نے کیا۔ یہ کتاب مَرَگ سے ۱۸۸۲ء شائع ہوئی۔[۲۹]

مثنوی کا قصہ سادہ اور مختصر ہے: کسی شہر مینوسواد کے بادشاہ کے ہاں بڑی منتوں اور مرادوں سے لڑکا پیدا ہوا۔ بے نظیر نام، حسن و جمال سے بہرہ مند تھا۔ نجومیوں نے پیشین گوئی کی کہ یہ بارہ سال کی عمر میں رنج و تعب میں گرفتار ہوگا۔ بارہویں سال کی آخری رات کو شاہزادہ کوٹھے پر چاندنی میں سویا ہوا تھا کہ ایک پری ادھر سے گزری۔ صورت دیکھتے ہی فریفتہ ہوگئی۔ اور شہزادے کو تخت پر اڑا کر پرستان لے آئی۔ شہزادہ ایک رات پری کے دیے ہوئے کل کے گھوڑے پر سیر کرتا ہوا سراندیپ جا نکلا۔ یہاں اس کی نظریں سراندیپ کے بادشاہ مسعود شاہ کی گل اندام بیٹی بدر منیر سے چار ہوئی۔ دونوں گرفتارِ عشق ہوگئے۔ ادھر ایک دیو نے پری کو اس واقعہ کی خبر کردی اور پری نے اس جرم کی پاداش میں شہزادے کو ایک کنویں میں قید کردیا۔ بدر منیر کی سہیلی وزیر زادی نجم النساء بے نظیر کی تلاش میں جوگن بن کے نکلی اور جنوں کے بادشاہ کے بیٹے فیروز بخت کی مدد سے بے نظیر کو رہا کروالائی۔ سب کے بُرے دن پھرے۔ بچھڑے ملے۔ بے نظیر کا بدر منیر سے اور فیروز بخت کا نجم النساء سے بیاہ کیا گیا اور بے نظیر خوش و خرم وطن لوٹ آیا۔

میر حسن کی جادو بیانی اور سحر طرازی نے قصے کو واقعی سحر البیان بنادیا۔

---

۲۶ انڈیا ہندی، ص ۶۸

۲۷ ہندی کتب برٹش، کالم ۱۲

۲۸ انڈیا پنجابی، ص ۱۸ نیز پنجابی کتب برٹش کالم ۲۲

۲۹ پشتو کتب برٹش کالم ۲۱

میر حسن نے نئی طرز اور نئی زبان کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ صحیح بھی ہے۔ زبان نئی اس لیے کہ جس زمانے میں یہ مثنوی لکھی گئی، لکھنؤ کے شاعر دبستان دہلی کی شیریں بیانی اور سادہ گوئی کی روشوں سے منحرف ہونے لگے تھے۔ نئی طرز اس لیے کہ یہ نہ کسی فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے اور نہ کسی بندھے ٹکے قصے پر مبنی ہے۔ میر حسن کا قصہ طبع زاد ہے اور اس کا رنگ و آہنگ مخلوط تہذیب و معاشرت سے لیا گیا ہے۔ حیرت و استعجاب کا عنصر پیدا کرنے کے لیے میر حسن نے قصے کی جائے وقوع کو صیغۂ راز میں رکھا ہے۔ بے نظیر کا باپ کسی ''شہرِ مینوسواد'' کا بادشاہ تھا۔ یہ شہر کون سا ہو سکتا ہے، مثنوی کے ان اشعار پر نظر ڈالتے ہی اس کا جواب مل جاتا ہے:

عمارت تھی گچ کی وہاں بیشتر — کہ گزرے صفائی سے جس پر نظر
کہیں چاہ منبع کہیں حوض و نہر — ہر اک جا پہ آبِ لطافت کی لہر
کروں اس کی وسعت کا کیا میں بیاں — کہ جوں اصفہاں تھا وہ نصفِ جہاں
ہنرمند واں اہل حرفہ تمام — ہر اک نوع خلقت کا تھا ازدحام
یہ دلچسپ بازار تھا چوک کا — کہ ٹھیرے جہاں پر وہیں دل لگا
جہاں تک کہ رستے تھے بازار کے — کہے تو کہ دستے تھے گلزار کے
کہوں قلعہ کا اس کے میں کیا شکوہ — گئے دب بلندی کو دیکھ اس کی کوہ

قلعہ، بازار، چوک، نہر ان کا ذکر آتے ہی ذہن فوراً دہلی مرحوم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ مثنوی کا دوسرا منظر سراندیپ کا ہے، جہاں بے نظیر اور بدر منیر کی ملاقات ہوتی ہے۔ یہ نام بھی محض خیالی ہے ورنہ وہاں کے قدرتی نظاروں اور معاشرت و تمدن سے بھی اہل دہلی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ بدر منیر کا لباس اور پہناوا قلعۂ معلیٰ کی شہزادیوں کا سا ہے۔ ہندستان کی آب و ہوا کے مدِ نظر یہ لباس عربی و ایرانی لباس کے مقابلے میں نازک تر اور ہلکا پھلکا ہے۔ آب رواں کی پشواز، جالی کی حباب سی اوڑھنی اور جواہر نگار باریک کرتی،

زیوروں میں بازوؤں پر ڈھلکے ہوئے نورتن اور بھجند۔ گلے میں جڑاؤ ہار اور ڈھگڈگی، کانوں میں کرن پھول اور بالیاں، نیچے موتی کے دو لڑے اور پچ لڑے، چمپاکلی چمکتی ہوئی، زمرد کی پہنچی اور پاؤں میں چھلّے۔ یہ سب سنگار ہندی عورت کی تصویر پیش کرتا ہے۔ بدر منیر کی چوٹی میں کناری ہے، ماتھے پر ٹیکا، آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پر مسّی اور پان کا لکھوٹا:

وہ مسی وہ اس کے لب لعل فام — سوادِ دیار بدخشاں کی شام
وہ آنکھوں کا عالم وہ کاجل غضب — کہے تو پڑی نرگستاں میں شب
لکھوٹا وہ پانوں کا مسّی کے ساتھ — کہ جوں دامنِ شب شفق کے ہو ہاتھ
وہ پشواز اک ڈانگ کی جگمگی — ستاروں کی تھی آنکھ جس پر لگی
وہ اک اوڑھنی جالی مقیش کی — پڑی چاندنی سی مہ عیش کی
جو دیکھے وہ انگیا جواہر نگار — فرشتہ ملے ہاتھ بے اختیار
وہ باریک کرتی مثال ہوا — عیاں موبمو جس سے تن کی صفا
ڈلک سُرخ نیفے کی اُبھری ہوئی — گلابی سی گرد ایک تہ دی ہوئی
بھری مانگ موتی سی جلوہ کناں — نمایاں شبِ تیرہ میں کہکشاں
وہ ماتھے پہ ٹیکے کی اس کے جھلک — سحر چاند تاروں کی جیسے چمک
وہ بالے کی تابندگی زیرِ گوش — جسے دیکھ اڑ جائیں بجلی کے ہوش
وہ تیکیے پہ چمپاکلی کی پھبن — کہ سورج کے آگے ہو جیسی کرن
وہ چھاتی پہ الماس کی ڈھگڈگی — رہے آنکھ سورج کی جس پر جھکی
وہ موتی کے مالے لٹکتے ہوئے — رہیں دل جہاں سر ٹپکتے ہوئے
وہ بھجبند بازو کے اور نورتن — کہ جوں گل سے ہو شاخ زیرِ چمن
وہ پہنچی زمرد کی اور دست بند — نزاکت میں بھی شاخِ گل سے دو چند
وہ بالوں کی بو رشکِ مشکِ ختن — وہ ڈوبا ہوا عطر میں پیرہن

اور یہ صرف پہناوے یا سامانِ آرائش ہی میں نہیں، بلکہ سارے کا سارا رہن سہن

ہندستانی ماحول کی تصدیق کرتا ہے۔ بے نظیر، بدر منیر سے ملاقات کے لیے باغ میں آنے والا ہے۔ ملاحظہ ہو، میر حسن نے اپنے زمانے کے دیوان خانے کی کیسی سچی تصویر پیش کی ہے:

بچھا فرش اور کر چھپر کھٹ کو صاف — مرصع کا اس پر اُڑھا کر غلاف
دھری کیاریاں اک طرف بے شمار — چنی اک طرف ڈالیوں کی قطار
چھپر کھٹ کے پاس اک مسند بچھا — اور اس پر تمامی کے تکیے لگا
چنگیریں بنا اور رکھ پاندان — قرینے سے اس میں رکھے ہارپان
کئی عطر داں واں مرصع دھرے — انوکھی گڑھت کے کئی چوگھڑے
دھرا اک طرف گنجفہ خوش قماش — دھری اک طرف چو پڑِ غم تراش
بچھی ایک چوکی، پڑا تورہ پوش — کریں دیکھ کر غش جسے بادہ نوش

ایک اور مقام پر بدر منیر کے گھر کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

زمرد کا مونڈھا چمن میں بچھا — وہ بیٹھی عجب آن سے دل ربا
خواص ایک حقّہ لیے تھی کھڑی — کہ لالے کی پتی تھی اس میں پڑی
وہ شیشہ کا حقّہ مرصع کا کام — مغرق زری کا وہ نیچہ تمام
کوئی مورچھل لے کوئی پیک دان — کوئی لے چنگیر اور کوئی ہار پان
رسیلی چھبیلی بنی تنگ و چست — لباس اور زیور سے ہر اک درست
کھڑی نیچی آنکھیں کیے باادب — اسی شرم سے پر قیامت غضب

یہ خواصیں، کنیزیں، لونڈیاں، مغلانیاں وغیرہ سب کی سب ہندستانی ہیں اور مقامی رہن سہن کی جھلک پیش کرتی ہیں۔ ان کے لباس، پوشاک، نشست و برخاست اور آداب و اوضاع مغلیہ محلات کی اس معاشرت کی یاد دلاتے ہیں جس میں ایرانی اور ہندی رنگ مل جل کر ایک ہوگئے تھے۔ میر حسن کے سحر آفریں قلم نے ان مرقعوں کے نقوش ایسی چابک دستی سے نمایاں کیے ہیں کہ ان کی رنگینی اور دلکشی ہمیشہ کے لیے قائم ہو کے رہ گئی ہے۔

جہاں تک مثنوی کی ہیئت و ترتیب کا تعلق ہے سحر البیان میں فارسی مثنویوں کا تتبع کیا گیا ہے۔ ابتدا میں حمد و نعت اور اس کے بعد ''مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات'' کا عنوان ہے۔ شاہِ عالم کی مدح میں چند شعر ہیں۔ پھر آصف الدولہ کی مدح سرائی ہے اور شاعر اپنے عجز و انکسار کے ذکر سے قصہ شروع کرتا ہے۔ فارسی مثنویوں کی طرح قصے کے ہر نئے بیان کا عنوان ہے اور اسے ساقی نامے کا التزام رکھتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ افرادِ قصہ کے نام بھی ایرانی ہیں۔ بے نظیر، بدر منیر، فیروز بخت، نجم النسا، ماہ رخ، مسعود شاہ، لیکن ان کا طریقِ زندگی، طرزِ معاشرت، آداب و اطوار اور کردار و گفتار مقامی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ بادشاہ اپنے بیٹے کی اُمید میں منتیں مانتا ہے اور مسجدوں میں جاجا کر دیے جلاتا ہے۔ بیٹے کی پیدائش پر شہنائی اور قرنا بجایا جاتا ہے۔ بھانڈ اور بھگتیوں کا ہجوم ہے۔ خواصوں اور خوجوں کو جوڑے دیے جاتے ہیں اور مشائخ اور پیرزادوں کو جاگیریں تقسیم ہوتی ہیں۔ پھر بے نظیر کا زائچہ بنانے کو جہاں رمال اور نجومی بلائے جاتے ہیں وہاں برہمن بھی پوتھی کھولے گرہ اور پچھتر کا حساب لگاتے نظر آتے ہیں۔ بے نظیر جب پاؤں چلنے لگتا ہے تو اس کے نام سے بروے آزاد کیے جاتے ہیں۔ یہ سب رسمیں ہندستانی مسلمانوں کی ہیں۔

بے نظیر کے باغ میں ایرانی اور ہندی پھول پھل ایک ساتھ بہار دکھلاتے ہیں۔ ایک طرف اگر لالہ، شبو، اشرفی، جعفری اور گیندا اپنے جلوۂ صد رنگ سے آنکھوں کا نور بڑھاتے ہیں تو دوسری طرف چنبیلی، موتیا، مدن بان، رائے بیل اور موگرا بھی مشامِ جاں کو معطر کیے دیتے ہیں۔ چمپا کے جھاڑ کے جھاڑ الگ کھڑے ہیں۔ مولسریوں اور کیلوں کی چھاؤں میں آنکھیں لگی جاتی ہیں۔ درختوں پر بگلے اور منڈیروں پر مور جھنگارتے ہیں۔

شہزادے کے بارہ سالہ ہونے پر سواری یوں نکلتی ہے گویا کسی مغل بادشاہ کی تخت نشینی کا جلوس جارہا ہے۔ شہنائی و نوبت کی صدا، گھوڑوں پر نقارچی، پھرتیلے کہار، تاش کی پگڑیاں، زربفت کی کرتیاں، مقیش کے جھلکتے

سائبان، چوبدار اور جلوہ دار، قلعے سے شہر تک بادلے کی جھلک اور تمامی سے منڈھے ہوئے در و دیوار۔ یہ سب وہ نظارے ہیں جن سے دہلی کے کوچہ و بام ناآشنا نہیں۔

نجم النسا کا بے نظیر کی تلاش کے لیے جوگن کی وضع اختیار کرنا خالص ہندستانی تخّیل ہے۔ میر حسن نے اسے مٹکے ٹھنکے، سیلی، سُمرن، یک تارے مندرے، مرگ چھالا وغیرہ تمام ضروری ساز و سامان سے لیس دکھایا ہے۔

ہندستانی موسیقی کی تانوں اور اربابِ نشاط کا ذکر مثنوی میں بے نظیر کے پیدا ہونے، عیش بائی کے مجرا کرنے اور شادی کی محفل آراستہ ہونے کے موقعوں پر آیا ہے۔ ان مقامات پر میر حسن نے ہندستانی طوائفوں، رقاصاؤں اور کنچنیوں کے نک سک اور انداز و اطوار کی جو تفصیل پیش کی ہے، وہ بے مثل ہے۔ مثنوی میں جن سازوں اور راگ راگنیوں کا ذکر آیا ہے، یہ ہیں: پرم جوگ، بچھی، پرملو، دھرپت، گیت، گوری، کدارا، ٹپا گنگری، ایمن وغیرہ۔

ساز: شہنائی، ارانا، ٹکورے، ترھئی، قرنا، کھرج، جھانج، طبلہ، مردنگ، گھنگھرو، پکھاوج، ڈھول وغیرہ۔

شادی بیاہ کی رسموں میں تو ہندستانی مسلمانوں کی شاید ہی کوئی رسم ہو، جو میر حسن نے نظم نہ کی ہو۔ بے نظیر کی برات کا نقشہ بالکل ہندستانی شاہی براتوں کا سا ہے۔ آتش بازی کی رونق، باجوں کا شور، روشنی کی چمک دمک، دلہن کے گھر برات کی پیشوائی، مجرا، گھوڑیاں، شہانے، سمدھنوں کے تڑاکے، آرسی مصحف، سرونج پسوانا، نبات چنوانا، ٹونے سلونے، منڈھا اور رخصتی غرض ایک ایک رسم گن گن کر بیان کردی ہے۔

مثنوی سحر البیان میں میر حسن نے ایرانی طرز کا قصہ بیان کیا ہے۔ لیکن لوح سے تمت تک اس میں کوئی مقام ایسا نہیں جہاں اجنبیت کا احساس پیدا ہو۔ بے نظیر اور بدر منیر متاخرین مغلوں کی تہذیبی شائستگی اور معاشرتی لطافت اور نفاست کی کامیاب ترجمانی کرتے ہیں۔ شہر مینو سواد سے پرستان اور پرستان سے

سراندیپ تک ہر جگہ ہندستانی زندگی کا سونا پگھلا ہوا ہے۔ یہاں کے قدرتی نظارے، باغات، روشیں، نہریں، پھول پھل، تخت رواں، نوبت اور روشن چوکیاں، جلوسوں کی پالکیاں، رتھ، ہاتھی، ٹونے کرتی ہوئی عورتیں، قہقہے لگاتی ہوئی سمدھنیں وغیرہ ہر منظر جانا پہچانا معلوم ہوتا ہے۔ مثنوی سحرالبیان کی حیرت انگیز مقبولیت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ میر حسن نے اپنے زمانے کی مخلوط معاشرت اور تہذیب و تمدن کی کامیاب عکاسی بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے کی ہے۔

مثنوی گلزارِ نسیم

دیاشنکر نسیم (۱۸۱۱۔۱۸۴۳ء) کی مثنوی گلزارِ نسیم، گل بکاؤلی کے مشہور قصے پر مبنی ہے۔ اس قصے کی اصل کے بارے میں بہت کم معلوم ہے۔ اصغر گونڈوی[۳۰] اور عبدالقادر سروری[۳۱] قصہ گل بکاؤلی کو ہندستانی الاصل قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ بیان محلِ نظر ہے۔ ایرانی داستانوں سے ملتے جلتے واقعات کی موجودگی میں اس قصے کو ہندستانی الاصل قرار دینا ادبی تحقیق کے خلاف ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے، اس قصے کا تعلق ہندستان کی کسی مذہبی، قومی یا عوامی روایت سے نہیں، نہ یہ کسی سنسکرت کتاب سے ماخوذ ہے۔ اس قصے کو کلیتاً ایرانی بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کے ایک حصے میں ہندستانی لوک کہانیوں سے ملتے جلتے واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ دراصل یہ ایک مخلوط قصہ ہے، جس کی تشکیل قصے کہانیوں کی ملی جلی ہند ایرانی روایتوں سے ہوئی ہے۔ ہندو مسلمانوں کے اختلاط سے ہندستان کی لوک کتھاؤں، قصوں یا داستانوں پر جو اثرات پڑے، یہ قصہ ان کی ایک دلچسپ مثال ہے۔

---

۳۰ یادگار نسیم مرتبہ اصغر، مقدمہ ص ۱۱

۳۱ اردو مثنوی کا ارتقاء، ص ۱۱۵

فارسی نسخے

۱۔ گل بکاؤلی از عزت اللہ بنگالی، ۱۱۳۴ھ[۳۲]

ایتھے کا بیان ہے کہ عزت اللہ بنگالی نے قصہ گل بکاؤلی اپنے ایک دوست محمد کی فرمائش پر "ہندستانی زبان" سے فارسی میں منتقل کیا۔ ترجمے کا کام ۱۱۳۴ھ یا اس سے پہلے شروع ہوا۔ لیکن ابھی یہ مکمل نہ ہوا تھا کہ ناگہانی طور پر محمد کا انتقال ہو گیا اور عزت اللہ بنگالی نے یہ قصہ یکم ذی الحجہ ۱۱۳۴ھ کو ختم کیا۔[۳۳]

۲۔ مثنوی رفعت (قصہ گل بکاؤلی)[۳۴]

۳۔ مثنوی از فرحت (اواخر بارہویں صدی ہجری) قلمی نسخہ کیمبرج یونیورسٹی[۳۵] یہ غالباً فرحت عظیم آبادی ہی ہیں، جو راسخ عظیم آبادی کے شاگرد تھے اور ۱۱۹۱ھ میں فوت ہوئے۔[۳۶]

استدراک: ۱۱۹۱ھ میں مرنے والے فرحت، راسخ کے شاگرد نہ تھے۔ راسخ کے شاگرد کا نام خواجہ فیض اللہ ہے۔[۳۷] ۱۱۹۱ھ میں مرنے والے فرحت کا نام فرحت اللہ تھا اور یہ خان آرزو کے شاگرد تھے۔[۳۸] مثنوی والے فرحت ان سے مختلف ہیں۔

---

۳۲ ایتھے نمبر ۸۲۸ اور ۸۲۹، نیز برلن کیٹالاگ ص ۹۹۶ (بحوالہ باڈلین ص ۱۲۹۰)

۳۳ ایضاً

۳۴ معارف اگست ۱۹۴۶ء، ص ۱۳۰ بانکی پور، ج ۷، ص ۱۸۵

۳۵ بحوالہ مضامین ہاشمی، ص ۴۴۸

۳۶ نثری داستانیں، ۱۶۲

۳۷ مثنویات راسخ مقدمہ، ص ۱۰۲

۳۸ سخنِ شعرا، ص ۳۶۳

اُردو نسخے

۱۔ دکھنی نسخہ مکتوبہ ۱۰۳۵ھ، مصنف نامعلوم۔ بارود خانہ اودھ کے شاہی قطب خانے میں تھا[۳۹] غالباً فارسی، اُردو میں قصۂ گل بکاؤلی سے متعلق یہ قدیم ترین نسخہ ہے۔

مثنوی گل بکاؤلی دکھنی نسخہ، تعداد صفحات ۱۳۰، فی صفحہ ۱۵ ابیات۔

آغاز:

سنو ناں ہوں اک شہر کا تاجدار　　دھری مال ہور مملکت بے شمار[۴۰]

۲۔ مثنوی تحفہ مجلسِ سلاطین۔ اشپرانگر نے اس مثنوی کے نام کو تاریخی قرار دے کر اسے ۱۱۵۱ھ کی تصنیف بتایا ہے[۴۱] حالانکہ اس سے یہ اعداد برآمد نہیں ہوتے۔

۳۔ مثنوی تحفہ مجلس سلاطین، اسے اشپرانگر نے کانپور کے کسی ذاتی کتب خانہ میں دیکھا تھا۔ تعداد صفحات ۴۶۲، فی صفحہ ۱۱ اشعار، آغاز:

حمد کر اس خدائے یکتا کی　　چشمِ دل تیری جس نے بینا کی[۴۲]

۴۔ مثنوی گل گشت منظوم یا خیابانِ ریحاں۔ از ریحان الدین ریحاں۔ تقسیم ہند سے پہلے یہ مثنوی کتب خانۂ انجمن ترقی اردو، ہند میں تھی۔ اب یہ مثنوی انجمن میں نہیں ہے۔

آغاز:

ساقی میں تری ادا پہ قرباں　　صدقے مے و جام کے مری جاں[۴۳]

۳۹　اشپرانگر، ص ۶۳۵ نیز دتاسی، خطبات ۱۵۶

۴۰　ایضاً، ص ۶۳۴ اور ۶۳۵

۴۱　ایضاً

۴۲　ایضاً

۴۳　ایضاً

مثنوی خیابانِ ریحان کا تاریخی نام "باغ و بہار" ہے۔[۴۴] اس سے سالِ تالیف ۱۲۱۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ اشپرانگر نے ۱۲۱۲ھ لکھا ہے[۴۵] جو غلط ہے۔ مصنف "مثنویات" نے اس کا تاریخی نام "باغ و بہار" بتایا ہے۔[۴۶] یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ اس سے ۱۲۱۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ نومبر ۱۹۰۸ء کے رسالہ مخزن لاہور میں ریحان کی اس مثنوی پر مفصل تبصرہ شائع ہوا تھا۔ یہاں نمونے کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

اٹھ بیٹھی بکاؤلی پلنگ پر مانند طلوع مہر خاور
جس جا کہ نہ ہو صبا کو جرأت لے جاوے چرا کے گل کو نکہت
ہے آدمی کیا بساط کیا مال جلتے ہیں یہاں فرشتہ کے بال
جب ہاتھ ملایا ہوگا ہیہات باقی رہی ہوگی کون سی بات
اے کاش اسے پکڑنے پاتی کیا کیا مزے چوری کے چکھاتی

بقول اشپرانگر ۱۲۲۱ھ میں مصنف نے اس پر نظر ثانی کی۔ صفحات ۶۵۰، ۱۵ بیت فی صفحہ[۴۷]

۵۔ مذہبِ عشق از نہال چند لاہوری، ۱۲۱۷ھ[۴۸] یہ عزت اللہ بنگالی کے فارسی نسخے سے ترجمہ ہے۔ ترجمے کا کام گل کرائسٹ کی نگرانی میں ہوا۔ اس پر نظرِ ثانی دوسری اشاعت کے وقت شیر علی افسوس نے کی۔ یہ کتاب پہلی بار

---

۴۴ معارف، اگست ۱۹۴۶ء

۴۵ اشپرانگر، ص ۶۳۴

۴۶ مثنویات امیر احمد علوی، ص ۵۱

۴۷ اشپرانگر ص ۶۳۴، دتاسی اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ "یہ نظم دوسری نظموں سے طویل ہے۔ اس میں ۴ باب ہیں اور ہر باب کو گلشن سے تعبیر کیا گیا ہے"۔ خطبات ۱۵۶

۴۸ آثار الشعرائے ہنود ص ۱۳۵، باڈلین ص ۱۲۹۰، نیز ایشیاٹک نمبر ۱۷۴۱، ادارہ ادبیات جلد نمبر ۶۹۔۹۷۔۲۶۱، جلد دوم ۱۲۱۔۱۵۱، جلد سوم ۶۳۵

کلکتے سے ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی۔[۴۹] انڈیا آفس لائبریری میں مذہب عشق (از نہال چند لاہوری) کے ۱۸۰۴ء سے ۱۸۸۹ء تک کے ۲۰ مختلف ایڈیشن محفوظ ہیں۔[۵۰]

۶۔ مثنوی گلزارِ نسیم از دیا شنکر نسیم ۱۲۵۴ھ۔ نسیم کے ماخذ ریحاں کی اُردو مثنوی اور رفعت کی فارسی مثنوی ہیں۔[۵۱] سید ظہور حسن رامپوری اپنے مضمون ''مثنوی گلزار نسیم کے مآخذ'' میں لکھتے ہیں: ''ان تینوں مثنویوں (باغ و بہار از ریحان، مثنوی رفعت لکھنوی اور گلزارِ نسیم) کا تعلق ایک ہی قصہ سے ہے۔ ایک ہی بحر ہے اور نام اور مقام بھی ایک ہی ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر مصرعوں اور شعروں کا لفظ بہ لفظ مثنوی گلزار نسیم میں موجود ہونا خود اس خیال کا بڑا موید ہے کہ نسیم کی نظر سے پہلی یا دوسری یا دونوں مثنویاں ضرور گزری ہیں۔ مثنوی گلزارِ نسیم کا سنہ تصنیف ۱۲۵۴ھ ہے اور ''باغ و بہار'' کا سال تالیف ۱۲۱۱ھ ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گلزارِ نسیم، باغ و بہار سے ۴۳ سال بعد وجود میں آئی۔ رفعت لکھنوی نے صراحت کردی ہے کہ اس نے قصہ فارسی نثر سے لیا۔ اس کا سنہ تصنیف نہیں ملا۔ لیکن اس کے بعض مصرعوں اور شعروں کا ہو بہو ترجمہ مثنوی گلزار نسیم میں پایا جاتا ہے''۔ اس کے بعد مضمون نگار نے تینوں مثنویوں کے ہم مضمون اشعار نقل کر کے ان کی مطابقت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔[۵۲] مگر خود نسیم اپنی مثنوی کو اردو نثر سے ماخوذ بتاتے ہیں:

---

۴۹ بلوم ہارٹ، برٹش ص ۱۴۳ (برٹش میوزیم میں اس کتاب کے گیارہ مختلف ایڈیشن محفوظ ہیں) ہندی میں مذہب عشق کا ترجمہ ''بکا و سمن'' کے نام سے بیج سنگھ ورمانے کیا۔ لکھنؤ ۱۹۷۴ء۔ نہال چند کے قصے کے جواب میں شاہ فقیراللہ حیدر ورنگلی نے قصہ تناولی لکھا (ادارہ ادبیات اول ۲۰۵)

۵۰ انڈیا مطبوعات، ص ۱۴۰۔۱۴۱

۵۱ معارف ۱۹۴۶ء، ص ۱۳۰

۵۲ معارف اگست ۱۹۴۶، ص ۱۳۰

افسانہ گلِ بکاؤلی کا افسوں ہو بہار عاشق کا
ہر چند سُنا گیا ہے اس کو اُردو کی زباں میں سخن گو
وہ نثر ہے، دادِ نظم دوں میں اس مے کو دو آتشہ کروں میں

ان اشعار کی روشنی میں یہی ثابت ہوتا ہے کہ نسیم کے سامنے اس قصے کا کوئی اُردو نثری نسخہ تھا۔ اگر ریحان اور رفعت کی مثنویوں کے بعض اشعار گلزار نسیم سے مطابقت رکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ جس نسخے سے دیا شنکر نسیم نے استفادہ کیا ہو، وہی روایت ریحان اور رفعت کے بھی پیش نظر رہی ہو۔

۷۔ "گل باغ بہار"،(۵۳) گل بکاؤلی منظوم مصنفہ محمد داؤد علی ناداں۔ قلمی نسخہ۔ سالِ کتابت درج نہیں ہے۔ سالِ تصنیف ۱۲۶۹ھ ہے۔ تعداد اشعار تخمیناً ۳۵۰۰۔

پہلا شعر:

کروں پہلے حمدِ خدائے جہاں کیا جس نے ہے 'کن' میں کون و مکاں

مصنف منظوم دیباچے میں عزت اللہ بنگالی کے فارسی قصے اور منشی نہال چند (لاہوری) کے اردو نثری ترجمے (مذہبِ عشق) کا ذکر کرتا ہے۔ مگر گلزارِ نسیم سے ناواقف معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے نزدیک مذہب عشق کو پہلے پہل نظم کرتا ہے اور اس کام سے بقائے نام کی امید رکھتا ہے۔ مگر اس کی یہ مثنوی زبان اور شاعری کے اعتبار سے ہر طرح کے عیوب سے پُر ہے۔ اس کی دو مثنویاں اور بھی ہیں۔ "نظم بہار" اور "طرزِ عاشق و معشوق" اور چار طولانی قصوں کا ایک مجموعہ نثر میں ہے جس کا نام "ظہور اسمائے الٰہی" کتاب کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

مصنف حیدر آباد میں پیدا ہوا اور کچھ مدت سری رنگ پٹن، ریاست

---

۵۳ اگر "گل باغ بہار" کو تاریخی نام تسلیم کیا جائے تو سنہ تصنیف ۱۲۶۱ھ برآمد ہوتا ہے

آصفیہ، مچھلی پٹن اور رنگون میں قیام کر کے کلکتے پہنچا اور ٹیپو سلطان کے بھتیجے نواب غلام علی کے یہاں ملازم ہو گیا۔ اس نے اپنی کتاب "ظہور اسمائے الٰہی" ٹیپو سلطان کے فرزند شاہزادہ محمد سلطان عرف غلام محمد کو بطریق نذر پیش کی۔ مذکورہ بالا چاروں کتابیں مصنف نے قیام کلکتہ کے زمانے میں لکھیں۔

آغاز داستان کے اشعار یہ ہیں:

تھا پورب کے شہروں میں اک بادشاہ | کہ تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ
یہ کہتے ہیں زین الملوک اس کا نام | سبھی امر سے تھا بہ مقصد تمام
جمال اس کا جیسا تھا ماہ منیر | شجاعت سخاوت میں تھا بے نظیر
کہ قدرت سے حق کی تھے فرزند چار | یہ علم و فضل میں تھے وہ آشکار (کذا)
سوا ان کے اک اور پیدا ہوا | کہ شمس و قمر جس پہ شیدا ہوا

آخری شعر:

ہوئی مثنوی اس جگہ پر تمام | بحقِ محمد علیہ السلام"[۵۴]

۸۔ گل بکاؤلی، قلمی، منظوم۔ ۱۲۶۱ھ از محمد داؤد علی، مملوکہ مسعود حسن رضوی ادیب، لکھنؤ۔

۹۔ گل بکاؤلی (اُردو نثر) مجہول المصنف، لاہور[۵۵]

اس قصے کو اُردو میں ڈرامہ کے طور پر مندرجہ ذیل مصنفین نے لکھا:

ا۔ نوشیرواں جی مہربان جی آرام (بمبئی)[۵۶]

۲۔ حسین محی الدین (گلشن بے خار، مدراس ۱۸۹۴ء)[۵۷]

---

۵۴ تفصیلات مرسلہ جناب مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ

۵۵ فہرست کتب خانہ، ص ۷۰

۵۶ اردو ڈراما، عشرت رحمانی، ص ۲۰۴

۵۷ انڈیا مطبوعات، ص ۹۷

۳۔ مرزا نظیر بیگ، نظیر اکبر آبادی (گلزار عاشق، چترا بکاؤلی، آگرہ ۱۹۰۸ء) [(۵۸)]

۴۔ الف خاں حباب رامپوری [(۵۹)]

۵۔ رونق بنارسی (بمبئی) [(۶۰)]

۶۔ احمد ندیم قاسمی (نثری تشکیل) لاہور [(۶۱)]

قصہ گل بکاؤلی کے ترجمے غیر ملکی زبانوں میں بھی ہوئے ہیں۔ گارساں دتاسی نے نہال چند لاہوری کی مذہب عشق کا خلاصہ فرانسیسی زبان میں ۱۸۳۵ء میں [(۶۲)] اور پورا ترجمہ ۱۸۵۸ء میں پیرس سے شائع کیا۔ [(۶۳)] گلکرائسٹ کاانگریزی ترجمہ ۱۸۴۳ء میں منظر عام پر آیا۔ [(۶۴)] انگریزی میں گل بکاؤلی کا ایک اور ترجمہ T.P. Manual نے کیا۔ [(۶۵)] آر۔پی۔اینڈرسن نے بھی ۱۸۵۱ء میں قصے کو انگریزی میں لکھا W. A. Clouston نے مینول اور اینڈرسن کے تراجم کو اپنی کتاب A Group of Eastern Romances میں شامل کیا، جو ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی۔ [(۶۶)] قصہ گل بکاؤلی کا ایک اور انگریزی ترجمہ باوا چھجورام نے "مذہب عشق" سے کیا، جو ۱۹۰۳ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ [(۶۷)]

---

۵۸ ادارہ مطبوعات، ص ۱۴۷، نیز صدیق ۳۰۸

۵۹ اردو ڈراما، ص ۲۰۹

۶۰ ایضاً، ص ۲۱۲

۶۱ ایضاً، ص ۳۱۷

۶۲ بلوم ہارٹ برٹش، ص ۸۸

۶۳ ایضاً

۶۴ ایضاً، ص ۱۰۰

۶۵ بحوالہ نثری داستانیں، ص ۵۸۷

۶۶ بلوم ہارٹ، برٹش، ص ۱۰۰

۶۷ بلوم ہارٹ ضمیمہ ص ۳۸۷

اس قصّے کو پنجابی میں شیخ نجم الدین، مسکین، سیالکوٹی نے لکھا ہے۔[۶۸] پشتو زبان میں "قصہ گل بکاؤلی" کا ترجمہ ملا احمد تراہی نے کیا جو دہلی سے ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا۔[۶۹] یہی کتاب "گلشن راحت" کے نام سے بمبئی سے دوبارہ ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی۔[۷۰] پشتو کا ایک اور ترجمہ غازی الدین نے "گل بکاؤلی افغانی جدید" کے نام سے دہلی سے ۱۸۸۴ء میں شائع کیا۔[۷۱]

بعض ہندستانی زبانوں میں بھی یہ قصہ فارسی اور اُردو روایتوں سے لیا گیا ہے۔ گجراتی میں اسے کرشن داس نے عزت اللہ بنگالی کی فارسی گل بکاؤلی سے ۱۸۶۳ء میں ترجمہ کیا۔[۷۲] ہندی میں بھی بیجو سنگھ ورما نے اسے عزت اللہ بنگالی سے ترجمہ کیا جو "بکاؤلی سمن" کے نام سے بمقام لکھنؤ ۱۸۷۴ء میں شائع ہوا۔[۷۳] اس قصے کا ایک اور مجہول المصنف ہندی ترجمہ ۱۸۶۴ء میں گل بکاؤلی کے نام سے بنارس میں چھپا تھا۔[۷۴] بنگالی زبان میں اسے کسی شخص اردت منشی نے غالباً مذہب عشق از نہال چند لاہوری سے ترجمہ کیا جو کلکتہ سے ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا۔[۷۵]

قصہّ و تبصرہ

سلطان زین الملوک کے پانچواں بیٹا ہونے پر نجومیوں نے پیشین گوئی کی کہ اگر سلطان کی نظر اس پر پڑے گی تو اندھا ہو جائے گا۔ چند برس بعد ایک

---

۶۸ ا۔ک۔م۔ مئی ۱۹۳۱ء، ص ۶۳
۶۹ پشتو کتب برٹش، کالم ۱۰
۷۰ ایضاً ۱۱
۷۱ ایضاً ۱۸
۷۲ کٹیلاگ گجراتی کتب، برٹش میوزیم، بلوم ہارٹ، ص ۶۴
۷۳ انڈیا ہندی ص ۶۱، نیز ہندی کتب برٹش کالم ۷۱
۷۴ ہندی کتب برٹش کالم ۷۱
۷۵ کٹیلاگ بنگالی کتب۔ برٹش میوزیم، بلوم ہارٹ، ص ۳۷

دن اتفاقاً باپ بیٹے کا سامنا ہو گیا۔ باپ کی آنکھیں جاتی رہیں۔ ایک معالج نے بتایا کہ گلزارِ ارم میں بکاؤلی کا پھول ہے، وہ اگر آنکھوں کو لگایا جائے تو بینائی عود کر آئے گی۔ چاروں شہزادے گل بکاؤلی کی تلاش کو نکلے اور پہلی ہی منزل پر دلبر بیسوا سے چوسر کا کھیل ہار گئے اور اس نے انھیں قید میں ڈال دیا۔ پانچویں بیٹے یعنی تاج الملوک نے دلبر بیسوا کو مات دی اور دوسری منزل پر ایک دیو سے مقابلہ کر کے اسے بھی رام کیا۔ دیو کی بہن حمالہ دیونی مددگار ثابت ہوئی۔ اس کی بنائی ہوئی سرنگ کے ذریعے تاج الملوک گلزارِ ارم میں پہنچا اور گل بکاؤلی توڑ لانے میں کامیاب ہو گیا۔ وطن کو لوٹتے ہوئے تاج الملک کی بڑے بھائیوں سے مٹھ بھیڑ ہوئی انھوں نے دھوکے اور فریب سے بکاؤلی کا پھول تاج الملوک سے چھین لیا۔ پھول سلطان کی آنکھوں کو لگایا گیا، جس سے اس کی کھوئی ہوئی بینائی واپس آ گئی۔ ادھر جب بکاؤلی نے گلزارِ ارم سے اپنے پھول کو غائب پایا تو بہت سٹ پٹائی۔ چور کی تلاش میں وہ سراغ لگاتے لگاتے سلطان کے دربار تک پہنچی اور مرد کی صورت اختیار کر کے اس کی وزیر بن گئی۔ پھول ہاتھ سے نکل جانے کے بعد تاج الملوک شہر کے قریب جادو کے زور سے گلشنِ نگاریں بنا کے رہنے لگا۔ لیکن یہ راز زیادہ مدت تک پوشیدہ نہ رہا۔ بکاؤلی کو بھی پتا چل گیا کہ اصل چور تاج الملوک ہے۔ وہ اس کی شجاعت، دلیری اور مردانگی کی قائل تو تھی ہی، پہلی ملاقات میں دل ہار گئی۔ عشق کی ابتدا ہوئی اور وہ دونوں ساتھ ساتھ گلزارِ ارم میں داد عیش دینے لگے۔ بکاؤلی کی ماں کو یہ احوال معلوم ہوا تو اس نے بکاؤلی کو قید کر دیا اور تاج الملوک کو طلسم کے جنگل میں پھنکوا دیا۔ تاج الملوک نے تمام آفات کا نہایت ہمت اور جرأت سے مقابلہ کیا اور طلسم سے رہائی حاصل کی۔ آخر بکاؤلی سے اس کا بیاہ ہوا اور دونوں گلشنِ نگاریں میں آ کر مزے میں زندگی بسر کرنے لگے۔ در حقیقت بکاؤلی اندر لوک کی پری تھی۔ وہ ہر رات اڑ کر اندر لوک پہنچتی اور صبح تاج الملوک کی آنکھ کھلنے سے پہلے واپس آ جاتی۔ ایک رات تاج الملوک تاڑ گیا اور پکھاوجی بن کے بکاؤلی کے ہمراہ اندر لوک پہنچا۔

بکاؤلی نے اس رات اتنا عمدہ رقص کیا کہ راجا اندر نے بے اختیار اس کی منہ مانگی مراد پوری کرنے کا وعدہ کرلیا۔ بکاؤلی نے تاج الملوک کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی اجازت چاہی، مگر اسے سنتے ہی راجا کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی اور بکاؤلی کو نصف پتھر کی بنا کر ایک مٹھ میں قید کردیا۔ کچھ مدت بعد راجہ چترسین کی بیٹی چتراوت بھی تاج الملوک پر عاشق ہوگئی۔ اسے تاج الملوک کا روز روز مٹھ جانا اور بکاؤلی سے باتیں کرنا شاق گزرا۔ اس نے وہ مٹھ ہی کھدوا ڈالا۔ مٹھ کے انہدام کے بعد اس زمین میں سرسوں پیدا ہوئی جس کے تیل سے ایک دہقان کی بیوی کے حمل رہ گیا اور بکاؤلی نے نیا جنم پایا۔ دہقان کے گھر جوان ہوکر بکاؤلی پھر تاج الملوک سے ملی اور دونوں کے دلوں کی مراد پوری ہوئی۔

گل بکاؤلی کا یہ قصہ چونکہ بہت مقبول و معروف رہا ہے۔ اس کی اصلیت کے بارے میں بھی روایات گھڑ لی گئی ہیں اور اس کا تعلق ایک ایسے پھول سے بتایا جاتا ہے جو کبھی ہندستان میں آشوب چشم وغیرہ امراض کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ قصہ گل بکاؤلی کی تاریخی اصلیت سے اُردو میں سب سے پہلے محمد یعقوب ابن اکبر خاں لکھنوی نے اپنی کتاب ''گلدستہ حیرت معروف بہ تواریخ بکاؤلی'' میں بحث کی تھی۔ انھوں نے بکاؤلی کے حالات قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ کے رئیس محمد عبدالسمیع ولد شیخ رحیم باسط سے معلوم کیے اور یہ مختصر سی کتاب خواجہ محمد وزیر کے مطبع گلزار محمدی لکھنؤ سے ۱۲۹۳ھ میں شائع ہوئی۔ محمد یعقوب نے لکھا ہے کہ دکن کے کرنجوٹ نامی راجا کے دو بیٹے تھے۔ شاستر جوگ اور راج بھوج۔ چھوٹے بیٹے راج بھوج کو غیر آباد اور ویران علاقہ دیا گیا۔ لیکن اس نے ریاضی دانوں اور ساحروں کی مدد سے وہیں جنگل میں ایک پُراسرار قلعہ تعمیر کرایا۔ بھوج کے ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی پیدا ہوئی۔ اسے پھولوں کا بہت شوق تھا۔ سوہن بھدر نامی ایک جوگی نے راجکماری کو دیکھا اور اس پر عاشق ہوگیا۔ اس نے پیش کش کی کہ وہ ایک بہت بڑے ساحر کے باغ سے ایک ایسا درخت لاسکتا ہے جس کے پھول خوبصورتی اور خوشبو میں بے نظیر ہیں، بشرطیکہ

وہ کسی سے شادی نہ کرے۔ راجکماری نے اقرار کرلیا اور ایک دن جو وہ سو کر اٹھی تو گل بکاؤلی کی نہایت سہانی خوشبو سے اس کا دماغ معطر ہوگیا۔ اس نے خوش ہوکر جوگی کو باغ میں رہنے کی اجازت دے دی اور پھول کی رعایت سے راج کماری بھی بکاؤلی کے نام سے پکاری جانے لگی۔ اس کے حسن و جمال کا شہرہ ہوا تو شادی کے پیام آنے لگے۔ آخر راجا نے ایک نسبت منظور کرلی۔ شادی کا دن آیا، دلہن غسل کے لیے حوض پر لائی گئی اور جیسے ہی جوگی کو معلوم ہوا، اس نے بددعا دی اور جوگی اور بکاؤلی دونوں پانی ہوکر بہہ گئے۔

بکاؤلی کے قلعے اور باغ کے آثار ناگپور کمشنری کے ضلع منڈلا کی تحصیل رام گڑھ میں امرکنٹک[۷۶] نام کے جنگل میں موجود ہیں۔ ۱۸۲۰ء میں محکمہ جنگلات کے داروغہ میر قدرت علی نے اس جنگل کا جو نقشہ کھینچا تھا اس میں بکاؤلی کے باغ، قلعے اور دوسری عمارتوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کی نقل محمد یعقوب کی کتاب میں شامل ہے۔ ان کا بیان ہے کہ قلعہ بکاؤلی کے چاروں طرف نہایت گہری دلدل ہے۔ اس کے قرب و جوار میں عجیب قسم کے خوشبودار پھول ہیں جن کا عرق آنکھوں کے درد کو دور کرتا ہے، لیکن دلدل کی وجہ سے یہ پھول مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں اور قلعے تک رسائی محال ہے۔

محمد یعقوب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۲۶۶ف میں ناگپور کے چیف کمشنر ٹیمپل صاحب کو قلعہ دیکھنے کی دھن سمائی۔ وہ تقریباً سوا سو مسلح انگریزوں اور دیسی سپاہیوں کے ساتھ ہاتھیوں پر روانہ ہوئے۔ تھوڑا سا فاصلہ چلے تھے اور ابھی قلعہ نو کوس دور تھا کہ دلدل کی گہرائی زیادہ ہوگئی اور آگے بڑھنا ممکن نہ رہا۔ قلعہ سے دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیتا تھا، جیسے کہیں بہت دور آگ لگی ہوئی ہو۔[۷۷]

---

۷۶ امرکنٹک دریائے نربدا کا منبع ہے۔ یہاں ایک قدیم حوض ابھی تک موجود ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دریائے نربدا پہلے پہل یہیں سے بہنا شروع ہوا تھا۔ (امپریئل گزیٹیر آف انڈیا، جلد ۵، ص ۲۷۴)

۷۷ تلخیص از گلدستۂ حیرت، ص ۱ تا ۲۲، لکھنؤ ۱۲۹۳ھ

ہندی زبان کے مشہور لغت "ہندی شبد ساگر" میں گل بکاؤلی سے متعلق یہ عبارت ملتی ہے:

(۱) ایک پرکار کا پیڑ جو نربدا ندی کے ادگم کے پاس امر کنٹک کے بن میں ہوتا ہے۔ یہ ہلدی کے پیڑ سے ملتا جلتا ہے۔ (۲) اس پودے کا پھول جو رنگت میں سفید اور بہت سگندھت ہوتا ہے جس پرانت میں یہ ہوتا ہے۔ اس پرانت کے لوگ اسے پیس کر آئی ہوئی آنکھوں پر لگاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ آنکھ کے کئی روگوں کی بہت اچھی دوا ہے"۔ (۷۸)

اس قلعہ کے بارے میں واقف لکھنوی نے ۱۹۲۱ء میں رسالہ ادیب میں لکھا تھا کہ ان کے ایک عزیز، جو محکمہ پولیس میں افسر تھے، ڈاکوؤں کے تعاقب میں ایک مرتبہ امرکنٹک کے جنگل میں جانکلے۔ وہاں انھیں ایک چہار دیواری نظر آئی، جس میں سنگ سُرخ اور سنگ مرمر کی ایک بارہ دری دکھائی دی جو گہری دلدل سے گھری ہوئی تھی۔ شہر آکر معلومات بہم پہنچائیں تو تاریخ ریواں دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ بارہ دری بکاؤلی نام کی ایک رانی نے بنوائی تھی۔ نیز یہ کہ ریاست ریواں میں بکاؤلی نام کا ایک پھول پیدا ہوتا ہے جو امراض چشم کے لیے مفید ہے۔ (۷۹)

اس کی تاریخی حقیقت کے بارے میں مولوی سید احمد دہلوی مولف فرہنگِ آصفیہ نے بھی لکھا ہے۔ ان کا بیان ہے: امر کنٹک ایک بڑا ہی گھنا اور وحشت ناک جنگل ہے۔ اس میں قلعہ، حوض اور باغ و مکانات کے نشان ابھی تک ہیں۔ لیکن دلدل کی وجہ سے ان تک رسائی مشکل ہے۔ گرد ونواح میں یہ قلعہ ایک طلسم سمجھا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ قدیم زمانے میں دکن کے ایک راجا بھوج نے اپنے چھوٹے بیٹے سے خفا ہوکر اسے اس غیر آباد علاقے میں بھیج دیا۔ بھوج کے ہمراہیوں میں بعض غیر معمولی ریاضی داں اور منجم بھی تھے۔

---

۷۸ ہندی شبد ساگر، شیام سندر داس، ناگری بھاشا پرچارنی سبھا، بنارس ۱۹۱۶ء، ص ۸۲۸

۷۹ ادیب، جون ۱۹۲۱ء، ص ۱۰

انھوں نے یہاں قلعہ بنایا اور اس کے گرد طلسم آمیز باغات تعمیر کیے۔ راجا بھوج کے ایک نہایت حسین لڑکی نربدال نامی پیدا ہوئی۔ بڑی ہوئی تو اس کے حسن کا شہرہ دور دور تک پہنچا۔ سون بھدر نامی ایک جوگی اس لڑکی پر عاشق ہو گیا اور وہیں قلعے کے قریب محل بنا کر رہنے لگا۔ سون بھدر نے اس شرط پر نربدال کو بکاؤلی کا نایاب پھول لا کر دیا کہ وہ کسی سے شادی نہ کرے گی۔ اسی اثنا میں ایک شہزادہ بکاؤلی سے عاشقی کا دم بھرنے لگا اور راجہ بھوج نے اس کی درخواست منظور کر لی۔ جب برات آئی تو سون بھدر کو سارے معاملے کا پتا چلا اور اس نے بد دعا دی کہ بکاؤلی پانی ہو کر بہہ جائے۔ اسی روز سے یہ پانی ایک دریا کی شکل میں جاری ہے اور اسے "نربدال" کی رعایت سے "نربدا" کہا جاتا ہے۔[۸۰]

حال ہی میں محمد عبداللہ قریشی نے گل بکاؤلی کے بارے میں ایک مقالہ شائع کیا ہے۔[۸۱] ان کا بیان ہے کہ یہ قصہ ایک سچّے واقعہ پر مبنی ہے۔ پچاس برس پہلے ایک طلسم بکاؤلی ایکسپلورنگ ایسوسی ایشن قائم کی گئی تھی۔ اس نے بڑی چھان بین کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ یہ قصہ محض فرضی افسانہ نہیں۔ قلعۂ بکاؤلی ہوشنگ آباد اور امر کنٹک کے علاقہ میں تھا۔ یہ علاقہ اس وقت کوسوں لمبی اور نہایت گہری دلدل میں گھرا ہوا ہے۔ بکاؤلی کا تالاب، مندر اور فوارہ شکستہ حالت میں پائے گئے ہیں۔ اس علاقے میں ایک بوسیدہ عمارت لکھاپتریا کا محل کہلاتی ہے۔ غالباً یہ دلبر بیسوا کا مکان تھا، جہاں اس نے جوئے کی بازی میں چاروں شہزادوں کو مات دی تھی۔ محمد الدین فوق نے اپنے اخبار کشمیری لاہور میں ۱۹۱۰ء میں لکھا تھا کہ امر کنٹک ہندوؤں کا تیر تھ ہے۔ دریائے نربدا یہیں سے نکلتا ہے۔ آگے چل کر دریائے سون اور نربدا کی وادی میں مونڈا کے قریب ایک بڑا جنگل ہے جو اب تک بکاؤلی کا باغ کہلاتا ہے۔ اس جنگل میں ہلدی کے رنگ کے پھول عام طور پر کھلتے ہیں۔ مشہور ہے کہ ان کا عرق آنکھوں میں

---

۸۰ فرہنگ آصفیہ، جلد چہارم ۵۴۔۵۶

۸۱ نقوش، لاہور، جون ۱۹۵۸ء، ص ۲۷۰۔۲۸۲

ڈالنے سے آشوب وغیرہ سے شفا ہوتی ہے۔ روایت ہے کہ بکاؤلی کا اصل درخت غائب ہو چکا ہے اور موجودہ پھول جمالِ ہم نشیں کے اثر سے اصل گل بکاؤلی کی کچھ خاصیت رکھتے ہیں۔ آنکھوں کے امراض کے متعلق ان پھولوں کے اثر کی تصدیق خان بہادر مولوی رحمان علی وکیل دربار ریواں نے بھی اپنی کتاب "تحفۂ خان بہادر" میں کی ہے۔

غرض گل بکاؤلی کی اصلیت کے بارے میں کئی روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ یہ صحیح ہیں یا غلط، اتنی بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اپنی موجودہ حالت میں گل بکاؤلی کا قصہ ہندستان ہی میں تخلیق ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سابقے سے ہندستان کی زندگی میں اخذ و قبول کا جو عمل شروع ہوا تھا، گل بکاؤلی کا قصہ اس کی کامیاب نمایندگی کرتا ہے۔

قصّے کے اعتبار سے مثنوی گلزار نسیم کے دو حصے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ پہلا شہزادے کے گل بکاؤلی کی تلاش میں نکلنے سے لے کر شادی ہو جانے تک اور دوسرا اندر سبھا کے واقعہ سے بکاؤلی کے دوبارہ پیدا ہونے تک۔ یوں تو ساری مثنوی میں ہندی اور ایرانی عناصر ملے جلے نظر آتے ہیں، لیکن پہلے حصے میں ایرانی رنگ غالب ہے اور دوسرے میں ہندستانی۔ قصے کی فضا اس زمانے میں رائج داستانوں کی سی ہے۔ مثنوی کے کرداروں میں بعض نام فارسی ہیں اور بعض ہندی۔ زین الملوک، تاج الملوک وغیرہ ایرانی نام ہیں اور چتر سین، چتراوت وغیرہ ہندی نام ہیں۔ دلبر بیسوا کے نام میں دلبر فارسی لفظ ہے اور بیسوا ہندی۔ اسی طرح لفظ "گل" فارسی ہے اور "بکاؤلی" تدبھو (तद्भव) ہندی لفظ ہے جو سنسکرت بک (बक) یا بگلا (बकुला) سے نکلا ہے۔ بک (बक) سنسکرت میں بگلے کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ بگلے کے ساتھ کنول کے معنی میں بھی آیا ہے۔ بکل (बकुल) سنسکرت میں ایک ایسے خیالی درخت کا نام ہے، جس پر اگر کوئی نوجوان عورت اپنے منہ سے شراب چھڑک دے تو پھول کھل اٹھیں۔[۸۲] بکل (बकुल) "شی

۸۲ سنسکرت ہندی لغت، اے. اے. میکڈانلڈ، لندن ۱۸۹۳ء، ص ۱۹۱

دھ گندھو" اور "سیہہ کیشر" یعنی مولسری کے پھول کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔[۸۳] قیاس چاہتا ہے کہ "بکاؤلی" کا لفظ اسی بکُل (बकुल) سے نکلا ہوگا اور ممکن ہے کہ کسی زمانے میں ایسا کوئی پھول امراضِ چشم کے لیے استعمال ہوتا ہو۔

مثنوی کے پہلے حصے کی کچھ داستانیں ہندی ہیں اور کچھ اسلامی۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اس کی طرف کچھ اشارے کیے ہیں۔[۸۴] دلبر بیسوا کا چوسر کھیلنا مقامی ماحول سے اخذ کیا گیا ہے۔ قصے میں جنس بدلنے کا ذکر آیا ہے۔ یہ مہابھارت سے ماخوذ ہے۔ جہاں ادھیوگ پرو میں شکھنڈی ایک یکش سے جنس بدل کے مرد بن جاتا ہے۔ ایسے واقعات کا ذکر بیتال پچیسی وغیرہ کہانیوں میں بھی ملتا ہے۔

قصہ گل بکاؤلی کے بعض عناصر اسلامی حکایتوں سے بھی ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً تاج الملوک اپنے بھائیوں کو زنداں سے رہا کراتا ہے، لیکن وہ اس کے ساتھ دغا کرتے ہیں۔ یہ بنیادی طور پر حضرت یوسف کا قصہ ہے۔ پھول یا کسی اور چیز کے آنکھوں کو لگانے سے بینائی کا عود کر آنا حضرت یعقوب کے واقعہ سے مختلف نہیں۔ دیووں کے ذریعے محل تیار کرنا الہ دین کے چراغ" میں بھی پایا جاتا ہے۔ قصۂ بکاؤلی میں طلسم کی جو پُر اسرار فضا تیار کی گئی ہے، اس کے نمونے امیر حمزہ، الف لیلہ اور بوستانِ خیال میں بکثرت مل جاتے ہیں۔

بکاؤلی کی شادی کے بعد قصّے کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جو ہندستانی لوک کتھاؤں سے ماخوذ ہے۔ اس میں رومان کی فضا، راجا اندر اور پریوں کے ذکر سے ابھاری گئی ہے۔ راجا اندر اور اپسراؤں کی کہانیاں ہندستانی ادبیات میں عام طور پر ملتی ہیں اور ہر ہندستانی ان سے اچھی طرح واقف ہے۔

دیا شنکر نسیم نے راجا اندر کو یوں پیش کیا:

---

۸۳ शब्दार्थचिन्तामणि: از سکھانند ناتھ (سنسکرت) آگرہ ۱۹۲۱ بکرمی، جلد ۳، ص ۳۳۹

۸۴ ڈاکٹر گیان چند جین، نثری داستانیں، ص ۱۶۲

خالق نے دیا ہے فوق اس کو | نغمے سے ہے ذوق شوق اس کو
انساں کا سرود و رقص کیا ہے | پریوں کا ناچ دیکھتا ہے
باری باری سے جو پری ہے | راجہ اندر کی مجرئی ہے
لیکن جو بکاؤلی دل افگار | باری پہ پہنچ سکی نہ بیمار
اک شب راجا تھا محفل آرا | یاد آئی بکاؤلی دل آرا

چنانچہ حکم ہوا کہ بکاؤلی کو زمین سے لایا جائے۔ یہ واقعہ وکرم اُروشی کے قصے سے ملتا جلتا ہے۔ مہابھارت کے آدی پرو میں راجا اندر اسی طرح اپنی اپسرا اُروشی کو طلب کرتا ہے جو ایک زمینی انسان وکرم کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔ بکاؤلی شہزادے کو پکھاوجی بناکر اندر سبھا میں لے جاتی ہے۔ تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ بکاؤلی ایک مٹھ میں قید کردی جاتی ہے۔ رانی چتراوت اس مٹھ کو کھدوادیتی ہے۔ اس مٹی سے اُگنے والی سرسوں کے تیل سے دہقان کی بیوی کے حمل رہتا ہے اور بکاؤلی پھر سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب خیالات ہندستان کے پُرانے قصوں کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ امانت کی اندر سبھا کا نقش اوّلیں بھی قصے کے اسی حصے میں ملتا ہے۔

گلزارِ نسیم میں ہند ایرانی عناصر کی آمیزش نہایت عمدہ طریقہ پر ہوئی ہے۔ مثنوی کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے۔ یہاں بھی دیاشنکر نسیم نے حمد باری کے ساتھ لفظ 'ہر' کا استعمال کیا ہے۔ اس سے دونوں مذہبوں کا احترام ملحوظ تھا۔

ایک اور مقام پر جہاں استخارے کا ذکر ہے، وہاں علم جوتش کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

سیاروں سے کرکے استخارہ | اس برج کے رُخ وہ مہ سدھارا

قصےّ کی جائے وقوع کے سلسلے میں فردوس، گلزار ارم اور گلشن نگاریں کے ایرانی نام بار بار آئے ہیں لیکن یہ خیالی اور فرضی ہیں۔ سنگل دیپ ہندستانی

نام ہے جس کا ذکر مختلف لوک کتھاؤں میں ملتا ہے۔ مثنوی کے آغاز میں سلطان زین الملوک کو پورب کا بادشاہ کہا گیا ہے، اس سے مُراد ہندستان ہی ہے۔ اس کی صراحت اس موقع پر ہوگئی ہے جہاں تاج الملوک شادی کے بعد بکاؤلی کے ساتھ وطن لوٹتا ہے:

غربت میں وطن کی دھن سمائی　　اس فیل کو یادِ ہند آئی

کہنے کو اس قصے کے افراد فردوس اور پرستانوں میں رہتے ہیں لیکن ان کے آداب و رسوم ہندستانیوں جیسے ہیں۔ تاج الملوک جب زین الملوک کی پیشوائی کو آتا ہے تو اس شان سے:

جو جو کہ تواضعات ہیں عام　　لے آئے خواص نازک اندام
چکنی ڈلی، عطر، الائچی، پان　　نقل و مئے و جام و خوانِ الوان

برات کا انتظام بھی ہندستانی طریقے پر دکھایا گیا ہے۔ جلوس میں ہاتھی شامل ہوتے ہیں۔ دولہا کے سہرا باندھا جاتا ہے، سر پر چتر رکھا گیا ہے، چنور ہلایا جاتا ہے اور ہر سو "ہریالے بنے" کے شور و غل میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، پھولوں کے ہاروں، دھواں دھار پیچ وانوں، پان کے بیڑوں اور چکنی ڈلی سے تواضع کی جاتی ہے۔ آرسی مصحف، شہانے، نیگ دینا، ٹونا گانا یہ سب ہندستانی رسمیں ہیں۔

پُرانے زمانے میں رخصت کے وقت آئینہ پر پانی ڈال کر دیکھتے اور اس سے فال لیتے تھے:

اشکوں سے شگوں لیا نرالا　　آئینۂ رُخ پہ پانی ڈالا

بعض اشعار میں ہندستانی راگوں کے نام بھی آگئے ہیں:

وہ پوربی کرکے جوگیا بھیس　　جنگلے کی راہ سے چلا پردیس

وہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی　　خود راگنی آکھڑی ہوئی تھی

دیاشنکر نسیم بلا کے ذہین اور طبّاع آدمی تھے۔ زبان اور بیان پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ بیس پچیس برس کی عمر میں فن شعر میں وہ کمال پیدا کیا کہ ان کی مثنوی اردو کے زندہ جاوید کارناموں میں شمار کی جاتی ہے۔ نسیم بلاغت اور معنی آفرینی پر جان چھڑکتے تھے۔ میر حسن کا ساسوز و گداز ان کے یہاں نہیں۔ نہ وہ روزمرّے اور محاورے کے بادشاہ ہیں۔ لیکن شوکت الفاظ، اختصار، تناسبِ لفظی، بلند پروازی، باریک بینی، استعاروں کی نزاکت اور تشبیہوں کی پختگی میں ان کا ایک خاص رنگ ہے۔ وہ لکھنؤ کی رنگین، لوچدار اور مرصع زبان کے نمایندہ شاعر ہیں۔ طبیعت چونکہ مشکل پسندی پر مائل تھی، سلاست اور گھلاوٹ ان کے کلام میں نہیں۔ البتہ کہیں کہیں تکلفات سے ہٹ کر بڑے ہی سادہ اور برجستہ شعر کہے ہیں، جو ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں۔

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے　　جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجے
منہ پھیر کے ایک مُسکراتی　　آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چتونوں کو ملا کے رہ گئی ایک　　ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

کھاتے ہی حمل کا رنگ پایا　　سرسوں سا ہتھیلی پر جمایا

میٹھا رس اس دیو کو کھلاؤ　　گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو

کانٹوں میں اگر نہ ہو الجھنا　　تھوڑا لکھا بہت سمجھنا

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار　　اب مان نہ مان تو ہے مختار

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے　　جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے

دونوں کی رہی نہ جان تن میں　　کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

قصّے کے آخر میں بہرام وزیرزادہ اور روح افزا منظر پر آتے ہیں۔ یہ ایک ذیلی حکایت ہے جس کا تعلق قصے سے بہت کم ہے۔ اصل قصہ کا مصنف اسلامی شریعت سے واقف معلوم ہوتا ہے۔ اس کا ایک ثبوت قصہ کا انجام بھی ہے جہاں تاج الملوک چار بیویوں کے ساتھ لوٹتا دکھایا گیا ہے۔ اس قصہ میں میر مثنوی کا سابقہ چار عورتوں سے پڑتا ہے۔ دلبر بیسوا، دیونی کی بیٹی محمودہ، رانی چتراوت اور بکاؤلی۔ انجام کار شہزادہ چاروں ہی کو اپنے ساتھ رکھتا ہے۔

مدت کے بعد گھر میں آئے　　کھوئے ہوئے جیسے سب نے پائے
فردوس کی بیسوا وہ دلبر　　محمودہ دیونی کی دختر
چتراوت چترسین کی جان　　آرامِ ارم بکاؤلی جان
ان چاروں میں ایک مستِ بادہ　　پورب کا بادشا ہزادہ

اس قصّے کے مختلف اجزا پر غور کرنے سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ جاتی ہے کہ پھولِ بن اور قصہ بدر منیر و بے نظیر کی طرح گل بکاؤلی کے قصے کی عام فضا بھی داستانوں کی سی ہے۔ لیکن موجودہ حالت میں یہ قصے نہ تو ہندی الاصل ہیں نہ فارسی الاصل۔ ان میں اسلامی داستانوں اور ہندی لوک کہانیوں کے عناصر ساتھ ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ ان کے بعض حصوں میں امیر حمزہ، الف لیلہ، یعقوب و یوسف اور بوستانِ خیال سے ملتے جلتے واقعات پائے جاتے ہیں؛ تو کچھ حصّے مہابھارتی قصے کہانیوں، راجا اندر سے متعلق مشہور لوک کتھاؤں، پنچ تنتر، شک سپ تتی اور بیتال پچیسی سے ماخوذ ہیں۔ ان داخلی شہادتوں کی بنا پر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان قصوں کی تخلیق ہندو مسلم اختلاط کے زیر اثر ہوئی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے سابقے کے بعد ہندستان میں تہذیبی اور

معاشرتی سطح پر اشتراک و اختلاط کا جو عمل شروع ہوا تھا، عوامی قصے کہانیوں نے بھی اس سے گہرے اثرات قبول کیے اور مخلوط قسم کے ہند ایرانی قصے وجود میں آئے۔ پھول بن، سحر البیان اور گل بکاؤلی اس اخذ و قبول کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان مثنویوں کے کچھ اجزا ہندی ہیں، کچھ اسلامی، لیکن مثنوی نگاروں نے انھیں اپنے تخیّل کے سانچے میں اس خوبی اور خوش اسلوبی سے بٹھایا ہے کہ ان میں عرب کے سوزِ دروں، عجم کی نفاست اور ہند کی لطافت نے باہمدگر مل کر فریبِ نظر کی ایک جادوئی کیفیت پیدا کردی ہے۔

کتابیات

اردو ڈراما، تاریخ و تنقید از عشرت رحمانی، لاہور ۱۹۵۷ء

اردو شہ پارے، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، حیدر آباد، ۱۹۲۹ء

اردو کی نثری داستانیں، ڈاکٹر گیان چند جین، کراچی، ۱۹۵۴ء

اردو مثنوی کا ارتقا، عبدالقادر سروری، حیدر آباد ۱۹۴۰ء

اردوے قدیم، شمس اللہ قادری، لکھنؤ ۱۹۲۵ء

افسانہ پدمنی، محمد احتشام الدین دہلوی دہلی ۱۹۳۹ء

اکبر نامہ، ابوالفضل علامی، جلد ۳ بہ تصحیح مولوی عبدالرحیم، کلکتہ ۱۸۸۶ء

ایک مشرقی کتب خانہ، اسکاٹ اوکونز مترجمہ مبارزالدین رفعت، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء

بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، اختر اورینوی، پٹنہ ۱۹۵۷ء

بیتال پچیسی، رام کمار پریس، لکھنؤ ۱۹۵۴ء

پدماوت (اودھی) ملک محمد جائسی، مشمولہ جائسی گرنتھاولی مرتبہ ماتا پرشاد گپت، الہٰ آباد ۱۹۵۲ء

پدماوت بھاکا مترجم، عنایت علی بیگ عنایت، کانپور، ۱۸۹۸ء

پدماوت بھاکا مترجم، پنڈت بھگوتی پرساد پانڈے انوج، لکھنؤ

پنجابی قصے فارسی زبان میں (جلد اول) ڈاکٹر محمد باقر، لاہور، ۱۹۵۷ء

پنجابی ادب کی تاریخ، عبدالغفور قریشی، لاہور ۱۹۵۶ء

تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ترجمہ مرزا محمد عسکری، لکھنؤ ۱۹۲۹ء
تاریخِ فرشتہ، نول کشور، لکھنؤ ۱۸۷۴ء
تاریخِ مبارک شاہی، یحییٰ بن احمد بن عبداللہ ایسہر ندی مرتبہ محمد ہدایت حسین، کلکتہ ۱۹۳۱ء
تاریخِ مثنویاتِ اردو، جلال الدین احمد جعفری، لاہور، طبع دوم
(تذکرہ) آثار الشعرائے ہنود، دیبی پرشاد بشاش، لکھنؤ، ۱۲۹۹ھ
چمنستانِ شعرا، لچھمی نرائن شفیق، اورنگ آباد، ۱۹۲۸ء
خمخانۂ جاوید، سری رام، لاہور، جلد اول تا پنجم، ۱۹۰۸ - ۱۹۴۰ء
دو تذکرے (عشقی و شورش) مرتبہ کلیم الدین احمد، پٹنہ، ۱۹۵۹ء
تذکرۂ ریختہ گویان، فتح علی حسینی گردیزی، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء
سراپا سخن، میر محسن علی محسن، لکھنؤ، ۱۲۷۷ھ
سخن شعرا، عبدالغفور خاں نساخ، نول کشور لکھنؤ، ۱۸۷۴ء
تذکرۂ شعرائے اردو، میر حسن، دہلی ۱۹۴۰ء
شمع انجمن، نواب سید محمد صدیق حسن خاں، مطبع شاہجہانی، بھوپال، ۱۲۹۳ھ
طبقاتِ سخن (قلمی) قدرت اللہ شوق، کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد
تذکرۂ گلِ رعنا (قلمی) شفیق اورنگ آبادی، مکتوبہ ۱۱۸۶ھ مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ، حیدر آباد
گل عجائب، اسد علی تمنا، اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء
گلزارِ ابراہیم مع گلشنِ ہند، علی ابراہیم خاں، و میرزا علی لطف، لاہور ۱۹۰۶ء
گلشنِ بے خار، محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ، لکھنؤ ۱۸۷۴ء

مآثر الامرا، نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں، بہ تصحیح مولوی مرزا اشرف علی، ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال کلکتہ، ج ۳، ۱۳۰۹ھ
مآثر الکرام، دفتر ثانی موسوم بہ سرو آزاد، میر غلام علی آزاد بلگرامی، بہ تصحیح و تحشیہ عبداللہ خاں، حیدر آباد، ۱۹۱۳ء
مجمع الانتخاب، قلمی، شاہ کمال الدین، سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد
مجموعۂ نغز، قدرت اللہ قاسم، مرتبہ محمود شیرانی، لاہور، ۱۹۳۳ء
محبوب الزمن، (تذکرہ شعرائے دکن) محمد عبدالجبار خاں صوفی، ملکا پوری، جلد اول و دوم، حیدر آباد، ۱۳۲۹ھ
تذکرہ مقالات الشعرا، میر علی شیر قانع ٹھٹھوی مرتبہ سید حسام الدین راشدی کراچی، ۱۹۵۷ء
نکات الشعرا، میر تقی میر، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء
مخزنِ نکات، محمد قیام الدین قائم، اورنگ آباد، ۱۹۲۹ء
ہندو شعرا، خواجہ عشرت لکھنوی، لکھنؤ، ۱۹۳۱ء
تذکرۂ ہندی، شیخ غلام ہمدانی مصحفی، دہلی، ۱۹۳۳ء
یادگار شعرا، طفیل احمد، الہ آباد، ۱۹۴۳ء
خزائن الفتوح، امیر خسرو (انگریزی ترجمہ محمد حبیب) بمبئی ۱۹۳۱ء
خطبات گارساں دتاسی، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء
خلاصۃ التواریخ از سجان رائے بھنڈاری مرتبہ ایم. ظفر حسن، دہلی ۱۹۱۸ء
دکن میں اُردو، نصیر الدین ہاشمی، حیدر آباد، ۱۹۳۶ء
دیوان امانت، مرتبہ سید آغا حسن لطافت، قومی پریس لکھنؤ، ۱۳۰۷ھ
(دیوان) محبت مظہر، ہرچند رائے ہرچند، میرٹھ، ۱۲۹۷ھ

سسی پنوں، لاہور، ۱۹۰۴ء

سسی ہاشم (پنجابی) ہرنام سنگھ شان، انبالہ ۱۹۵۶ء

سعادت یار خاں رنگین، ڈاکٹر صابر علی خاں، کراچی، ۱۹۵۶ء

سودا، شیخ چاند، اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء

شبد آرتھ چنتامنی، (سنسکرت) سکھدانند ناتھ، آگرہ ۱۹۲۱ بکرمی

شعرالعجم، شبلی نعمانی، لاہور ۱۹۲۴ء

شکنتلا منظوم، محمد فاروق وحشت بریلوی، ۱۹۴۶ء

شکونتلا یا انگشتر گمشدہ، علی اصغر حکمت، دہلی ۱۹۵۷ء

طبقاتِ اکبری، خواجہ نظام الدین احمد، جلد اول، مرتبہ بی ڈے، کلکتہ ۱۹۲۷ء

فتوح السلاطین، مولانا عصامی مرتبہ ڈاکٹر مہدی حسین، آگرہ، ۱۹۳۸ء

فرہنگ آصفیہ، سید احمد دہلوی، دہلی ۱۸۹۵ء

کلیات سودا، مرتبہ عبدالباری آسی، لکھنؤ ۱۹۳۲ء

کلیات محمد قلی قطب شاہ، مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حیدرآباد، ۱۹۴۰ء

کلیات میر تقی میر، مرتبہ: عبدالباری آسی، لکھنؤ ۱۹۴۱ء

کٹیلاگ: مختلف ہندستانی اور یورپی کتب خانوں میں مخزونہ اُردو، فارسی اور ہندستانی علاقائی زبانوں کے مخطوطات و مطبوعات کے توضیحی کٹیلاگوں کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فہرست مخففات

گارساں دتاسی اور اس کے ہم عصر بہی خواہانِ اُردو۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حیدرآباد، طبع ثانی، ۱۹۴۱ء

گلدستۂ حیرت، محمد یعقوب، لکھنؤ ۱۸۷۶ء

مثنوی اسرارِ محبت (قلمی) محبت خاں محبت، کتب خانہ رضائیہ رام پور نشان نظم ۵۲۸

مثنوی اسرارِ محبت مرتبہ حسرت موہانی، اردوے معلّٰی پریس، علی گڑھ

مثنوی افسانۂ غم، ہرچند رائے ہرچند، لکھنؤ ۱۲۸۲ھ

مثنوی پدماوت شمع و پروانہ (قلمی) ضیاء الدین عبرت و غلام علی عشرت،
کتب خانۂ انجمن ترقی اردو علی گڑھ، نشان ۷۵/ ۶۳۰

شمع و پروانہ (قلمی) لٹن لائبریری علی گڑھ نشان ۵۰/ ۱۰۸

شمع و پروانہ، مطبع مصطفائی، ۱۲۶۵ھ

مثنوی پدماوت، محمد قاسم علی بریلوی، نول کشور، کانپور ۱۸۷۳ء

مثنوی پھول بن، ابن نشاطی، مرتبہ عبدالقادر سروری، حیدرآباد، ۱۹۳۸ء

مثنوی پھول بن، ابن نشاطی، مرتبہ شیخ چاند ابن حسین، کراچی، ۱۹۵۵ء

مثنوی پیام ساوتری، جگر بریلوی، لکھنؤ، ۱۹۵۱ء

مثنوی تصویرِ جاناں (قلمی) شفیق اورنگ آبادی کتب خانہ رضائیہ رامپور،
نشان ۵۳۲ ب

مثنوی چندر بدن و مہیار (قلمی) مقیمی، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ،
نشان ۶۴/ ۶۱۹

مثنوی چندر بدن و مہیار، مقیمی، مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی، حیدرآباد، ۱۹۵۶ء

مثنوی خورشیدِ روشن، عنایت اللہ روشن بدایونی، لکھنؤ، ۱۹۰۴ء

مثنوی ستونت بینا، (قلمی) غواصی، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ،
نشان ۷۲/ ۶۲۷

مثنوی سراپا سوز، محمد صادق خاں اختر، لکھنؤ ۱۸۸۵ء

مثنوی سنگھاسن بتیسی بکرماجیت (قلمی) ذخیرۂ سرشاہ سلیمان، لٹن لائبریری،
علی گڑھ، نشان ۱۱۵

مثنوی سنگھاسن بتیسی (ویر بکریم) قلمی، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ،
نشان ۴۹/ ۶۰۴

مثنوی سنگھاسن بتیسی، رنگ لال چمن، نول کشور، کانپور، ۱۸۶۹ء

مثنوی سوزو گداز، شوق نیموی، پٹنہ، ۱۹۲۴ء

مثنوی طالب و موہنی، سید محمد والہ، مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حیدر آباد،
۱۹۵۷ء

مثنوی طوطی نامہ، غواصی، مرتبہ سعادت علی رضوی، حیدر آباد ۱۹۳۹ء

مثنوی عود و صندل (قلمی) امیری، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، نشان
۸۵/ ۶۴۰

مثنوی قطب مشتری، وجہی، مرتبہ مولوی عبدالحق، دہلی ۱۹۳۹ء

مثنوی کام روپ اور کلا کام (قلمی) کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، نشان
۱۳/۵۶۶

مثنوی کامروپ و کلا از تحسین الدین مرتبہ گارساں دتاسی مطبوعہ پیرس ۱۸۳۵ء

مثنوی گلدستۂ مسرت، عطا علی خاک، کانپور، ۱۲۸۵ھ

مثنوی گلزارِ نسیم (یادگار نسیم) مرتبہ اصغر گونڈوی، الہٰ آباد، ۱۹۳۰ء

مثنوی گلشن عشق، عنایت اللہ روشن، لکھنؤ، ۱۸۹۵ء

مثنوی گلشن عشق، نصرتی، مرتبہ مولوی عبدالحق، کراچی، ۱۹۵۲ء

مثنوی لال و گوہر، عارف الدین خاں، عاجز، مصطفائی پریس مظفر نگر

مثنوی مہر و مشتری، امجد علی قلق، لکھنؤ ۱۲۷۷ھ

مثنوی ندرتِ عشق (قلمی) محمد باقر آگاہ، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ،
نمبر ۶۶/۶۲۱

مثنوی نسیم سحر، جیالال خستہ دہلوی، دہلی ۱۸۸۴ء
مثنوی نل دمن، فیضی، نول کشور لکھنؤ، ۱۹۳۰ء
مثنوی نل دمن، (قلمی) میر نیاز علی نکہت، کتب خانہ رضائیہ رام پور، نشان ۵۸۲
مثنوی نل دمن (قلمی) بھگونت رائے راحت، مکتوبہ ۱۸۵۶ء،
کتب خانہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ نشان ۵۵
مثنوی نیرِ نگ سحر، اقبال ورما سحر ہتگامی، کانپور ۱۹۱۶ء
مثنوی ہیر رانجھا، (قلمی) مول چند منشی، کتب خانہ رضائیہ رامپور، نشان ۵۷۰
مثنوی ہیر رانجھا (قلمی) نجیب الدین نجیب، کتب خانہ انجمن ترقی اردو،
علی گڑھ، نشان ۱۰۲/۶۵۷
مثنوی ہیر رانجھا (ارمغان گدا) عبدالغفور قیس، آگرہ، ۱۳۱۷ھ
مثنوی ہیر رانجھا، کرم الٰہی بھوپالی، سیالکوٹ، ۱۹۰۵ء
مثنویات، امیر احمد علوی، لکھنؤ ۱۹۳۶ء
مثنویاتِ جراُت (قلمی) کتب خانہ رضائیہ رامپور، نشان ۵۵۵ ب
مثنویاتِ راسخ، ڈاکٹر ممتاز احمد، پٹنہ، ۱۹۵۷ء
مثنویات میر حسن، مرتبہ عبدالباری آسی، لکھنؤ، ۱۹۴۴ء
مقالات ہاشمی، نصیر الدین ہاشمی، لاہور
مقالات گارساں دتاسی، جلد اول و دوم، دہلی ۱۹۴۳ء
ملک محمد جائسی، کلبِ مصطفےٰ، دہلی، ۱۹۴۱ء
منتخب التواریخ، عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی، بہ تصحیح احمد علی، کلکتہ جلد ۱، ۲، ۳؛
۶۵-۱۸۶۹ء
مہابھارت (سنسکرت) بھنڈارکر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پونا، ۱۹۳۳ء- ۱۹۵۶ء

میر تقی میر، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، دہلی ۱۹۵۵ء
نذر محمد قلی قطب شاہ، مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حیدر آباد، ۱۹۵۸ء
نصرتی از مولوی عبدالحق مطبوعہ انجمن ترقی اُردو، نئی دہلی
وقائع عالم شاہی، کنور پریم کشور فراقی، رامپور، ۱۹۴۹ء
ہندی ساہتیہ کا اتہاس، رام چندر شکل، ناگری پرچارنی سبھا، کاشی، گیارھواں ایڈیشن، ۲۰۱۴ سبت
ہندی شبد ساگر، شیام سندر داس، بنارس، ۱۹۱۶ء
یورپ میں دکنی مخطوطات، نصیرالدین ہاشمی، حیدر آباد، ۱۹۳۲ء

رسائل

ادبی دنیا، لاہور، ستمبر ۱۹۳۹ء جولائی ۱۹۴۶ء
ادیب، جون ۱۹۲۱ء
اردو، ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۹ء، ۱۹۵۹ء، ۱۹۵۶ء
اردو ادب، دسمبر ۱۹۵۰ء
انڈین پی ای این، جنوری ۱۹۶۰ء
اورینٹل کالج میگزین، اگست ۱۹۲۷ء، نومبر ۱۹۲۸ء، مئی ۱۹۳۱ء، نومبر ۱۹۴۱ء، فروری ۱۹۴۲ء، مئی ۱۹۴۲ء، اگست ۱۹۴۲ء، نومبر ۱۹۴۲ء، نومبر ۱۹۴۳ء، فروری ۱۹۴۴ء
برہان، دہلی، نومبر ۱۹۵۱ء
سب رس، حیدر آباد، فروری ۱۹۶۰ء
ماہِ نو کراچی، دسمبر ۱۹۵۸ء، جون ۱۹۵۹ء

معارف، اگست ۱۹۴۶ء

معاصر، پٹنہ، شمارہ ۹، ۱۰، ۱۱ اور ۱۶

نقوش، لاہور، جون ۱۹۵۸ء

نگار، جولائی ۱۹۴۹ء

نواے ادب، جولائی ۱۹۵۲ء، جولائی ۱۹۵۴ء، اکتوبر ۱۹۵۸ء

نیا دَور لکھنؤ، جنوری ۱۹۶۰ء

English Books

Annals and Antiquities of Rajasthan,
by James Tod, New York, 1914.

Chambers Encyclopaedia,
London. ed. 1950.

The Encyclopaedia Americana,
New York, ed. 1944.

The Encyclopaedia Britannica,
Chicago, ed. 1955.

The Encyclopaedia of Islam,
Leyden and London.
Vol. I, 1913 Vol. II, 1927
Vol. III, 1936 Vol. IV, 1934

The Encyclopaedia of Religion and Ethics
by James Hastings, New York, 1951.
Hindu Mythology by John Wilkins,
London. 1957.

History of Khiljis, by K. S. Lal,
Allahabad, 1950.

History of Sanskrit Literature,
by Arthur A. Macdonell,
London, 1900

Hitopadeca, edited by F. Johnson,
London, 1884.

Imperial Gazetteer of India,
Vol. V & Vol. XVIII,
Oxford, 1908.

Jataka Tales by Ethel Beswick,
London, 1956.

Kathasaritsagara
edited and translated by Brockhaus, Leipsic,
(Books i – v) 1939, (vi – xviii) 1862 – 66.

Ocean of Story, Translated by C. H. Tawney.
Edited by N. M. Penzer in 10 volumes,
London, 1924 – 1928.

Oriental Biographical Dictionary
by Thomas William Beale,
ed. Henry George Keene, Calcutta, 1881.
Panchatantra, edited by Kosegarten,
Bonn, 1848.

Sanskrit – English Dictionary,
by A.A.Macdonell,
London, 1893.

Shakuntala, edited by Richard Pischel,
Harvard Oriental Series No. 16, 1877.

اشاریہ

کتاب کے بارے میں مشاہیر کی آرا

امتیاز علی عرشی

آپ نے مواد کے فراہم کرنے اور پھر اُسے باضابطہ مرتب کرنے میں جو کاوش کی ہے، وہ ستایش و آفریں کی مستحق ہے۔ اس راہ میں پہل کرنے کا شرف آپ ہی کو حاصل ہے؛ اور آئندہ جو کوئی بھی مثنویوں کے اس پہلو سے بحث کرے گا، وہ آپ کی راہبری کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا۔

اس بحث نے ایک اور پہلو کو بھی روشن کردیا، اور وہ ہے اردو ادب کا قدیم ہندستانی ذخیرۂ ادب سے استفادہ۔ جزاک اللہ، خدا آپ کو مزید توفیقِ کار عطا فرمائے اور ملک کے دوسرے باذوق نوجوان آپ کی ہمپائی کی کوشش کریں۔

قاضی عبدالودود

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی زیرِ نظر کتاب قابلِ قدر ہے۔ انھوں نے محنت کی ہے اور بہت سی گتھیاں سلجھائی ہیں۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اردو شاعری کے دیسی عناصر پر اتنی تحقیق کی ہے اور اس مضمون کے ہر پہلو کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہے کہ ان کو اس مضمون کا ماہرِ خصوصی سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے کثیر التعداد مثنویوں کی ضروری اور مناسب ترتیب کے ساتھ نشان دہی کی ہے جو ہندستانی قصوں پر مبنی ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ نے ان مثنویوں کو اپنی عالمانہ تحقیقی کتاب کا موضوع قرار دے کر صرف اردو ادب کی نہیں بلکہ ہندستانی کلچر کی بھی قابلِ قدر خدمت کی ہے۔

مولانا ضیا احمد بدایونی

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے پہلی بار اردو مثنویوں کی ہندستانیت پر نہایت لیاقت اور دیدہ ورانہ جامعیت کے ساتھ قلم اٹھایا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ انھوں نے بڑی جستجو اور کاوش سے کار آمد مواد تلاش کیا اور کمال سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب بے شبہ ہماری زبان کی تاریخ و تحقیق کے سلسلے میں ایک نہایت مفید اور گراں قدر اضافہ ہے۔

نیاز فتحپوری

صنفِ مثنوی پر اس وقت تک بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن ڈاکٹر نارنگ کی یہ تصنیف

زورِ دگر ست ایں کماں را ــــــــ!

سید احتشام حسین

موضوع کی حدبندی اور تہذیبی اہمیت نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی زیرِ نظر کتاب کو امتیازی حیثیت دے دی ہے، کیونکہ اس وقت تک اردو مثنویوں کا یہ پہلو نگاہوں سے اوجھل تھا۔ ڈاکٹر نارنگ اردو کے محققوں میں اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں۔ ان کی اس کتاب نے ادبی مطالعہ کے ایک نئے زاویہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شعر و ادب ملکی تہذیب کی پوری تصویر بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کی سعی و جستجو سے اس مطالعہ کے لیے زمین ہموار ہو گئی ہے۔

آل احمد سرور

"ہندستانی قصّوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں" ڈاکٹر گوپی چند کا کارنامہ ہے۔ اُردو مثنویوں میں جو فضا اور ماحول ہے اس کی طرف ابھی تک بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے اس کمی کو دُور کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور نہایت تلاش اور تحقیق سے اُردو مثنویوں کی ہندستانی بنیاد کا جائزہ لیا ہے۔ نارنگ جس

موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے سارے گوشوں پر نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے تحقیق کے ان نوادر کو جو نظروں سے اوجھل تھے، یکجا کر کے ایک داستان مرتب کی ہے جس میں معلومات کے ساتھ دل کشی بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُردو کی ہندستانی بنیاد کو واضح کرنے میں یہ کتاب نہایت مفید ہوگی اور اس کے اثر سے اُردو مثنوی کے سرمائے کو ہمارے ادب کی عظمت متعین کرنے کے سلسلے میں مناسب اہمیت دی جائے گی۔

ڈاکٹر گیان چند جین

ڈاکٹر نارنگ نے غیر معمولی محنت سے یہ کتاب مرتب کی ہے اور اردو مثنویوں پر ایک نئے اور اہم زاویہ سے روشنی ڈالی ہے۔ اس میں بہت سی ایسی مثنویوں کا تعارف کرایا گیا ہے جن کے ذکر سے ہماری تاریخیں خالی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اُردو مثنویوں سے متعلق تحقیقی معلومات کا گنجینہ ہے جو اس موضوع سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے بیحد کار آمد ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اُردو کے ان نوجوان ادیبوں میں سے ہیں جن کی تحریر میں پختگی اور شائستگی جھلکتی ہے۔ وہ اُردو کے مزاج داں ہیں اور کلاسیکی ادب پر ان کی نظر گہری ہے۔ ان کی تحقیق سے اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جاتا ہے کہ اُردو مثنویاں گل و بلبل کی داستان ہیں اور ملکی و عوامی روایات سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کی ذات سے اُردو کی بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ تیج بہادر سپرو اور برج موہن دتاتریہ کیفی کے بعد اُردو دنیا ایک ایسے دیدہ ور کی منتظر تھی جو اپنے ادبی و علمی کاموں سے اُردو کے تہذیبی کردار کو زیادہ سے زیادہ واضح کر سکے۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نوجوان محققین میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں۔ انھیں مواد تلاش کرنے اور اس سے صحیح کام لینے کا فن بہت اچھی طرح آتا ہے۔ اُردو مثنویوں پر ان کی نظر گہری ہے۔ انھوں نے زیرِ نظر کتاب بڑی محنت اور چھان بین کے بعد لکھی ہے اور اس موضوع پر یہ پہلی اہم اور جامع کتاب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی افادیت اور بلند معیار کے پیشِ نظر اس کی قدر افزائی کی جائے گی۔

مالک رام

اُردو میں تحقیقی کام ابھی بہت ابتدائی حالت میں ہے۔ چونکہ یہ کام محنت طلب ہے، ہمارے لکھنے والے اس طرف توجہ نہیں کرتے۔ اس لیے خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ہندستانی قصّوں سے ماخوذ اردو مثنویوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ کوئی بھی تحقیقی کام حرفِ آخر نہیں ہو سکتا، تاہم اتنا یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر نارنگ کی اس تالیف میں بہت دن تک کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہو سکے گی۔

گوپال متل

ڈاکٹر نارنگ کی کوشش قابلِ قدر ہے اور انھیں اس معاملے میں بجا طور پر امام کا مقام حاصل ہے۔

نیاز فتحپوری

صنفِ مثنوی پر اس وقت تک بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن ڈاکٹر نارنگ کی یہ تصنیف
زورِ دگرست ایں کماں را ـــــــ!

سید احتشام حسین

موضوع کی حدبندی اور تہذیبی اہمیت نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی زیرِ نظر کتاب کو امتیازی حیثیت دے دی ہے، کیونکہ اس وقت تک اردو مثنویوں کا یہ پہلو نگاہوں سے اوجھل تھا۔ ڈاکٹر نارنگ اردو کے محققوں میں اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں۔ ان کی اس کتاب نے ادبی مطالعہ کے ایک نئے زاویہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شعر و ادب ملکی تہذیب کی پوری تصویر بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کی سعی و جستجو سے اس مطالعہ کے لیے زمین ہموار ہو گئی ہے۔

آل احمد سرور

"ہندستانی قصّوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں" ڈاکٹر گوپی چند کا کارنامہ ہے۔ اُردو مثنویوں میں جو فضا اور ماحول ہے اس کی طرف ابھی تک بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے اس کمی کو دُور کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور نہایت تلاش اور تحقیق سے اُردو مثنویوں کی ہندستانی بنیاد کا جائزہ لیا ہے۔ نارنگ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے سارے گوشوں پر نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے تحقیق کے ان نوادر کو جو نظروں سے اوجھل تھے، یکجا کر کے ایک داستان مرتب کی ہے جس میں معلومات کے ساتھ دل کشی بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُردو کی ہندستانی بنیاد کو واضح کرنے میں یہ کتاب نہایت مفید ہوگی اور اس کے اثر سے اُردو مثنوی کے سرمائے کو ہمارے ادب کی عظمت متعین کرنے کے سلسلے میں مناسب اہمیت دی جائے گی۔

ڈاکٹر گیان چند جین

ڈاکٹر نارنگ نے غیر معمولی محنت سے یہ کتاب مرتب کی ہے اور اردو مثنویوں پر ایک نئے اور اہم زاویہ سے روشنی ڈالی ہے۔ اس میں بہت سی ایسی مثنویوں کا تعارف کرایا گیا ہے جن کے ذکر سے ہماری تاریخیں خالی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اُردو مثنویوں سے متعلق تحقیقی معلومات کا گنجینہ ہے جو اس موضوع سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے بیحد کار آمد ثابت ہوگا۔